

عرب

اور

اہل عرب

تاریخ

مصنف
جبرؤ ایچ سینگر

مترجم
نولان غلام رسول

مکتبہ معین الادب لاہور
چھپائی گئی ہے

This is an authorized abridged Urdu translation of THE ARABIAN PENINSULA by Richard H. Sanger. Copyright, 1954, by Cornell University. Published by Cornell University Press, Ithaca, New York.



28 MAR 1995

طبع اول ۱۹۶۱

11735

SVB2

تعداد

اہم معن الدین

طابع

منصور پریس لاہور

مطبع

لفیس پرنٹنگ پریس لاہور

طباعت گرد ہوش

چھ روپے

قیمت



بہ اشتراک

مکتبہ، فریڈنگٹن، لاہور، ہندوستان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

سرزمین عرب ہی کے دامن میں وہ مقدس ترین مقام واقع ہے جسے اس کائنات میں انسانوں کا پہلا دینی مرکز و معبد ہونے کا شرف حاصل ہوا یعنی مسجد الحرام۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ
 کما مرکز، بنایا گیا وہ (یہی) عبادت گاہ ہے جو
 اہل عمران ۱۹۱
 مکہ میں ہے، برکت والا اور تمام انسانوں کے

نے ہدایت کا سرچشمہ۔

اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا

ہم اس کے پاس ہیں، وہ پاسیاں ہمارا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پاک مقام کی تقدیس از سر نو قائم کر دی۔ اگرچہ عرب بعد ازاں پراثریوں کے تاریک فاد میں گر گئے۔ اور دین حق کو انہوں نے بالکل بھلا دیا تاہم اس مقام کی تقدیس و حرمت کے ظاہری آداب میں قطعاً فرق نہ آیا۔ پھر اسلام آیا تو اس دینی مرکز کو کائنات انسانیت کی قبلہ گاہ بنا دیا گیا۔ کم دینش چودہ سو سال گزر چکے ہیں اس طویل مدت میں کبھی کوئی دور اور کوئی زمانہ نہیں آیا جب روئے زمین کے اطراف سے لاکھوں فرقہ فتنہ

توحید ہر سال اڑنے حج و عمرہ کے لئے اس مقدس مقام پر پہنچتے رہے ہوں۔ دیکھا، پہلا، ان دونوں صحرا، بادشاہی، غوریزیاں، خوف جان والی، سفر کی دشواریاں، میں کی سیرگنا نیاں عمرگنا انسانوں کے لئے سولہ فرسائیں رہی ہیں۔ موسم محترم تک پہنچنے میں بھی یہ تمام موانع مختلف اوقات میں موجود رہے۔ سمندر دل میں جہازوں پر چلے جاتے تھے خشکی میں تلافی لیتے تھے۔ پھر چوتھے مکہ مکرمہ تک اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ایسی صعوبتوں اور مصیبتوں سے سابقہ پڑتا تھا جن کا تصور بھی انسانوں کے پختہ عزم کو مضبوط کر دینے کے لئے کافی تھا۔ گریہ راستے فدا کاران دین حق کی کام نہ تھی اور مسافت بیانی سے کبھی خالی نہ رہے۔ دنیا میں بہت سے مقامات ہیں جن میں ذہنی تقدیس کی بنا پر خاص ہر دوسرے دنیا حاصل رہی۔ لیکن کوئی مقام ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا۔ جسے محلی اعتبار سے محرم پاک کا رتبہ ملے۔ اور جہاں سال ہر سال فکوں، قوموں، نسلوں اور رنگوں کا ایسا وسیع اجتماع ہوتا رہا جو جیسا کہ کتبہ میں ہوتا چلا آیا ہے اور حب تکسا آسمان کا سا ثمان زمین پر تمان ہوا ہے، برابر ہوتا رہے گا،

ان حالات کے پیش نظر سرزمین عرب کے احوال و ظروف جس توجہ کے مستحق تھے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں لیکن یہ امر حقیقتاً حد درجہ تعجب خیز اور عبرت افزا ہے کہ مدت مدید تک عرب کے مفصل جغرافیائی حالات غراہم ہی نہ ہو سکے بلکہ اس کا ایک مستند نقشہ بھی قیام نہ ہو سکا۔ یہاں اور زائوں نے جو کچھ نقل و ثبت کیا، وہ صرف ان واسطوں اور گزرگاہوں سے تعلق رکھتا تھا، جن سے مختلف اوقات میں ان کو سفر کرنا پڑا یا ان راستوں سے لوگ مختلف زائوں میں آتے جاتے تھے۔ مستند معلومات کی فراہمی کا آغاز اہل یورپ سے ہوا اور اہل یورپ ہی نے ان معلومات کا معاملہ آخری مندرجہ پر پہنچایا۔ انھوں نے دورِ حاضر

اصول کے مطابق عرب کے مختلف حصوں کے قابل اعتماد نقشے تیار کئے۔ اور آج جن کتابوں کو اہل علم میں درجہ اسناد حاصل ہے، وہ سب اہل یورپ ہی کی مرتب کی ہوئی ہیں جنہوں نے پہلے عربی زبان میں اس پر مبنی پرچشتم ہم پہنچائی کر کے تکلف بات چیت کر سکیں، پھر اپنا تعلق اندرونی بلو و ناغہ ہو کر عربوں کے سے اوصاف و اطوار اختیار کئے۔ سب سے آخر میں اپنے سمجھوں کو ان مشقوں اور سختیوں کی برداشت کے لئے تیار کیا۔ جن کے لئے خود اس سرزمین کی فضا میں اپنے دل سے بھی زیادہ تعلق میں تیار رہ سکتے تھے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا قابل ذکر شخص کارلسٹن فی بر ہے، جسے شاہ ڈنمارک نے ملائے میں باہرین ان کی ایک جماعت کے ساتھ عرب بھیجا تھا۔ اور اس نے عامی مدت رہی مقامات نیز یمن کے مختلف حصوں میں گزاری۔ اس ہم کام مقصد یہ تھا کہ انیس کے مختلف مقامات کی حیران کن توہین و تشریح کے لئے معلومات فراہم کی جائیں۔ ۱۹۱۷ء میں وینزویلیا گیا۔ گرنے ربح الخالی، کا آخری سفر کیا۔ ایک سو ستالیس سال کی طویل درمیانی مدت میں بہت سے سیاح بھیجیں بدل بدل کر عرب کے مختلف حصوں میں پھرے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں:- ڈارل، پال گریو، بلٹ، برکھارڈٹ، برٹن، اینڈ جان فلیش اور برڈرام ٹامس۔ ٹامس نے اسی اور مقبلی گرنے دوسرے مقامات کی تفصیل کے علاوہ ربح الخالی، کے مختلف حصوں کی چھان بین تکمیل پر پہنچا دی۔

1. Carsten Niebuhr 2. Wilfred Thesiger
3. Doughty & Palgrave. 5. Lady Blunt
6. Burckhardt. 7. Richard Burton
8. St John Philby 9. Bertram Thomas

یہ وسیع صحرائی علاقہ سین پر ابتدا سے تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ پہلی حزیہ روشنی میں آیا۔ اور اس کا مستند نقشہ تیار ہوا۔ اکتشافی سیاحتوں کا معاملہ صرف مردوں تک محدود نہ رہا۔ عورتوں نے بھی اس سلسلے میں بڑا قابلِ قدر کام انجام دیا۔ مثلاً جرژوڈ ویل۔ فریڈسٹاکٹ مسٹر انگریڈ۔

یہ تمام کتابیں اپنی اپنی جگہ بڑی قابلِ قدر تھیں۔ لیکن میں کسی ایسی کتاب کی تلاش میں تھا، جو عام حالات کی مختصر کیفیت کے علاوہ گزشتہ پندرہ بیس سال کے سائنس و تاریخ کی جامع ہوتی۔ خصوصاً اس میں یہ بتایا جاتا کہ عرب کے مختلف خطوں نے زراعت و آبپاشی کے نئے وسائل سے کس مدد تک فائدہ اٹھایا؟ وہاں زرعی ترقی کے امکانات کیا ہیں؟ کون کون سی صنعتیں جاری ہو چکی ہیں۔ اور کن کن صنعتوں کو کامیابی سے جاری کرنے کا انتظام ہو سکتا ہے؟ سب سے آخر میں یہ کہ اس زیر زمین دولت و ثروت کے نشروارتقا کا پورا نقشہ سامنے آجانا جس نے اقتصادی لحاظ سے سرزمین عرب کو آج دنیا بھر کی ترقیات کا مرکز بنا رکھا ہے۔ بینہ تیل۔ اس قدرتی دولت کی برکت ہے۔ کہ آج تمام بڑی طاقتیں عربوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لئے مضطرب ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ انہیں اعتماد کا بلند ترین درجہ حاصل ہو جائے۔

اس اشارہ میں مسٹر ایچ ڈی پنگر کی کتاب "جزیرۃ العرب" دیکھنے کا موقع ملا جس میں ۱۹۵۳ء تک خاصی قیمتی معلومات فراہم کر دی گئی تھیں۔ تاہم مصنف نے خود مختلف ملاحظات کا سفر کیا اور جو کچھ لکھا ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھا۔ اس میں دولت سعودیہ عربیہ، بحرین، کویت، عمان کی ساحلی امارتوں (ڈیویدیل عمان)

مستط، عدل کی زیر حمایت، اصول اور یکن کے متعلق تمام ضروری حالات جمع کر بیٹھے گئے تھے۔ گریبا جزیرۃ العرب میں سے صرف "ہلال زرخیز لبنی عراق، اردن، شام، بیروت اور فلسطین کا ذکر باقی رہ گیا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قیمتی معلومات کے اس ذخیرے کو مناسب انداز میں اردو کا لباس پہنا دیا جائے تاکہ میرے ہر دور خواں ہم وطن بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معلومات غالباً ان میں سے بھی اکثر اصحاب کے پیش نظر نہ ہوں گی۔ جو مجموعاً تازہ تو ہیں اگرچہ یہ کتابیں پڑھنے کے عادی ہیں۔

اس کتاب میں بڑی خوبیاں ہیں، جو عموماً انہیں سب احول کی کتابوں میں نہیں پائی جاتی۔ مثلاً ۱۔ مصنف نے زیادہ سے زیادہ صحیح حالات پیش کئے ہیں اور اپنے تاثرات پر تکلف میان کر دیا ہے۔ معلومات کی کمی کا معاملہ الگ ہے تاہم مجھے اس میں کسی جانب دامن جان کا سراغ درمل سکا۔

۲۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مختلف ممالک کے باشندے کس وسیع پیمانے پر خلقِ خدا کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کی سرگرمیاں خود ان کے ملک کے لئے کس قدر فائدہ رساں اور وقار افزا ثابت ہوتی ہیں۔

۳۔ اس کتاب سے پہلی مرتبہ معلوم ہو گا کہ اہل مغرب خصوصاً اہل امریکہ نے کس مرم و استقامت کے ساتھ عرب میں زرعی ترقیات کی بنیاد رکھی۔

۴۔ بعض معلومات میرے نزدیک بالکل نئی ہیں۔ مثلاً جمہوریہ امریکہ کے تعلقات ممالک عرب سے۔ جو تفصیل اس کتاب میں بیان ہوئی ہے وہ غالباً کبھی دوسرے کتاب میں درمل کیے گی۔

پوری کتاب اہل یورپ اور اہل امریکہ کا نقطہ نگاہ سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی، اس وجہ سے اس میں ایسی چیزیں بھی آگئی تھیں، جن کی ضرورت ہمارے خواندگان کرام کو نہ تھی۔ مثلاً ارکان اسلام کے متعلق معمولی تفصیلات، جن سے عام مسلمان بد رجحان بہتر طریق پر آگاہ ہیں۔ یا بعض مقامات پر سیاحت کے زامیر نظر سے ایسی جزئیات جو ہمارے اہل وطن کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے فاضل مصنف کی اجازت سے ایسی چیزیں یا تو بالکل حذف کر دیں یا جہاں حذف سے نفس مضمون کی ترتیب میں خلل کا اندیشہ تھا، وہاں انھیں پر اکتفا کیا۔ تاہم کتاب کے تمام جغرافیائی، تمدنی، ثقافتی، صنعتی اور ترقیاتی مطالب مصنف کے الفاظ میں قائم رکھے اور کوئی ضروری چیز نہ چھوٹی گئی، نہ اس کی تفصیل سے اعراض کیا۔ اس طرح کتاب کی ضخامت ایک حد تک کم ہو گئی لیکن اس کے وہ حقیقی حقائق و حقوقاً محفوظ رہے، جن کا تعلق معلومات سے تھا، یہاں تک کہ بعض صحرائی مناظر کو بھی یہ دست برد قائم رکھا اور ان کا لفظی ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں بعض اساطیری تلمیحات کی تشریح حواشی میں کرنی پڑی مصنف نے کہیں کہیں غلطی سے اسلام سے پیشتر کی تاریخ عرب اور بعض اہم آثار و تدبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ معلومات اختصار کے باوجود بہت قیمتی تھیں اس لیے میں نے یہ حصے بھی پورے کے پورے لیے بلکہ بعض مقامات پر مستعملہ مطالب کا اضافہ حواشی میں کر دیا تاکہ خواندگان کرام کے سامنے زیادہ سے زیادہ معلومات آجائیں۔

اس کے علاوہ میں نے کتاب کو ہر لحاظ سے جامع اور مکمل بنانے کے

یہ جو کچھ کیا، اس کا سرسری نقشہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ مصنف کی کتاب ۱۹۵۳ء میں مکمل ہو چکی تھی اور ۱۹۵۴ء میں شائع ہو گئی تھی، اس لیے طبعاً اس میں صرف ۱۹۵۳ء تک کی معلومات شامل تھیں۔ میں نے مختلف جرائد و رسائل اور سالناموں کو سامنے رکھ کر ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک کی معلومات فراہم کیں۔ اور انہیں ہر بیان کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا۔ گویا اپنے مترجم کو ۱۹۵۸ء تک کے حالات پر حاوی بنا دیا۔

۲۔ جا بجا ضروری حواشی لکھے، جن میں مختلف مقامات اور معاملات و امور کے متعلق مزید معلومات درج کر دیں، جو اصل کتاب میں موجود نہ تھیں۔

۳۔ بعض معاملات کے متعلق مصنف نے صرف ایک طرف معلومات کافی سمجھ لی تھیں۔ مثلاً ۱۸۵۸ء میں جو تنگامہ بہ مقام جدہ پہنچا، مصنف نے اس کے متعلق لندن ٹائمز کا بیان درج کیا حالانکہ وہ سر اس طرف دار نہ تھا۔ میں نے مستند عربی تاریخوں سے اس تنگامے کے اصل اسباب پیش کیے۔ خواندگان کو رام پر واضح ہو جائے گا کہ اس طرح تنگامے کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو گئی۔

۴۔ بعض امور کے سمجھنے میں مصنف سے فزقیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی صحیح تشریح کر دی تاکہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہ رہے۔

۵۔ بعض تاریخی معلومات میں اضافہ کیا۔

۶۔ ایک نہایت ضروری چیز یہ بھٹی کہ تمام مقامات کے نام صحیح لکھے جاتے اور
 جہاں مصنف نے ان کا موقع اور محل نہیں بتایا تھا، وہاں یہ کمی بوری کر دی
 جاتی۔ میں نے اس سلسلے میں بھی حتی الامکان کوئی امر نظر انداز نہیں ہونے دیا۔
 اس طرح ”جزیرۃ العرب“ کے متعلق یہ کتاب جغرافیائی، تاریخی، تمدنی،
 ثقافتی اور ترقیاتی معلومات کا ایک گراں قدر مجموعہ بن گئی ہے۔ امید
 ہے خواندگان کرام اسے پسند فرمائیں گے۔ مترجم کے لیے یہی اطمینان کافی ہے
 کہ اسے سرزمین مقدس عرب کے متعلق ایک ضروری کتاب کو اپنے علم کی حد تک
 بہتر صورت میں پیش کرنے کا موقع ملا۔

جہر
 مسلم ٹاؤن - لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلا باب

حزہ سفارتی مرکز اور باب الحج

طلوع سحر کی خنک فضا میں ہوائی جہاز قاہرہ سے جدہ روانہ ہوا۔ غلطی
اسی دیر میں سورج کی روشنی نمودار ہو گئی۔ اور جہاز بحیرہ قلزم کے اوپر پہنچ
گیا جس کی موجوں کو شمالی و مغربی ہوائے سفید تاج پہنا رکھے تھے۔ ایک گھنٹے
کی پرواز کے بعد جہاز سفید بادلوں سے چھتا ہوا ایسے مقام پر آ گیا جہاں مصر کی سرزمین
نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور سامنے ایک اور خطہ نمودار ہوا۔ اس کا منظر بڑا
دلکش تھا۔ سمندر کی لہریں زیر آب چٹانوں سے ٹکراتی تھیں، تو ان پر سفید
جھاگ نمودار ہو جاتا تھا۔ وہاں سے ساحل تک ہلکے سبز رنگ کا پانی پھیلا ہوا تھا۔
یہ دولت سعودیہ عربیہ کا ساحل تھا۔ اسے اس آٹھ لاکھ مربع میل سرزمین کی دہلیز
سمجھنا چاہیے جس میں ریگستان بھی ہیں اور سنگلاخ سطح مرتفع بھی، گھوڑوں سے
بھرے ہوئے نخلستان بھی ہیں اور تیل کے چشمے بھی۔ اسی نے نہایت مقدس اسلامی

مقامات کو آغوش میں لے رکھا ہے۔ جن کی زیارت کے لئے ہر سال لاکھوں مسلمان پہنچتے ہیں۔

ساحل سے غصیڑی دور ہی ہو اُئی جہان نے رُخ بدل لیا۔ اور وہ جیلِ جنوی کی مات ہزار فٹ بلند چوٹی پر سے گزرا۔ اس کے دامن میں یسوع واقع ہے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یک رنگ ساحل پر ایک دھندلا مسافید نقطہ لگا دیا گیا ہے۔ یہی مقام مدینہ منورہ کی بندرگاہ ہے۔ اس کے قریب ہی رومی جرنیل انیس گیسٹس نے ۷۰ء ق م میں یمن پر حملے کے لئے فوج تیار کی تھی۔ اور جزیرۃ العرب کا یہ پہلا معروف یورپی سپاح تھا۔ اسی بندرگاہ کے قریب سے پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی پسپائی کا آغاز ہوا تھا۔ اس طرح عرب اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یسوع سے ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد مسافروں کے کافوں میں ہوائی جہاز کے انجن کا شور بہت بڑھ گیا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ جہاز جلد ہی اتر رہا ہے جو دولت سعودیہ عربیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے اور جو نازین جج مہمند کے لئے مکہ معظمہ آتے ہیں۔ وہ اسی مقام پر اترتے ہیں۔ نیز دولت سعودیہ کا سفارتی مرکز بھی مقام ہے۔

۱۱ Aelius Gallus (i) یہ شخص فیروز گش کے ماتحت مصر کو گزر رہا تھا۔ اور سولوں کی تجارت پر قبضہ کرنے کی غرض سے اس نے یمن پر حملہ کیا تھا۔ لیکن ہم راستہ بھولے اور پانی نہ ملنے کے باعث بری طرح ناکام رہی۔ بھجایا گیا کہ رہبروں کو دھوکا دیا۔ ۱۱۱ء میں دار الحکومت مکہ معظمہ پہنچا۔ چونکہ کوئی غیر مسلم حدودِ حرم کے اندر داخل نہیں ہو سکتا جو مکہ معظمہ کے چاروں طرف مختلف ناصوری پستھین ہیں اس لئے جہوہ کو سفارتی دار الحکومت بنا لیا گیا۔ یعنی تمام سفیروں میں غیر مسلم بھی شامل ہیں جہوہ میں رہتے ہیں اور مکہ میں نیز ذریعہ تجارت، ملاقات اور گفتگو کے لئے جہوہ پہنچ جاتے ہیں۔

پہلے ریگستان میں بنی ہوئی بھونپڑیوں کا ایک جھنڈ نظر آیا، جن میں انفریقہ کے حبشی رہتے ہیں۔ پھر ایک ریگستان نما میدان دکھائی دیا۔ جسے جدو کے غیر ملکی باشندے گائف کا میدان کہتے ہیں۔ آگے ہوائی جہاز امریکی سفارت خانے کے نئے احاطے کے اوپر سے گزرا اس لئے اور آگے سرخ رنگ کی بہت سی عمارتیں دکھائی دیں، جن میں دولت سعودیہ کی شرکت معدنیات کا صدر دفتر بھی ہے۔ پھر شاہی موٹر خانہ آگیا۔ ساتھ ہی موٹروں کے ٹھہرانے کی جگہ تھی۔ شاہ سعود نے اپنی سلطنت کی بڑی شاہراہوں پر اونٹوں کی جگہ بڑے بڑے ٹرک چلانے کا انتظام کر دیا ہے۔ ان ٹرکوں کے پیچھے کامغربی صدر مقام یہ ہے۔ اس سے آگے ایک ٹیلے پر جدید وضع کی عمارت کھڑی ہے جس پر سبز اترکاری کردی گئی ہے۔ مصری امراس رنگ کو عموماً پسند کرتے ہیں۔ پہلے دولت سعودیہ کا امریکی سفیر اسی عمارت میں مقیم تھا۔ اور آگے بڑھے تو مزید مقامات دکھائی دیئے۔ پھر عربہ کا ساحل نظر آیا، جس کی زیر آب چٹانوں پر جھاگ کے دل پھیلے ہوئے تھے۔ پاس ہی یاد بانی کشتیوں کا ایک بیڑا اور کچھ چھوٹے مٹائی جہاز ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک چٹان پر فرانسیسی جہاز "ایشیا" کا رنگ خورد ٹوٹا بچا پڑا تھا، جو ۱۹۲۷ء میں یمن سے عازمین حج کے قافلے کو لے کر آیا تھا۔ جدہ کی بندرگاہ میں پہنچا تو طوفان کے باعث زیر آب چٹان سے ٹکرا گیا اور ساری رات بہتا رہا۔ مقامی لوگوں کو اب تک یہ دردناک واقعہ یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ ارض مقدس پر نظر پڑتے ہی ان عقیدت مندوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ انھوں نے سمجھا کہ آگ اللہ کے حکم سے لگی ہے۔ چنانچہ اپنی جانیں

بچانے کے بجائے نماز و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ صرف وہی لوگ بچے۔ جنہیں بچانے والوں نے اٹھا کر جہاز کے باہر پھینک دیا۔

اب ایرانی جہاز شہر پر سے گزرا اور مسافروں کو چار چار، پانچ پانچ منزل کے مکان ایک دوسرے سے پیوست نظر آئے۔ بعض اتنے بلند اور ایک طرف کو جھکے ہوئے کہ ان کے گرجانے کا خطرہ پیدا ہوتا تھا۔ انجام کار جہاز ایک ریتلے میدان میں جا اترا۔ جو شہر کے مشرقی جانب تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کا دروازہ کھلا اور عرب کی ریگ آلود مہا اندر گھس آئی۔

جو آنکھیں قاترہ کے مناظر سے ماہوس ہو چکی ہوں انہیں جذبہ میں بہت کم قابل توجہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ نہ اس شہر میں ٹرام گاڑیاں چلتی ہیں۔ نہ شاہراہوں پر سینماؤں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ جذبہ کی زیادہ تر گلیاں صرف اتنی چوڑی ہیں کہ درگزرے برابر برابر مہولت عمارتوں کے شہ نشینوں کے نیچے سے گزر جائیں۔ شہ نشینوں کے لیے اس شہر کو بجا شہرت حاصل ہے اور ان پر نہایت عمدہ دستکاری کی گئی ہے۔ عرب کی بے پناہ دھوپ کے باعث پرانی عمارتوں کا پست تر ترخ گیا ہے اور خود شہ نشینوں کا رنگ روغن بھی اڑ گیا ہے۔ احساس یہ ہوتا ہے کہ شہر کھڑے کھڑے ہی عالم خواب میں پہنچ گیا، اس لیے کہ لیٹنے اور مناسب طریق پر سونے کے لیے اسے جگہ نہ مل سکی۔

گلیوں کے فرش سخمۂ نہیں۔ کبھی کبھی پرانی روضہ کی پانی گاڑیاں ان پر چھڑکاؤ کر دیتی ہیں۔ اگر اچانک بارش کا ریلہ آجائے تو گلیوں میں کیچڑ ہو

جاتی ہے۔ ساحلی میدان کی ریت شہر کے لیے خاصی مصیبت کا سامان ہے جب نیز مہائیں چیتی ہیں۔ تو گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھتا ہے جو آہستہ آہستہ میز، فرش، چوکھٹوں وغیرہ پر بیٹھتا جاتا ہے۔ جدہ میں گرمی بھی ہے، اگر دو غبار بھی، بدبو بھی ہے اور مکھیاں بھی۔ یہ چیزیں تو وار د کہ خاصا پریشان کر دیتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ حالات سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ اجنبیت زائل ہو جاتی ہے۔ اور شہر میں نمایاں تبدیلیوں کا جو سلسلہ جاری ہے وہ توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

۱۹۶۷ء کے وسط تک جدہ میں گارے اور پتھر کی ایک اونچی فصیل بنی ہوئی تھی۔ یہ اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ قبائلیوں کے اچانک حملے روکے جا سکیں۔ مگر ساتھ ہی بحیرہ قندزم کی خوشگوار اور فرحت انگیز مہا بھی رگ گئی تھی جو موسم گرما میں زندگی کو قابل برداشت بنا سکتی تھی۔ اس فصیل کے خاتمے کا واقعہ یوں پیش آیا۔

امریکہ کی ایک کمپنی پنچیل کارپوریشن ہے جس نے اراکو کے ساتھ مل کر وزارت سعودیہ کی کایا پلٹ دی۔ ۱۹۶۷ء کے موسم بہار کا آخری دور مختا حبیب ایک روز اس کمپنی کا نائب صدر مسٹر انگلش دولت سعودیہ کے ذریعہ لیاات شیخ عبداللہ سلیمان کے ساتھ موٹر میں سوار ہو کر جدہ کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ شیخ عبداللہ سلیمان کی آمد مدت سے یہ چلی آرہی تھی۔ کہ جدہ کی بندرگاہ

International

Bechtel Corporation.

لے

Arabian American Oil Company. مختلف بنا لیا گیا۔ جیسا کہ امریکیوں پر مشورہ

میں ایک عمدہ گودی بن جائے جس کے ساتھ بڑے دفائی جہاز ٹھہر سکیں۔ دونوں اسی معاملے کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ موٹر جہدہ کی تفصیل کے ایک دروازے میں سے گزری تو وزیر مال نے پوچھا کہ گودی بنانے کے لیے لمبہ کہاں سے آئے گا؟ مسٹر انگلش نے مختصر سی دیر کے لیے سوچا پھر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہمیں ایسے لمبے کی ضرورت ہے۔ وزیر مال نے فرمایا: پھر تفصیل کو ڈھادیجئے اور لمبہ استعمال کر لیجئے۔

تفصیل مزید کچھ مدت کے لیے قائم رہی اور افواہ پھیل گئی کہ پچھلے کمپنی یہ کام انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن ایک روز چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پوری تفصیل کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا اور وہ ارجا کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گئی۔ بل ڈوزروں کے ذریعہ سے اسے ہوا کر دیا گیا اور بڑے بڑے ٹرکوں میں بھر کر محل پر پہنچا دیا گیا۔

جہدہ لہور اسلام سے پہلے موجود تھا، لیکن مشہور شہر کی حیثیت سے اس کی مہمہ مہمہ فلسطین کا مشہور مقام جو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ بنی اسرائیل نے مصر سے آکر فلسطین میں سب سے پہلے اسی شہر پر حملہ کیا تھا۔ اور بائبل کے بیان کے مطابق حملے کے ساتھ ہی تفصیل گر گئی۔ واقعہ ہے کہ عین حملے کے وقت سخت بھونچال آیا جس کی تفصیل گر گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ اردن کا ایک حصہ صفور بنامہ کے لیے خشک ہو گیا جیسے عام بھونچال کے مطابق زلزلہ بہار کے وقت دریا گنگا دو تین منڈ کے لیے بہت سے لوگوں کو خشک نظر آیا تھا۔ یہ سب کچھ خدا کی رحمت سے تھا اور بنی اسرائیل کا میاب ہو گئے۔ ابراہیم کے لفظی معنی خوش بد کہ ہیں اور ان کا ترجمہ بدستون ہونا چاہیئے۔

ابتداءً ۱۷۷۷ء میں ہوئی۔ حبیب میرا لمونین حضرت عثمانؓ نے اسے مکہ معظمہ کی بندرگاہ
تیار دیا۔ ۱۷۷۸ء میں پرتگیزیوں کے ایک بیڑے نے جدہ پر حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ان نامبارک
حالات میں یورپ کے ساتھ اس شہر کے تعلقات کی طویل اور بے بہرہ تاریخ شروع
ہوئی۔

انیسویں صدی میں برطانیہ و فرانس نے جدہ میں تو فصل خانے قائم کر لیے اور
تختہ سے سیلورنی تاجروں نے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اس عقیدہ مسلمانوں کو
اس پر شدید اعتراض تھا۔ وہ کہتے تھے کہ حجاز مقدس سرزمین ہے جس پر کسی غیر مسلم
کے قدم نہیں آسکتے۔ ۱۸۵۷ء میں جوش غیظ کی یہ آگ غیر متوقع طریق پر بھڑک
اٹھی۔ ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کے لندن ٹائمز میں اس کی غیبتوں مرقوم ہے کہ برطانوی
گورنر سائیکلوپس، برطانوی اور فرانسیسی تو فصلوں کو سوزنے کے راستے جدہ لایا
اور ایک مفتہ دریاں ٹھہرا رہا۔ دار جون کی شام تک حالت بالکل پُر سکون
معلوم ہوتی تھی۔ پھر جدہ کے چند یونانی باشندے تیر کر سائیکلوپس تک پہنچے
اور اطلاع دی کہ جوشیے مسلمانوں کا ایک ہجوم بزور برطانوی تو فصل خانے
میں داخل ہو گیا، مکان میں جو کچھ تھا اٹھا لیا، جھنڈا پھاڑ کر پھینک دیا، اور
برطانوی تو فصل مسٹر پیج کے مار ڈالا۔ نھوڑی دیر بعد یہ خبر ملی کہ اسی ہجوم نے فرانسیسی
تو فصل جیسیوالی لائے اور اس کی یوری کو بھی ہلاک کر دیا۔ تو فصل کی بیٹی اس

(i) Cyclops. (ii) Mr. Page. (iii) M. Eveillard

M. Eveillard.

کشکش میں زخمی ہو گئی۔ اگلے روز سائیکلوپس کے جہاز یوں نے حیدرہ میں اترنے کی کوشش کی لیکن انہیں گودی پر سے مار مار کر پیچھے ہٹا دیا گیا۔ جنگام چار روز جاری رہا۔ پانچویں روز حجاز کا گورنر مکہ معظمہ سے پانسو ترک سپاہیوں کے ساتھ حیدرہ پہنچا۔ اور اس نے امن بحال کیا۔ اس وقت تک اکیس مسیحی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ جب ترک افروں نے فساد یوں کے خلاف مناسب کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تو سائیکلوپس نے شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ آخر گیارہ مجرموں کو چھانسی کی سزا دی گئی

۱۸۵۷ء میں بمقام حیدرہ جو واقعات پیش آئے تھے رولڈن ٹائمر نے ان کی صحیح کیفیت بیان نہیں کی۔ شیخ احمد بن زینی دعلان نے اپنی کتاب ”خلاصۃ الکلام فی بیان امر السلب الحرام“ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا مفاد ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ صحیح حالات سامنے آجائیں:-

حیدرہ کے ایک تاجر کے جہاز پر انگریزی پرچم لہا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی جگہ دولت عثمانیہ کا جھنڈا لٹکائے۔ برطانوی تو فصل نے اسے منع کیا۔ لیکن تاجر غرور جہاز کے ترک والی زامق پاشا سے اجازت سے چکا تھا۔ اور اس نے جھنڈا تبدیل کر لیا۔ انگریزی تو فصل کو معلوم ہوا تو وہ جہاز پر پہنچا، عثمانی جھنڈا اتارا اور انگریزی کا جھنڈا اچڑھا دیا۔ افراد پھیل گئی کہ تو فصل نے عثمانی جھنڈے کو ہمالی کیا اور دولت عثمانیہ کے متعلق تمہیں باتیں کہیں۔ اس پر لوگوں میں برش پیدا ہوا۔ ۶- ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء میں کو لوگ مسیحیان کے عالم میں تو فصل غلے پیچھے۔ انگریز تو فصل کو قتل کر دیا۔ پھر ایک قلعہ شروع ہو گیا، اور حیدرہ میں بغیر مسلم تو فصل یا نصرانی موجود تھے، ان میں (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر سائیکلوپس کا بحری دستہ ساحل پر اترا۔ ترکی فوج کے ایک حبیش نے اسے تازہ بنی ہوئی قبروں تک پہنچایا۔ جن میں مقتول مسیحیوں کو دفن کیا گیا تھا۔ یہ قبریں اب بھی چھوٹے سے یورپی قبرستان میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو شہر کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی بیڑا دوبارہ حیدرہ پور قابض ہو گیا تھا۔ یہ نرکوں کو سرزمین عرب سے نکالنے کے لیے فوجی مہم کا ابتدائی اقدام تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یکم مئی ۱۹۳۱ء کو

(رقبہ حاشیہ ص ۱۶) سے کچھ مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ نامنق پاشا کو اطلاع ملی تو وہ خود حیدرہ پہنچا۔ ساتھ ہی فتنہ فرو ہو گیا۔ جن لوگوں پر قتل یا لوٹ مار کا الزام تھا۔ انھیں گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا اور پورے واقعہ کی تفصیلات قسطنطنیہ بھیج دی گئیں۔ پھر نامنق پاشا اداٹے جج کے لیے مکہ معظمہ چلا گیا۔ جج کے بعد سب لوگ سنی میں جمع ہوئے۔ حبیب اطلاع ملی کہ انگریزی جہاز آیا اور اس نے حیدرہ پر گولہ باری شروع کر دی تو بہت سے لوگ بال پھول اور مال قمار کے ساتھ شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ نامنق پاشا نے تمام بڑے بڑے مسلمانوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ اکثر لوگ مقابلے کے لیے تیار تھے۔ نامنق پاشا نے حسن تدبیر سے ان سب کو ٹھنڈا کیا اور ایک جماعت کے ساتھ خود حیدرہ پہنچا۔ انگریزی جہاز کے کپتان سے بات چیت کی۔ ستمبر ۱۸۵۹ء کے آذربین سلطنت عثمانیہ کے نمائندہ سادہ بڑے بڑے فرانسیسی بھی حیدرہ پہنچ گئے۔ غرض گفت و شنید کے بعد دو بڑے آدمیوں اور تقریباً بارہ عام لوگوں کے لیے نرس پر قتل کا الزام ثابت ہوا۔ موت کی سزا تجویز ہوئی۔ کچھ لوگ تھکے تھکے گئے اور بعض کو ایک خاص مدت کے لیے حیدرہ سے خارج کر دیا گیا۔ فتنے کا آغاز انگریزوں کو فصل کی فصلی سے ہوا، لیکن حیدرہ میں کوئی ذمہ دار حاکم اس وقت موجود نہ تھا، اس لیے حالات بگڑ گئے۔

دولت سعودیہ کی حکومت پہلے پہل تسلیم کی تھی۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۲۰ء کو برٹش پہلا امریکی سفیر تھا۔ جو دولت سعودیہ کے علاوہ مصر میں بھی سفارتی خدمات انجام دے رہا تھا، لیکن وہ جبرہ میں مقیم نہ ہوا۔ یکم مئی ۱۹۲۲ء کو جیمز مور جونیئر سفیر مقرر ہو کر آیا، جو وزارت خارجہ میں خوب تربیت پا چکا تھا، اے بی کلفٹ عربی بولتا تھا اور اہل مکہ و شام میں سفیر رہے۔ اس نے ہاتھ بندھ کر سفارت خانہ قائم کیا۔ موزسری جبرہ کے فلسفے سے جبرہ پہنچا تھا۔ کارل ٹویچل، جے جی ہاملٹن اور اے ایل وادس بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ امریکہ کے پہلے زرعی و فک کے رکن تھے، جو دولت سعودیہ پہنچا گیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دراعنت اور آیامہ کے مسائل کا اندازہ کریں اس وقت جبرہ میں کوئی پولیس نہ تھا۔ اراکے، موزس کے اپنے ٹھکانے کا بندوبست کیا اور وہاں مکان سنبھرا اور قیام گاہ بنایا۔ چھ مہینے تک نہ ڈیکس آئے اور نہ ٹائپ رائٹر۔ موزس خفیہ فائلیں اپنے بزنس کے لیے رکھتا تھا۔ میری دینی کے ساتھ تعلیم کو ذریعہ وہ جہان تھے جو مہینے میں ایک بار آیا کرتے تھے یا پورٹ سودان کی وسعت سے بحر کی تازہ میٹھے جاتے تھے۔ جبرہ میں اس وقت قریباً چالیس مسیحی رہتے تھے۔ ان میں پاروورتین بھی اور آٹھ امریکی کوئی ایک درجن کے قریب یورپی لوگ تھے۔ ان حالات میں موزس نے دولت سعودیہ کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کا بنیادی ڈھانچہ بنایا۔ اگست ۱۹۲۲ء میں کرنل ویم اسے شریڈائی سینئر مقرر ہوا۔ جو سیف و قلم دونوں کا

-
- (i) Bert Fich (ii) James S. moose (iii) Karl twitchell
(iv) J. G. Hamilton (v) A. L. Watson
(vi) William A. Eddy

دہنی تھا۔ اور عربی بولنے پر ایسی پوری مہارت حاصل تھی۔ اس لئے امریکہ اور دولت سعودیہ کے تعلقات کو بہت تقویت پہنچائی۔ اس کی سفارت کا نہایت اہم واقعہ یہ ہے کہ جنوری ۱۸۶۲ء میں مرحوم بادشاہ ابن سعود شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ ایک امریکی جنگی جہاز کو غنسی پر موار ہو کر پریٹ ریڈ ویٹ سے ملنے کے لیے نہر سوڈن کی بڑی تھیل میں پہنچا۔ شاہ ابن سعود پہلے بحرین اور کویت جا چکا تھا گو جزیرۃ العرب سے باہر نہیں نکلا تھا۔ امریکہ اور دولت سعودیہ کی دوستی کا یہ ایک نہایت اہم واقعہ تھا۔

یکم جولائی ۱۸۶۲ء کو کرنل ایڈری نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ مسٹر رائڈز چائٹلڈ مسفیر مقرر ہوا، جو خلیج فارس سے طنجہ تک مختلف عرب ممالک میں نہایت شاندار اور طویل سفارتی خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس نے چار سال سے زیادہ مدت جدہ میں گزاری اور جنگ کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے ان سے عہدہ برآ ہوتا رہا۔ اس اثنا میں فلسطین کی صورت حال کی وجہ سے تناؤ کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ چائٹلڈ زہی کے زمانے میں طہران کے ہوائی اڈے کے متعلق امریکہ سے پہلا معاہدہ ہوا۔ اب تک چائٹلڈ کی اصل بعثیت پورے مسفیر کی نہ تھی۔ ۱۸۶۹ء مارچ ۱۸ء سے اسے مسفیر کا درجہ مل گیا اور وہ ستمبر ۱۸۶۵ء تک اس عہدے پر مامور رہا۔ پھر عینڈا کے گھرنے ۱۸۶۳ء کے وسط تک سفارتی وزارت انجام دیتا رہا۔ بعد ازاں یہ عہدہ جارج واڈزنگھ کو مل گیا جس نے پوری زندگی

-
- (i) Quiney (ii) Rives Childs (iii) Taugier
(iv) Raymond A. Hare (v) George Wapworth

مشرق قریب کی سفارتوں میں گزار دی ہے۔ جنگ کے بعد ابتدائی دور میں جو لوگ
عہدہ آتے تھے وہ ہوٹل عہدہ میں قیام کرتے تھے۔ یہ چار منزلہ عمارت زمانہ
بہنگ میں بنی تھی، لیکن اس کے انتظامات انہی اطمینان بخش دیکھنے والے ہیں ہم
امریکی یا دوسرے لوگ جو باہر سے آتے تھے، اسی میں ٹھہرتے تھے۔ پھر موجودہ
ہوٹل تعمیر ہوا۔

بیت "اراکو" (عربی امریکی تیل کی کمپنی کا صدر دفتر) عہدہ کے طرز تعمیر
کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ یہ اصل میں ایک دولت مند تاجر خاندان کا
مکان تھا۔ اس کا پلستر کہیں سے تڑخا ہوا نہیں، کھڑکیاں سلامت ہیں
اور ان پر تازہ روغن پھرا ہوا ہے۔ اسی میں تیل کی کمپنی کا نمائندہ گیری آڈن
اپنے عملے کے ساتھ رہتا ہے۔ وہی کمپنی کی طرف سے دولت سعودیہ کے
ساتھ تعلقات کا کفیل ہے۔ اس کے کمرے ٹھنڈے رکھنے کا انتظام کر لیا گیا
ہے اور عہدہ کی گرم صبح کے وقت بیت "اراکو" میں لبنان کے پہاڑوں
جیسی راحت افزا فضا ہوتی ہے۔

پہلے عہدہ میں تفصیل کے ساتھ ساتھ ایک نرنگ تھی، جو پورے شہر کے گرد
پھیل ہوئی تھی۔ نسیمل ڈھادی گئی تھی۔ سڑک اور چوڑی ہو گئی۔ اب یہ ایک
سایہ دار شاہراہ ہے۔ جو بیت "اراکو" سے شروع ہو کر مندرگاہ کی آخری حد
تک جاتی ہے۔ پھر یہ سمندر کے کنارے جنوب کی جانب ٹکڑی ہو گئی ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ بڑی شاندار عمارتیں کھڑی ہیں۔ انہی میں مصر، بالینڈ، شام، عراق

لبنان، فرانس، چین اور برطانیہ کے سفارت خانے اور تو فصل بنانے ہیں۔
 برطانوی سفارت خانے کے باغ میں لکڑی کا ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے،
 جہاں کسی زمانے میں بینڈ (باجا) بجایا جاتا تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم میں غیر معمولی حالات
 کے ماتحت بنایا گیا تھا۔ لائسنس اور رونا لڈ سٹورڈ اس وقت عرب میں برطانوی
 سیاسی معاملات کے کفیل تھے۔ وہ ایک رات بیٹھے باہیں کر رہے تھے کہ ٹیلی فون
 کی گھنٹی بجی۔ شریف حسین (سابق شاہ حجاز) نے دریافت کیا: آیا آپ
 لوگ بہت کرب کی گئے کہ جو بینڈ ترکوں سے ہاتھ لگا ہے، آپ کو منایا جائے دونوں
 انگریز انکار کر رہے ہیں نہ کہتے تھے۔ چنانچہ جو بینڈ مکہ میں بچ رہا تھا، ان دونوں
 نے جلد میں بیٹھ کر سنا۔ اور شریف کا شک یہ ادا کیا۔ شریف نے اسی وقت
 بتایا کہ بینڈ عبدالرزاق جلد آپ کے پاس جلد بھیج دیا جائے گا۔ اس واقعے
 سے کچھ مدت بعد امیر عبداللہ (ابن شریف حسین) کھانے کی دعوت کے سلسلے
 میں برطانوی مرکز میں آیا تو اس کے پیچھے پیچھے پرانی ترک کی وردیاں پہنے ہوئے
 بینڈ والے لوگ بھی تھے۔ پر لطف امر یہ ہے کہ انہوں نے بینڈ میں سبز مٹی کا
 تومی گیت بجایا۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ ہمیں ترک کی بھیج دیا جائے، لیکن امیر
 عبداللہ اور شریف حسین کو یہ بینڈ اتنا پسند تھا کہ یہ درخواست منظور نہ
 ہوئی۔ چبوترہ اسی بینڈ کے لئے منبہایا گیا تھا۔

اسی سایہ دار شاہراہ پر ان بڑی بڑی لیرپی کمپنیوں کے دفتر ہیں، جو
 جلد میں کاروبار کر رہی ہیں۔ مثلاً امریکہ کی بین الاقوامی تعمیر، فرم انٹرنیشنل

سپل امریکہ کی ایسٹرن ٹریڈنگ کارپوریشن اور برطانیہ کی سیٹلی سونک کمپنی جو بحیرہ
 روم کے اس پاس کی غالباً سب سے زیادہ مشہور تجارتی فرم ہے۔ اخوانہ کمپنی
 درم و بام کے علاوہ بنگلہ بھی چلاتی ہے۔ اسی کمپنی نے وادی فاطمہ کا پانی
 نلوں کے ذریعہ سے حیدرہ پہنچایا۔ دونوں مقلات کا درمیانی فاصلہ قریباً تیس
 میل ہے۔ اسی طرح جدہ میں قلت آب کی شکایت ایک حد تک دور ہو گئی۔
 اس اثنا میں شہر کی آبادی پس ہزار سے ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ ہو گئی۔
 بہم درانی آب کے اس جدید نظام کا افتتاح ۱۸۰۱ء نومبر ۱۹ء کو ہوئے۔
 شاندار طریقہ پر اس شہر کے شمالی دروازے پر منی خیم ہوتے تھے۔ سلطان ایک
 چشمہ بنا دیا گیا۔ جہاں پر مختلف دعوت کا انتظام ہوا۔ اس میں کم و بیش پچیس
 ہزار آدمی شریک تھے۔ انہی میں وزیر مال بھی تھا۔ اور ولی عہد سلطنت
 بھی ہوا۔ جسکل دولت سعودیہ کا بادشاہ ہے اور جسے اس تقریب کے لیے بلور خاص
 دعوت دی گئی تھی۔ شاہی خاندان کے دوسرے افراد اور مختلف سفارتوں کے
 نمائندے نیز بہت سے ممتاز اصحاب بھی شریک تھے۔ اس موقع پر تقریریں
 بھی ہوئیں۔ دولت سعودیہ کے ہوائی بیڑے کے چھ جہاز بھی مصر ف پرواز
 تھے۔ افتتاح یوں ہوا کہ سب پہلے ولی عہد نے نلوں کے ذریعہ سے آیا ہوا
 پانی چاندی کے پائے میں پیا۔

برطانیہ کے سفیر کے مکان سے ذرا آگے سایہ دار شاہراہ اندر کی طرف آجاتی
 ہے۔ یہاں سمندر کے کنارے ایک بہت بڑی پرانی عمارت ہے جسے بیت بغدادی

کہتے ہیں۔ یہ جذبہ کے خاص طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں ترکی گورنر رہتا تھا۔ پھر اسے عرب کے مشہور سیاح اور کشف سینٹ جان ٹیلی نے لے لیا۔ اراکھ "کاپلہ مرکز حیدہ میں ابھی "بیت لحدادی" تھا آج کل اس میں کم بیش پچاس خاندان مقیم ہیں اس کے قریب ہی سوق یا منڈی کا بازار ہے جس کے اندر سے نمونے کی بھی بہت سی دکانیں بنی ہوئی ہیں تاکہ معلوم ہو جو نمونہ و منبع اختیار کر رہا ہے۔ اس کا نام سوق امیر فیصل ہے، لیکن زیادہ تر لوگ اب بھی پرانے سوق ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جس میں تنگلیچ دار گلیاں ہیں اور پرانی دھج کی حامیانہ سی دکانیں۔ کہیں۔ ات سیٹھا ہے اور اپنے لیے پیاز، بلیغ فٹ جگہ سی کافی سمجھتا ہے۔ کہیں قالین فروش بیٹھا ہے اور اس کی دکان کم از کم نمیس فٹ لمبی، نمیس فٹ چوڑی ہوگی۔ عرب کے مراؤں سے بہتر کم کی ایسی مل سکتی ہے۔ جو وہ میں برطانیہ کی طوائف اشرفی کو سب گراں قیمت سکھ سچا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ روپیہ جمع رکھنے کے لیے بھی موزول ہے اور بڑا کاروبار بھی اس کے ذریعہ یہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اس اشرفی کی عام قیمت سو اٹھ ڈالر ہے، لیکن جذبہ میں یہ گیارہ سو سے پس ڈالر تک فروخت ہو سکتی ہے قیمت کی کمی بیشی رسد و طلب پر موقوف ہے۔ پھر جن اشرفیوں پر شاہ جاسج کی تصدیق ہو، وہ ایڈورڈ کی تصدیق والی اشرفیوں سے اور ایڈورڈ کی اشرفیوں کو کٹیر یہ کی اشرفیوں سے زیادہ قیمت پاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سکہ جتنا پرانا ہوگا گھسنے سے اتنا ہی سونا کم ہو جائے گا۔

دولت سعودیہ کا عام سکہ ریال ہے۔ یہ چاندی کا ہوتا ہے۔ اور آج کل

انگلستان، امریکہ اور میکسیکو کی ملکالوں میں تیار ہوتا ہے۔ عربی امریکی تیل کی کمپنی کے وسیع کاروبار اور نواحیوں کے وسیع سلسلے کے باعث ریال کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات نئے تیار شدہ ریال ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے عرب پہنچائے جاتے ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ ریال کے انبار ہوائی جہازوں سے اتار کر ٹرکوں میں لاد دیے جاتے ہیں اور عرب ڈرائیور حفاظتی دستے کے بغیر جی انہیں بینک با وزارت مال میں پہنچا دیتے ہیں اور وہاں ریالوں سے بھرے ہوئے صندوق مفتوح حفاظت و نگہ رانی کے بغیر پڑے رہتے ہیں۔

ریال کے علاوہ میر یا نظریا کا ٹالر بھی ملتا ہے۔ جو ماضی قریب تک حبشہ کا سبب داری سمجھا۔ اور سن میں اب تک اس کا رواج ہے۔ دولت سعودیہ میں کاغذی سکہ ہنوز رائج نہیں ہوا۔ جدہ کے بعض صرافوں کے پاس مختلف قسم کے سکے موجود ہیں۔ مثلاً پرانے ترکی سکے یا زاروں کے عہد کے روسی سکے، سندھی اور چینی سکے، رومہ، یونان اور حمیر (جنوبی عرب) کے پرانے سکے۔ جدہ میں دستکاری کے جو نمونے ملتے ہیں وہ عموماً معمولی اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاہ ابن سعود راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باعث تصیریروں اور نقش و نگار کے سخت خلاف ہے۔ لکڑی کی کھڑادیں بڑی اچھی بنتی ہیں جن میں چمڑے کی پٹیاں لگی ہوتی ہیں۔ اور ان پر نیلا اور نقری کام ہوتا ہے۔ جدہ کے دستکار چاندی کے سکوں سے پہنچیاں، کانوں کے آویزے اور سیٹیلوں کے بلکل بناتے ہیں۔ قالین بھی بنتے ہیں، لیکن دولت سعودیہ کے عرب تاجر

زیادہ تر قلعین ایران اور ہندوستان سے منگاتے ہیں۔ بکری یا اڈنٹ کی پشم کا کپڑا بھی مختصری مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ باقی عام کپڑا دنیا کے ہر حصے سے منگوا یا جاتا ہے۔ ارزاں پارچوں میں ہندوستان کو اور زیادہ قیمتی پارچوں میں برطانیہ اور امریکہ کی مصنوعات کو ترجیح حاصل ہے۔

جدہ میں حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۷ء کے موسمِ خزاں میں مصر کے اندر مہینہ کی وبا پھوٹ پڑی تو دولتِ سعودیہ اس سے بالکل محفوظ رہی۔ اس زمانے میں ہر شخص کو بزرگاہِ جدہ کے قریب ایک جزیرے میں پانچ دن کے لیے رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے بیٹے بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھے۔ قرنطینہ میں پانچ دن گزارنے کے بعد ماحصل پڑنے کی اجازت دی جاتی تھی

سوق یا منڈی سے آگے جدہ کی سب سے بڑی تجارتی فرم نیدرلینڈ ٹریڈنگ سوسائٹی کا نیا دفتر ہے جسے عام طور پر ڈچ بینک (ڈلنڈری بینک) کہتے ہیں جزائرِ مشرقِ الہند موجودہ انڈونیشیا کے کروڈل مسلمانوں میں سے ہزاروں ہر سال حج کے لیے جاتے ہوئے جدہ سے گزرتے ہیں۔ ڈلنڈری بینک اس کاروبار کی وجہ سے بہت خوشحال ہو گیا ہے۔ ایک اور مالی ادارے بینک دی لا اندونیشین (بینک ہندوچینی) کی بھی ایک شاخِ جدہ میں موجود ہے، جو ملائی اشرافیوں کے مبادلے کا نفع بخش کاروبار کر رہا ہے۔

جدہ میں بہت سی مسجدیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کے مینار نہیں۔ ایک مسجد

(i) Netherlands Trading Society

(ii) Banque de l' Indochine

ڈیج بینک کے قریب ہے۔ اس کا مینا ایک طرف آنا چھک گیا ہے کہ وہ پسا کے
مینا رنجیدہ کا حریف معلوم ہوتا ہے۔

ڈیج بینک کے جنوب میں وہ عمارت ہے جہاں امریکی سفارت خانے کا محلہ رہتا
تھا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۶ء تک امریکی سفارت خانے کا اسپتال بھی اسی عمارت
میں تھا۔ جنگ کے دوران میں دولت سعودیہ کے مغربی حصے میں اس کے سوا
دوسرا محاصرہ کا کوئی جی مرکز نہ تھا۔ بیرونی سایہ دار شامہ آخر ایک میدان پر
ختم ہوتی ہے جسے سمیران ملک عبدالعزیز لکھتے ہیں یہ جابرہ کا بہت بڑا
چوک ہے۔ شہر کی تمام تقریبات جشن اور دعوتیں اسکا جگہ ہوتی ہیں کبھی کبھی
اس مقام کو مفتی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہیں سمندر کے کنارے
چنگی خانہ واقع ہے۔ اس کے دونوں طرف بہت سی تخریبیں بنی ہوئی ہیں۔
ایک طرف قرنطینہ والوں کے اترنے کی گودی ہے ۴ دوسری طرف عازمین
حج اترتے ہیں۔ دولت سعودیہ کی بندرگاہوں مثلاً ”دیجہ“ ”یلمبوخ“ اور طیت
نیز پورٹ سردان اور این کی بندرگاہ جدیدہ سے مسافر عموماً آتے رہتے ہیں۔
البتہ سال بھر میں دو مہینے بڑا ہجوم رہتا ہے۔ اور یہ مقام خاص سرگرمیوں
کا مرکز بن جاتا ہے۔ چالیس ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک عازمین حج اطراف عالم
سے جہۃ اترتے ہیں۔ وہ علاقائی مغربی اور کم ریش ایک درجن دوسری زبانیں
بولتے ہیں ان میں فقیر اور دریش بھی ہوتے ہیں، دولت مند تاجور اور امراء
بھی۔ ان کے ساتھ بیسیوں نوکر چاکر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ زندگی میں
صرف ایک دفعہ حج کرتے ہیں۔ وہ سال با سال تک اس غرض سے پیسے بچاتے

رہتے ہیں اور جب آتے ہیں تو دل کھل کر خرچ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے حج بیت
سعود میں کئے لوگوں کے لیے خاصے بڑے کاروبار کا ذریعہ بن گیا ہے۔ جنگ یا بیماری
کے باعث رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے تو مختلف ملکوں کے سکولوں میں ساٹھ لاکھ سے
آسی لاکھ ڈالر تک رقم دولت سعودیہ کے خزانے میں پہنچ جاتی ہے بعض لوگوں
کو حیدہ پہنچنے میں ایک ایک دو دو سال لگ جاتے ہیں، لیکن عام مسلمان سفر
حج کا انتظام کارندوں کی معرفت کر لیتے ہیں، جو روپیہ لے کر ہر چیز کا بندوبست
کر دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض عازمین حج اب بھی خشکی کے راستے اونٹوں پر سوار
ہو کر لے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگ جہازوں میں پہنچتے ہیں اور پانچ روز
طوًر یا حیدہ کے قریب عینہ میں گزار کر ساحل پر اتارتے ہیں۔ تین چار ہزار
دولت مند مسلمان ہر آئی جہازوں کے ذریعہ مکہ پہنچ جاتے ہیں۔ ارض مقدس
میں پہنچنا نیک دل مسلمانوں کے لیے بڑی ہی سعادت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ وہ
اس سرزمین مقدس کو سجدے میں گر کر بوسہ دیتے ہیں جو رسول پاک صلعم
کے قدموں کے مبارک سے مشرف ہوئی۔ موسم حج میں حیدہ کے بہت سے لوگ
عازمین حج کو اپنے ہاں جگہ دے دیتے ہیں اور ان سے رقمیں وصول کر لیتے
ہیں۔ خاصی تعداد کھلی جگہ ہی میں بیٹھ جاتی ہے۔ جب عازمین حج کی آمد
کا زور ہو تو میدان ملک عبدالعزیز دن رات کچا گھج بھرا رہتا ہے۔ زیادہ
تر لوگ حیدہ سے اونٹوں پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچتے تھے۔ اب کئی سڑک
بن گئی ہے۔ بسوں کا بیڑا رات دن اس پر دوڑتا رہتا ہے اور دو دن کا
سفر دو گھنٹے میں پورا ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ لاؤ سپیکر لگا رکھے جاتے ہیں تاکہ

بسوں کی آمد کے متعلق حلیوں کو بروقت اطلاعات ملتی رہیں۔ کوئی غیر مسلم کہہ
مخلفہ کی سڑک پر پندرہ میل سے آگے نہیں جاسکتا، جہاں سیاہ پہاڑی کئے
دامن میں پتھر کا ایک نشان نصب ہے۔ سبز قرطینہ کی گودی کے برابر ہی ایک
گلابی رنگ کی عمارت ہے۔ یہ وزارت مال ہے جس میں شاہ ابن سعود کے دست
راست اور مشیر خاص شیخ عبداللہ سلیمان دولت سعودیہ کے روز افزا دلائل
کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کرتے رہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت مدینہ میں
گزارتے تھے، لیکن دوسرے اہم معاملات کی طرح بڑے بڑے مالی مسائل بھی
ریاض میں طے ہوتے تھے، اور دولت سعودیہ کا سیاسی مرکز ہے۔

میدان ملک عبدالعزیز کے جنوب میں سفید عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے،
جس میں نورڈ اور لنکن موٹروں کی نمائش گاہ، مرمت کا کارخانہ اور دفتر
ہے۔ اس عمارت کا مالک شیخ علی رضا کا خاندان ہے۔ یہ سب سے زیادہ ذمی اثر
تاجروں اور بحران کے حدود و دولت مند خاندانوں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے
موتیوں، زنانہ ریشمی کپڑوں اور خوشبوؤں کی تجارت میں کروڑوں ڈالر پیدا
کئے۔ آج کل یہ نورڈ اور لنکن کی موٹروں اور زینتہ کے ریڈیو کی تجارت کر رہے
ہیں۔ علی رضا والوں نے ایک موقع پر تنے ٹرکوں کے لیے کام کیا اور بھیجا کہ انہیں
جدہ پہنچانے کے لیے پورا جہاز کہ یہ پر لینا پڑا۔ ۱۹۶۹ء تک دولت سعودیہ کے
بحیرہ تدریم والے ساحل پر کوئی ایسی گدی نہ تھی جہاں بحری جہاز ٹھہرائے جاسکتے
اس لیے علی رضا والوں کو خاص انتظام کرنا پڑا جس کے بعد موٹروں اور ٹرکوں
کہ جہاں جی چاہے آنا جاسکتا ہے۔ نمائش گاہ سے ملازمہ اگر اج حسن انتظام

کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دکان میں موٹر ویل کے مختلف پرنڈس بھرے پڑے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ دولت سعودیہ میں موٹر میں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ علی رضا کے خاندان کے ایک نوجوان نے کیلے فوریا کی پرنڈس میں تعلیم پائی اور ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ امریکی اوضاع کو بہت پسند کرتا ہے۔ اور اپنا پورا وقت کاروبار میں لگا دیتا چاہتا تھا، لیکن انٹر نیٹ ویلی عہد و وزیر خارجہ سعودیہ کے مشیر و ترجمان کی حیثیت میں اسے پورا وقت صرف کرنا پڑا۔ انجمن اقوام متحدہ میں یہی دولت سعودیہ کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ اور آج کل وزیر دولت ہے۔

جدہ کے حوالی میں بسنے کے لیے زیادہ خوشگوار مقام اس شہر کے قریب واقع ہے جو موافی اڈے کی طرف جاتی ہے۔ یا نسبتاً وہ بلند مقام، جو شہر کے شمال میں واقع ہے۔ جدہ کے غیر ملکی باشندوں اور دولت مند تاجروں نے بھی شہر سے باہر نکل کر شمال و مشرقی سمت میں مکان بنانے شروع کر دیے ہیں ان مقامات تک سڑکیں وہاں سے شروع ہوتی ہیں، جہاں ایک زمانے میں باب مکہ تھا۔ کھاڑی کے کنارے فوجی پارکیں ہیں جن کے پھاٹک پر بڑے بیسیل والی توپیں کھڑی ہیں۔ نئے مکانات کی قطاروں سے آگے بڑھیں تو شاہی محل کی سطح عمارت نظر آتی ہے۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت ایک چمک دار پشتہ ہے جو دوسری منزل تک جاتا ہے۔ اس پر سے موٹر میں آ جا سکتی ہیں۔

پرانے باب مکہ کے شمال مشرق کی طرف ایک احاطہ ہے۔ اس کے اندر ایک

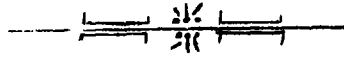
چالیس فٹ لمبی تھیں۔ سب سے عام طور پر حضرت حوا کی قبر قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پہلے بہت لوگ آتے جاتے تھے۔ شاہ ابن سعد کے زمانے میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اہل جدہ اب بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ ان کے شہر کا نام حضرت حوا کی وجہ سے جدہ ہوئی جان رکھا گیا۔

جدہ میں ایک پرانی روضہ کا مکان ہے جسے لامارث عودوں کی پناہ گاہ بتایا جاتا ہے۔ یہاں یوہو عمر تئیں بارہ خواتین رہتی ہیں جن کے رشتے دار ان کی دیکھ بھال کے لیے تیار نہ ہوں۔

جدہ کے دولت مند خاندان موسم گرما میں یا تو طائف چلے جاتے ہیں۔ یا مکہ معظمہ، مدینہ منورہ یا ریاض جو اندرون ملک میں قریباً پانسویں کے فاصلے پر واقع ہے۔ دولت مندوں میں ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے سفر کا انتظام ہو جانے کے باعث ان شہر والے تک آنا جانا آسان ہو گیا ہے اور سفر بہت سہل ہو جاتا ہے۔ ہر روز میں ہر قبیلہ پش عمر نہیں سفر ہو سکتی ہیں۔ جن کے ساتھ پیسے اور حبشی غلام جاتے آتے ہیں۔ تاہم بیروت اور دمشق تک صرف پانچ گھنٹے یا اس سے بھی کم مدت میں جا سکتے ہیں۔ اس وجہ سے حجاز کی عورتیں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے دتاً فوقتاً جاتی رہتی ہیں۔

جدہ میں کوئی سمینا گھر نہیں، البتہ مختلف سفارت خانوں میں تصویروں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک مدت تک یہ دستور رہا کہ تمام یورپی سفیر تصویروں دیکھنے کے لیے کسی ایک سفارت خانے میں جمع ہو جاتے تھے۔ جدہ کے ہوائی اڈے اور دولت مندوں کی شرکت میں حدیثات کے صدر دفتر میں بھی تصویروں دکھائی

جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ تجارت کے پہاڑی علاقے میں جہاں کان کنی کا کام جاری ہے۔ نیز الخارج میں جہاں امریکہ کا زرعی مرکز ہے متحرک تصدیروں کی تلاش کا انتظام ہے۔



۱۔ جتہ اور دولتہ سعودیہ کی ممکن دوسری مزید فزوری معلومات کے لئے وہ
 فیجھہ ملاحظہ فرمائیے جو مترجم نے دولت مذکورہ کے متعلق تذکرہ کے آخر میں لگا دیا ہے۔

دوسرا باب

سیمانی عہد کی ایک کان

سرزمین عرب کہ دور حاضر کی ترقیات سے مستفید کرنے کی باتیں تو بہت ہوتی رہیں، لیکن اس سلسلے میں جس شخص نے پہلا عملی قدم اٹھایا وہ ایک امریکی تاجر اور ڈیپلومیٹ تھا، یعنی چارلس آر کرین^۱۔ امام عیسیٰ مرحوم والی سین کے ساتھ کرین کے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اور اس نے فیصد کر لیا تھا کہ جس حد تک ممکن ہو امام کی مدد کرے۔ چنانچہ اس نے بطور خود چار نکاتی پروگرام تیار کر لیا اور ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ رقوم سڑکوں، پل، پانی کے بچوں اور دوسرے رفاهی کاموں میں صرف کر دی۔ اس سلسلے میں ایک نوجوان امریکی

۱۔ Charles R. Crane واضح رہے کہ کرین ۱۹۱۹ء میں فوت ہوئے۔ امریکی صدر وٹسن کی طرف سے فلسطین کے حالات دیکھنے کے لیے ایک کمیشن کا ممبر بن کر آیا تھا جسے کنگ کریں کمیشن کہتے تھے۔ اس کمیشن نے بورڈر کی کھتی۔ افسوس کہ اسے برطانیہ اور فرانس یا کہنا چاہیے کہ لاڈ جامع پوچھ لیا گیا۔ شہر کی خود غرضیوں نے بڑے کاروائی دی۔

انجینئر کارل ایس ٹریچل سے بڑی امداد ملی جس کی خدمات کریں نے ۱۹۲۷ء
میں حاصل کی تھیں۔ ٹریچل چھ سال تک سین کے کوسستانی علاقوں میں مصروف
کار رہا۔ اس اثنا میں اس کی شہرت سے پورا جزیرۃ العرب کو سچا اٹھا حجب
کو تین نے شاہ ابن سعود سے ملاقات کی تو شاہ نے فرمایا کہ آیا ٹریچل ہمارے ہاں
بھی آ سکتا ہے تاکہ کھیتی باڑی کے لیے ہمارے آبی وسائل اور دوسرے
منصوبوں پر عمل میں امداد دے؟ کریں نے شاہ کی بات مان لی۔ اور ۱۹۳۱ء
کے آغاز میں ٹریچل سعودی عرب میں چکر لگاتا رہا۔ تاکہ آبی وسائل اور معدنیات
کا اندازہ کرے۔ ان سفروں میں اکثر اس کی جوان ہمت انگریز بیوی بھی ساتھ ہوتی
تھی۔ ٹریچل کا ایک کام یہ بھی تھا کہ دولت سعودیہ میں ایسی اشیاء کا پتہ چلائے
جنہیں باہر بیجا جاسکے اور دولت سعودیہ کے لیے عارین حج کے علاوہ بھی مستقل
آمدنی کا ذریعہ نکل آئے۔

۱۹۳۲ء میں ٹریچل نے شیخ عبداللہ سیلمان وزیر مال کے پاس رپورٹ پیش
کر دی کہ مغربی دولت سعودیہ یعنی حجاز اور عسیر میں معدنیات کا امکان ہو سکتا
ہے مثلاً تانبا، پلاٹینم، سیسہ یہ امکان بھی ہے کہ چاندی اور سونا مل جائے۔
اس سے پیشتر ٹریچل ایک ملکی تبلیغی مشن میں ایک خاتون سے ملا تھا۔ اس نے پوچھا
تھا۔ آیا آپ نے عرب کی مشہور معدنیات طلا بھی دیکھی ہیں؟ کیا آپ کو معلوم
ہے کہ بائبل نے توحید میں ہونے کی قانون کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سورے کو چوکھانہ آیا

ہے۔ کتاب پیدائش باب دوم آیت ۱۱-۱۲)

لے Twitchell مزید تفصیلات آپ کو سن کے باب میں ملیں گی۔

ٹوپل کو اس اطلاع سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے بائبل میں حدیثات
اطلاق کے دوسرے حوالے بھی تلاش کر لیے۔ مثلاً سلاطین اول میں مذکور ہے۔

اور بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد چار سو اسی دیں سال
اسرائیل پر سلیمان کی سلطنت کے چوتھے برس ایسا ہوا کہ
اس نے (سلیمان نے) خداوند کا گھر بنانا شروع کیا اور باب ششم آیت
..... اور سلیمان نے اس گھر کو اندر اندر خالص سونے
سے منڈھا اور اہام گاہ کے سامنے اس نے سونے کی زنجیریں تان
دیں۔ اور اس پر بھی سونا منڈھا اور اس پورے گھر کو جب
نک وہ سارا گھر تمام نہ ہو گیا اس نے سونے سے منڈھا۔ اور اہام
گاہ کے پورے مذبح پر بھی اس نے سونا منڈھا۔

باب ششم آیت ۲۱-۲۲)

بائبل پڑھنے والوں کو شاید حیرانی ہوتی ہو گی کہ یہ سونا کہاں سے آیا چونکہ
عہد قدیم میں سونا نکالنے کے طریقے چنناں اچھے نہ تھے لہذا سمجھ لیا گیا کہ یہ ایک
کان سے نہیں بلکہ مختلف کانوں سے حاصل کیا گیا ہو گا۔ سلاطین اول میں بتایا
گیلے :-

سچر سلیمان بادشاہ نے ادوم کے ملک بن بجرہ قلم کے کنارے
..... جہازوں کا بیڑا بنایا اور حیرام نے اپنے ملازم سلیمان کے
ملازموں کے ساتھ اس بیڑے میں بھیجے۔ وہ طارح تھے جو سمندر سے
واقف تھے وہ ادفیر کو گئے۔ اور وہاں سے چار سو میں قنطار سونا

کے لئے اسے سلیمان بادشاہ کے پاس لائے۔ (باب نہم آیت ۲۶-۲۷)
 سوال یہ تھا کہ اذفر کی سرزمین کہاں ہے۔ آیا یہ ریح الخالی کے قلب کا مشہور
 اخلاوی شہر اوبار تھا جو اب ناپید ہو چکا ہے یا یہ مقام عمان میں تھا جو مسقط کے
 شمال میں ساحل پر واقع ہے، یا حیشہ میں تھا یا مین میں۔

ٹوچل نے شیخ عبداللہ کو بتایا کہ میں سمجھتا ہوں یہ کانیں حجاز میں تھیں۔
 اس لئے کہ زمانہ قدیم کی زیادہ تر معدنیات طلا ارض مدین میں تھیں۔ جو وادی
 حمص کے شمال میں ہے اور اس خطے کی کیفیت رچوڈر برٹن نے اپنی کتاب مدین
 کی معدنیات طلا میں بیان کی ہے۔ ٹوچل نے سادہ انداز میں ایک کتابچہ لکھ
 دیا جس میں تفصیلات بیان کر دیں کہ کس کس قسم کی چٹانوں میں کیا کیا دھاتیں
 ہر سکتی ہیں۔ وزیر مالیات نے اس کا ترجمہ عربی میں کرالیا۔ اس کے بعد وہ حبیب
 بھی دولت سودیہ میں دور سے پر نکلتا تو جگہ جگہ چٹانوں اور پتھروں کا معائنہ
 ٹوچل کے بیانات کی روشنی میں کرتا رہتا۔ حبیب ٹوچل سے وزیر موصوف
 کی ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان دونوں
 نے قریباً یکساں فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جس کے شمالی حصے میں سفید چٹانوں کی
 رگیں نمایاں ہیں اور یہ چٹانیں ویسی ہی ہیں جیسی ٹوچل کے نزدیک طلحی
 معدنیات کی چٹانیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ وزیر موصوف نے سواری کا انتظام
 کر دیا اور ٹوچل فوراً اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔

(i) Burton (ii) The Golden Mines of Midian

۱۱۔ یہ تفصیلات خود ٹوچل اور بعض دوسرے رسائل سے حاصل ہوئیں۔

اٹھ روز بعد شدید مشکلات سے گزرتے ہوئے ٹرچل کا قافلہ اس پہاڑ پر پہنچ گیا۔ جیسے ”مہد ذہب“ یعنی سونے کا گہوارہ کہتے ہیں۔ یہاں یقیناً سونا موجود تھا اور ممکن ہے ایک زمانے میں یہ حضرت سلیمانؑ کی نہایت قیمتی کان رہ چکی ہو۔ ایسے آثار بھی موجود تھے کہ اس میں کسی نہ کسی وقت کھدائی ہو چکی تھی۔ ممکن ہے فونیقیوں اور رومیوں نے یہ کھدائی کی ہو۔ نیز خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہو۔ پھر شاہ ابن سعود سے باقاعدہ اجازت نامے کے ٹرچل سرایہ کے انتظام کے لیے امریکہ روانہ ہو گیا۔ بعد ازاں انگلستان پہنچا۔ ۱۹۳۷ء میں دولت سعودیہ عربیہ کی ”شرکت معدنیات“ بن گئی۔ ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں کام شروع ہو گیا۔ اور اُجلی یہ دولت سعودیہ کے مغربی حصے میں سب سے بڑا صنعتی کاروبار ہے۔

اس مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ٹرک کے اٹھے اور صبح کی خشکی میں روانہ ہو جائے۔ اپنے ساتھ کم از کم دو موٹریں رکھنی چاہئیں۔ ان میں سے ایک مشین و گین ہو تو اچھا ہے۔ ایک ٹرک میں تیل، پانی اور دوسرا سامان لاد لینا چاہیے۔ دولت سعودیہ کے عرب محافظ بھی ساتھ لے لینے چاہئیں جو صحرائی جنگوں کے ماہر ہیں۔

شرکت معدنیات کی گودری اور میلے کی قیام گاہ سے آگے بڑھیں۔ تو قریباً آدھ گھنٹے تک سڑک ساحل کے ایک ریگستانی میدان میں سے گزرتی ہے جس میں کہیں کہیں سبزہ اور صحرائی جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ بدو گھ بانوں کے ٹرکے ریلوے پر چلنے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں میدان میں سفید دم والے

ہر مل بھی مل جلتے ہیں۔ شرکت معدنیات نے جو شاہراہ بنائی ہے، وہ دولت سعودیہ کی بہترین سڑک ہے اور موٹے میٹھے اڑھائی سو میل کا فاصلہ قریباً دس گھنٹے میں طے کر لیتی ہیں۔ جدہ سے چار پانچ میل پر پہنچ جائیں تو ایک کنواں ملتا ہے جس میں سے پون پکی کے ذریعے پانی نکلتا ہے۔ عرب میں ایسے چند ہی کنوئیں ہیں۔ چونکہ یہ ساحل سے قریب ہے اور ہوا اتنا نمی تیز چلتی رہتی ہے نہ پانی کی سطح نسبتاً قریب رہے، اس لیے خوب کام دیتی ہے۔ آگے بڑھیں تو میدان ختم ہو جاتا ہے اور نہ خیر نہ ہائیوں پر چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کوئی دو سو سال پرانے سنگین قلعے کے کھنڈر نظر آتے ہیں جس کے چھ برج شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترک اس مقام کو اپنے خطرہ رسد کا ایک اہم مرکز سمجھتے تھے۔

قلعے سے چند میل آگے جائیں تو ایک وادی آ جاتی ہے۔ اس میں ایک جگہ گرد آلود خلیستان دکھائی دیتا ہے اور پاس ایک گاؤں ہے اس میں کوئی ایک سو گھر ہوں گے جو کھجور کے تنوں اور شاخوں پتوں وغیرہ سے بنائے گئے ہیں۔ یہی مقام ہے جہاں لہذا کے قافلہ ہائے حجاج پھمبیس روز کی مشقت خیز مسافت کے بعد اس طریق جج پر پہنچتے ہیں جو دمشق سے مکہ معظمہ آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مکہ معظمہ سے نکلے تھے تو مدینہ منورہ جاتے ہوئے اس مقام پر بھی ٹھہرے تھے۔ اسی واقعہ سے اسلامی تقویم کا آغاز ہوا۔ (۱۲۲ھ) آج حجاز خشک اور نہ خیر نظر آتا ہے۔ لیکن ایسی شہادیں موجود ہیں۔ کہ ایک زمانے میں بارش کا پانی بہت بڑی آبادی کے لیے گزاریے کے مطابق غلہ پیدا

کر دیتا تھا۔ اور جگہ جگہ پرانے بندوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ جن میں سے بعض پندرہ
پندرہ فٹ تک اونچے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ترکوں کے زمانے کا معلوم نہیں
ہوتا اور غالب قیاس یہ ہے کہ یہ بند تیرھویں اور چودھویں صدی میں بنائے
گئے ہونگے۔ ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان بندوں کے ذریعے سے زراعت کے لئے
پانی محفوظ یعنی ہو جاتا تھا اور سیلاب کی مصیبتیں بھی پیش نہ آتی تھیں۔

جذہ سے چار گھنٹے کی مسافت کے بعد سڑک چکر لگاتی ہوئی ایک مسطح بلندی
پر پہنچ جاتی ہے جسے عرب کی سطح مرتفع کا مغربی کنارہ سمجھنا چاہیے۔ اس مقام
سے کوئی پچاس میل تک جو خطہ بھیللا ہوا ہے، وہ دنیا کے مدد درجہ ویلن اور بحر
علاقوں میں سے ہے۔ اسے سورہ کہتے ہیں یعنی جلا ہوا مقام۔ یہ ایک ایسی چٹان
میں مشتمل ہے جس کے متعلق سمجھا جاسکتا ہے کہ لاوے کا ایک سیل آیا اور ٹھٹھا
ہو کر لاکھوں ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ جو مسافر وسط عرب مکہ یا حبشہ آئیں۔ اُن کے
لیے لازم ہے کہ اس خطے سے گزریں۔ کوئی مسافر خواہ وہ پیدل ہو یا اونٹ پر سوار
دن کی گرمی میں اس خطے سے گزرتا ناقابل برداشت سمجھتا ہے۔ اگر

کوئی شخص شیش و گین میں بھی آئے تو یہ احساس تازہ رہتا ہے کہ ایٹم بم سے
بتا ہ شدہ دنیا کا وہ تہاڑا ہے جو بچ نکلا۔ ایک مقام پر سورہ دو پہاڑوں میں بٹ
گیا ہے۔ ایک سفید سنگ مہر کی معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسری سیاہ سنگ مہر
کی۔ یہ مقام جذہ سے کوئی سوا سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور قافلہ بہاں سے
جنوبی جانب سڑک اس سنگلاخ درے کی طرف جاتا ہے جسے وادی حتما
کہتے ہیں۔ اس مقام پر شرکت نے ایک مکان بنا دیا ہے۔ اس کے پاس ایک ریخیز

مکڑا ہے شرکت کے ایک سرگرم بوڑھے ملازم اور ڈرہم نے دو نصف نصف ایکٹ کے خطے صاف کیے۔ اور چند مارتیں بنادیں جن میں سے ایک پرفیدی پھری ہوئی ہے۔ یہ مکان صرف ایک منزل کا ہے۔ اس کی دیواروں پر اندر کی طرف ایرانی قوانین لٹکائے گئے ہیں اور دروازوں اور کھڑکیوں پر بڑے عمدہ پرے لٹکے ہیں۔ ہر جگہ کتابوں کے انبار نظر آتے تھے۔ کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھیں تو بطخیں، پوزے اور پیلو دکھائی دیتے ہیں۔ پاس ہی ایک پالنے بندر کھیلنا کو تار رہتا ہے۔ ڈرہم تمام ہانوں کی تواضع خوب زوں سے کرتا جو اس نے اپنے باغ میں بو رکھے تھے۔ ساتھ ہی خوش طبعی سے شکایت کرتا ہے کہ سٹالو فہبے سے آنے والے مسافر بھی کس قدر تکلیف کا باعث ہیں۔ پھر یہ گفتگو شروع ہو جاتی ہے کہ بارش کی سخت ضرورت ہے۔ جدہ کا نقشہ بدل رہا ہے اور دیکھئے میرا باغ ہر سال قریباً بیس فٹ کی رفتار سے پھیل رہا ہے۔ ڈرہم عام طور پر کہتا ہے۔ اچھا کھانا کھا کر استراحت ضروری ہے۔ کھانا اچھا نہ ہو۔ تو کام ٹھیک طریق پر نہیں ہو سکتا۔ آپ ٹھہر جائیں اور تھوڑی دیر سولیں۔ ذرا ٹھنڈ ہو جائے گی۔ تو چلے جانا۔ لیکن مسافر کے لئے ایک سوئیں میل کی مسافت سخت پریشان کن ہوتی ہے۔ لہذا وہ مذاقاً کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ دولت سعودیہ میں ڈرہم بہا فیروب کاشت کار ہے۔

مزید میں میل کی مسافت طے کر چکنے کے بعد اصل مرکز کو چھوڑ کر ایک صحرائی راستے پر ہو لیتے ہیں۔ یہی ریاض (دارالحکومت دولت سعودیہ) کا راستہ ہے اور ریاض

لے O. R. Durham. لے لفظ معنی سنہری کاؤں کا راستہ یہ اس لئے کام ہے جو کاؤں کی طرف جاتا ہے۔

یہاں سے کوئی چار میل کے فاصلے پر ہوگا۔ مختوڑی دور چل کر سیاہ پتھروں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک سنگلیں حوض اس وضع کا ہے جسے عرب "برکہ" کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ میں خلیفہ ہارون الرشید کی بیگم ملکہ زبیدہ نے عازمین حج کے لیے بنوایا تھا۔ حوض میں اتنی مٹی بھر گئی ہے کہ اوپر کی صرت دس فٹ جگہ خالی رہ گئی ہے۔ تاہم اس میں پانی بھرا رہتا ہے اور بدو وقتاً فوقتاً اپنے اپنے اونٹ لے کر یہاں آٹھرتے ہیں۔ اور بول کے درختوں کے نیچے بیٹھ بچھا لیتے ہیں۔

برکہ سے آگے ملکہ ریگستانی بنجر میں سے گزرتی ہے جس میں کہیں کہیں خانہاں جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سینگوں والے فزائل بڑی خوش سلوبی سے کاغیس بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز بادامی اور زردوزنگ کے گڑ گٹ ملے ہیں جن میں سے بعض تین تین فٹ لمبے ہوتے ہیں۔ یہ وہی جانور ہے جسے عرب "سومار" کہتے ہیں۔ گرویش کا علاقہ اتنا بنجر ہے کہ جہاں بول کا کوئی درخت ہوا سے بطور نشان استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا ہی درخت کوئی تیس فٹ اونچا ہوگا جیسے ان سنگریزوں میں بھی خم آکر دھجکل گئی۔ یہ مقام "الشجر" (درخت) کے نام سے مشہور ہو گیا اور پاس کی پہاڑی کو "جبل النشائے" (چائے کی پہاڑی) کہنے لگے۔ اس لیے کہ شریکت کے ٹوکوں کے ڈرائیو معمولاً اس سایہ دار جگہ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔

حضرت سلیمان یا ہارون الرشید کے زمانے میں جن لوگوں نے سونا نکالنے کا کام شروع کیا تھا وہ انھیں پانی کی کمی یقیناً محسوس ہوتی ہوگی۔ وہ یا تو ان کنوؤں سے کام لیتے تھے، جن میں پانی کی مقدار زیادہ نہ تھی یا اونٹوں پر لاؤ کر پانی لاتے

تھے۔ غالباً وہ سال بھر میں تھوڑی سی مدت کے لیے کان کٹی کرتے تھے، لیکن دولت سعودیہ کی شرکت معدنیات کے انجینئروں نے کوئی پونتیس میل کے فاصلے پر مغربی جانب کی ایک دادی میں ایک مل کنواں لگایا اور وہاں سے نلوں کے ذریعہ پانی ”ہمد“ ذہب ”تک لے آئے۔ مرکز پر سے معدن کا پہلا نشان وہ پمپنگ ٹینکس ہیں، جو پائپ لائن کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے ارد گرد سبز باغیچے ہیں۔ پھر ”ہمد ذہب“ کی دو چوٹیاں نمودار ہوتی ہیں۔ ان سے آگے عرب کی بھر سر زمین میں سونا نکالنے کی مشینیں اور متعلقہ عمارتیں ہیں، جو دور حاضر کے نمونے کی ہیں۔ دادی کے دوسری جانب کان کے اندر کام کرنے والے آدمیوں کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی کھانے کا ہال، تفریحی مرکز اور حمان خانہ ہے۔

کان کا انتظامی مہلتیس آدمیوں پر مشتمل ہے اور وہ زیادہ تر امریکی ہیں۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ پیٹ بھر کر کھانے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور اپس میں یا زور و دول کے ساتھ منسی مذاق کرتے ہیں۔ کھانا ختم ہو جائے تو سب تفریحی مرکز میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ برج اور رنگ پرنگ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں باقی لوگ شام کی شکی میں باہر بیٹھ کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ عرب بھی جو وہاں کام پر لگے ہوئے ہیں۔ یا انجینئری کی تربیت حاصل کر رہے ہیں، تصویریں دیکھنے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ زور و دول کو زیادہ تر امریکی زندگی کے خاص مناظر سے دلچسپی ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز، موٹر کاریں، ٹرینیں، فلک بوس عمارتیں یا کھیتی باڑی کی مشینیں۔ ”ہمد ذہب“ سمندر کی سطح سے سو تا پین ہزار فٹ بلند ہے اور عیدہ کی ریلوے ہر ایک کے مقابلے میں یہاں کی ہوائی جہازیں خشک اور خشک ہے۔ عربوں کی نیند بے چنگ ہے۔

کے بعد میری دہ امر کی ناشتہ کھا کر سیاح کان کے دورے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اسے
 جو چیز بھی نظر میں زیادہ حیران کرتی ہے۔ وہ ہنزہ مند عرب ملازموں کا منقوشان شباب
 ہے۔ اگر کوئی مشین بگڑ جائے تو موقع بھی پر اس کی مرمت ہو جاتی چاہیے
 ورنہ اسے کان سے ساحل پر پہنچا کر امریکہ بھیجنا پڑے گا۔ چند نگران کار اور کارگریز مکینوں
 کو چھوڑ کر باقی زیادہ تر کارکن عرب جوان ہیں جن کی عمریں بارہ اور اٹھارہ سال کے
 درمیان ہوں گی۔ بعض نے کام ابھی شروع کیا ہے اور وہ سن رسیدہ عرب کارکنوں
 یا امریکیوں کے پاس کھڑے ہو کر سر کام سیکھتے رہتے ہیں۔ دوسرے عربوں نے
 مشینوں کا چھتہ سچ کام خود سنبھال لیا ہے۔ یہ مشینیں ڈیزل سے چلتی ہیں۔ ہر
 شفٹ د کام کی یاری یا دور کے ساتھ ایک امریکی ایجنٹ موقع پر موجود رہتا
 ہے اور دولت سعودیہ کے مین کارگریز معاہدے کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کی
 عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان ہوں گی۔ چھ سال پیشتر ان لوگوں نے اونٹ
 کی زمین کے سوا دور جدید کی کوئی چیز نہ دیکھی تھی۔

کان کے اندر اترنے کے لیے ایک پنجرے میں بیٹھنا پڑتا ہے جو تاریکی میں
 گزرتا ہوا اچھ سو فٹ نیچے چلا جاتا ہے۔ یہاں ہوا گرم اور مرطوب ملتی ہے۔ وہاں
 سے سیاح ان سرنگوں میں نکل جاتا ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں
 کار بائیڈ لمپوں کے سوا درشتی کی کوئی صورت نہیں۔ ان سرنگوں میں نہ جوان
 عرب توڑی ہوئی چٹانوں کے ٹکڑے ایک ایک ٹن بوجھ اٹھانے والی دستی گاڑیوں
 میں بھرتے نظر آتے ہیں۔ جب کان کمی کا آغاز ہوا تھا تو عرب مزدوروں کے
 بچے دن میں پانچ مرتبہ کام روکنا پڑتا تھا تاکہ وہ اوپر جا کر نماز ادا کر لیں۔ کان

کھانڈ کعبہ کی سمت ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ اب ہر سڑک میں کعبہ کی سمت کے نشان لگا دیئے گئے ہیں۔ اور کان کے اندر کام کرنے والے عرب سطح زمین سے ۳۰۰ — ۶۰۰ فٹ کی گہرائی میں نماز ادا کر لیتے ہیں۔

ایک گھنٹہ تاریکی نیز سوراخ کرنے والی مشینوں کے شور میں گزرا چکنے کے بعد سیاح پھر سطح پر آ جاتا ہے۔ پاس ہی وہ مشین لگی ہوئی ہے، جو بڑے بڑے ڈھیلوں کو کٹ کر چھوٹے چھوٹے سنگریزے بنا دیتی ہے۔ پھر اسے دوسری مشین میں پھنچا جاتا ہے جہاں سنگریزوں میں پانی ملا کر اچھیں خوب پیس دیا جاتا ہے۔ اور دھاتیں مٹی سے الگ کر لی جاتی ہیں۔ عام اندازہ یہ ہے کہ توڑے ہوئے ڈھیلوں سے پچیس فیصد سوٹا اور پچیس فی صد چاندی نکلتی ہے۔ باقی سب کچھ میل مقصد ہوتا ہے۔ سوٹے اور چاندی کو فولادی پیپوں میں بھر کر ”شائع ذہب“ کے راستے جدہ بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ چیزیں جہاز میں سوار کر کے نیو جرسی (ریاستہائے متحدہ امریکہ) پہنچا دی جاتی ہیں۔ وہیں دھاتیں دوبارہ صاف ہوتی ہیں۔

دولت سعودیہ میں قدیم و جدید کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر آپ کسی علاقے کے گورنر یا امیر سے ملنے کے لیے جائیں تو وہاں بھی آپ کو یہ فرق بدیہی طور پر نظر آئے گا۔ وہاں سب سے پہلے آپ کو یہی تہوہ پلایا جائے گا، جس میں الائچی ملی ہوئی ہے۔ عربی آداب کا تقاضا یہ ہے۔ کہ آپ نہ تو تین سے کم اور نہ تین سے زیادہ پیالیاں پیئیں۔ تین سے کم پیئیں گے تو سمجھا جائے گا کہ آپ کو تہوہ پسند نہیں آیا۔ زیادہ پیئیں گے تو میزبان کو خیال ہوگا کہ آپ بہت بھوکے پیاسے ہیں اور کھانا بھی کھانا چاہیے تھا۔ تہوہ پلانے والا آدمی عموماً معزز

ہوتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تھوڑے کا ربی برتن ہوتا ہے جس سے اتھالی چابک دستی کے ساتھ تھوڑے پینے کی بے دستہ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ڈالتا جاتا ہے۔ جب مہمانین پیالیاں پی چکتا ہے تو پیالی ہلا دیتا ہے۔ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مزید درکار نہیں۔ تھوڑے کا پہلا دور ہو چکتا ہے تو لذت مند دستانی چائے شیشے کی چھوٹی چھوٹی فنجانوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اور مہمان دو فنجان ضرور پیتا ہے۔

”مہند ذہب“ کا امیر جس مکان میں رہتا ہے۔ وہاں سے شمالی جانب دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی وادی ملتی ہے۔ یہاں بڑی بڑی چٹانیں عمودی شکل میں کھڑی ہیں۔ ان پر تصویریں اور نقش کش کندہ کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گھائی میں ذرا اوپر کی طرف چلے جائیں تو ایک درجن کے قریب آدمیوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، جنہوں نے تیر کمان پکڑ رکھے ہیں اور وہ لمبے سینکڑوں والے ہرنوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کھیلتے دکھائے گئے ہیں۔ چونکہ اسلام میں تصویر کشی منع تھی، اس لئے قیاس یہ ہے کہ یہ تصویریں اسلام سے پیشتر کے دور کی ہیں۔ عرب کے بہت سے سیاستوں نے جن میں چارلس ڈاؤڈی اور لیڈی بلنٹ بھی

Charles Doughty (i) ۱۸۴۳ء سے ۱۹۲۶ء) اٹھکستان کا مشہور سیاح

جس نے ۱۸۴۳ء میں شمالی عرب کا سفر کیا اور اپنی مشہور کتاب ”اریلیا ڈیزرٹ“ (ریگستانی

عرب) لکھی تھی (ii) Lady Blunt اس خاتون کا اصل نام این نوئل

(Anne Noel) تھا۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی شادی بلنٹ سے ہوئی، جو انگریزی زبان

کا شاعر تھا اور سفارتی خدمات انجام دیتا رہا۔ بلنٹ نے اس کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دیا

(باقی ماثیہ اگلے صفحہ پر)

شامل ہیں۔ شمالی و مغربی عرب کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کی تصویروں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مقامی پالیسی کے انصراف علی نے بتایا کہ اسی قریب تک وہ تمام جانور مجاز کے پہاڑوں میں پائے جاتے تھے، جن کی تصویریں چٹانوں پر بنی ہوئی ہیں، بلکہ میر شیر بھی ملتے تھے۔

”ہند ذہب“ کی سیاحت کے سلسلے میں پہاڑ کی شمالی جانب بھی دیکھ لینی چاہیے کان کی موجودہ جگہ سے قدرے مغرب میں کچھ سوراخ اور سرنگیں نظر آئیں گی۔ بیان لوگوں کی ہیں جنہوں نے پہلے پہل اس پہاڑ سے سونا نکالا تھا۔ بعض سرنگیں پہاڑ کے اندر ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ تک چلی گئی ہیں۔ جو پتھر نکالے جاتے تھے انھیں آگ کے ذریعے سے خوب گرم کر لیا جاتا۔ پھر پانی اور پڑالتے ہی وہ ترخ جاتے اس طرح بار بار کے عمل سے پتھر ٹپے ٹپے سنگہ بڑے بنا کر انھیں بڑی بڑی چکیوں میں پس لیا جاتا۔ بعض ایسے پتھر اب تک بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جذبہ پہنچ گئے۔ بلکہ مختلف لوگ انھیں امریکہ لے گئے اور ان سے اپنے باغوں کی سجاول کا کام لیا۔ رات کے وقت یہاں بجلی کی روشنی ہوتی ہے عرب آگ جلانے کے لیے اونٹ کی مینگنیاں استعمال کرتے ہیں۔ کھجور کھاتے ہیں اور اونٹ کا دودھ پیتے ہیں۔ دن میں جو کچھ پیش آتا ہے فی البدیہہ اس کے گیت بنا کر مزے سے گاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ ص ۵۶ اور عربی گھوڑوں کا ایک سٹڈ قائم کر لیا عیاں پوری تہ عرب متعدد سفر کے سبب کے حالات لیڈی بٹنٹ نے مرتب کیے۔ دو فوکل سلاؤں سے گہری سہرو کی مٹی چنانچہ مصر اور سلاؤں میں انہوں نے انگریزی پالیسی کی سخت مخالفت کی۔

تیسرا باب

خاندان سعود کا عروج

اگرچہ خاندان سعود نجد میں صدیوں سے مشہور چلا آتا تھا لیکن تاریخ عالم کے صفحات پر اس نے اٹھا رجویں مدی کے وسط میں جگہ پائی۔ اسی زمانے میں مسلم مصلح محمد بن عبدالوہاب بغداد میں تعلیم پا کر اپنے وطن لوٹا۔ تاکہ ہم مذہبوں کو ان طوطا طریقوں سے باز رکھے جو بت پرستی کے سے تھے۔ اسلام سے جڑے ہوئے تھے اور سب کو رسول اکرم صلعم کے ارشادات کا پابند بنادے شیخ موصوف کے نزدیک مسلمانوں پر جو مصیبتیں آئی تھیں وہ ان کی غلط روی ہی کا نتیجہ تھیں۔ سعودی خاندان مدت سے درعیہ میں حکمران تھا جو ریاض کے قریب واقع ہے۔ اس خاندان کا امیر محمد بن سعود شیخ کا ہم عقیدہ بن گیا اور دونوں نے ملے مصنف خاندان سعود کے پس منظر کے متعلق کیتھ ولیم کی کتاب ابن سعود کا مضمون

مل کر بددیول اور حضریوں میں خالص اسلام کی اشاعت شروع کی، جن کی مذہبی روح بے معنی رسوم پرستی میں گم ہو چکی تھی۔

امیر محمد بن سعود کی وفات کے بعد ان کا بیٹا عبدالعزیز فرمانروا بنا اور اس نے اپنا دائرہ اقتدار دمشق تک بڑھالیا۔ مبلغین کی ایک نئی جماعت تیار ہو گئی، جو دینی معاملات میں دنیوی اور سطحی نقطہ نگاہ کی خدمت کرتی تھی۔ یہی سطحی نقطہ نگاہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ امیر عبدالعزیز کے بعد امیر سعود وسند نشین ہوا اس نے ۱۸۳۳ء میں مکہ معظمہ فتح کر لیا اور متعدد قبیلے توڑ ڈالے، جن کی پرستش کعبہ کی طرح ہو رہی تھی۔

قسطنطنیہ کے ترک فرمانروا دہالی اثر و اقتدار کے اس پھیلاؤ پر بہت خفا ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا روحانی پیشوا سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حکمران مصر کو اپنی امداد پر آمادہ کر لیا، اس نے اپنے بیٹے کو فوج دے کر دہلیوں کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ بیٹا فوج لے کر منزل بہ منزل بڑھتا گیا۔ ۱۸۱۵ء میں اس نے سعودیوں کے دار الحکومت درعیہ پر قبضہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یوں سعودیوں کی قوت و رہیم برہم ہو گئی۔ انیسویں صدی کے بیشتر حصے

۱۸۱۵ء میں سکمران جس نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی حمایت میں قدم اٹھایا محمد بن سعود، عبدالعزیز بن سعود کو ایک شخص نے غلط قصب کی بنا پر مسجد میں شہید کر ڈالا تھا نجدی اقتدار عبدالعزیز کے بیٹے سعود کے عہد میں اوج کمال پر پہنچا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نجدیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ گویا نجد کے علاوہ حجاز اور شام بھی ان کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ مزید پیش قدمی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگر سعود کا انتقال ہو گیا۔ اس کو تالیخ نجد میں سعود اول اور سعود کبیر بھی کہتے ہیں ۱۸۱۵ء میں متعدد نے یہاں حالات ایسے انداز میں دیکھے ہیں، جن سے صحیح کیفیت باقیا اگلے صفحہ پر۔

میں وسطی عرب کی عمان اقتدار رشیدی خاندان کے ہاتھ میں رہی۔ جن کا دارالحکومت حائل تھا۔ محمد ابن رشید نے ترکوں کی سیادت قبول کر لی۔ وہ ۱۸۸۵ء میں ریاض پر قابض ہوا۔ سعودی خاندان کا امیر عبدالرحمن کویت میں جا بیٹھا، جو بیچ فارس کے شمالی و مغربی کنارے کی ایک ریاست ہے۔ وہاں اس نے حکمرانی کے تمام حقوق اپنے بڑے بیٹے عبدالعزیز کے حوالے کر دیے۔

عبدالعزیز نے عمر کے ابتدائی دس سال رشیدیوں کے سایہ اقتدار میں گزارے۔ مزید دس سال جلاوطنی کی حالت میں بسر کیے۔ یہ وقت زیادہ تر بیچ الحالی کے شمالی گوشے میں بسنے والے بدوؤں کے درمیان پورا ہوا۔ اس نے قیادت

رہا شبہ ۱۸۸۵ء واضح نہیں ہوئی۔ سعودیہ کے انتظامیہ کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ بن سعود امیر بنا۔ اسی عہد میں خاندان کے اندر کشمکش کا آغاز ہوا۔ جبرائیم کا خطیبوں کے اقتدار کی برادری کا باعث بنا۔ عبداللہ بن سعود کے عہد میں محمد علی پاشا نے مصر نے عثمانی سلطان کے خزان کے ماتحت اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو عرب بھیج دیا۔ امیر عبداللہ بن سعود سے جنگی راہ میں غلطیاں ہوئیں۔ ابراہیم پاشا نے ان غلطیوں سے پورا فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ ۱۸۸۸ء میں درعیہ پر باد ہو گیا، امیر عبداللہ نے مقتدیہ رڈ الہیے اسے گرفتار کر کے پہلے مصر پھر قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، جہاں اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

اس کے بعد آل سعود میں سے جو لوگ باقی بچے۔ انھوں نے اپنی اپنی حکومتوں کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ان میں سے پہلا قابل ذکر شخص ترک بن عبداللہ تھا۔ پھر فیصل بن ترکی نے قوت از میر نو فرامیہ کی اس کی وفات پر دوبارہ خوفناک خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اسی خانہ جنگی میں تہام کے رشیدی امیر پورے (باقی پر صفحہ ۸۰)

کی صلاحیت اپنے انور پیدا کر لی۔ وہ بڑا جوان مرد اور صبا فی اعتبار سے بہت قوی تھا۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ وطن کو رشید دیوں کے قبضے سے نکالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا کر رکھے گا۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں وہ متحدہ سے آدمیوں کے ہمراہ کویت سے روانہ ہوا۔ کچھ مدت نئے زنگر وٹ مہیا کرنے میں گزاری۔ پھر خفیفہ خفیفہ تختان ریاض کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اپنے تیس ہمارمیوں کو ایک جگہ گھمرا دیا۔ اور ناکبر کردی کہ اگر کل صبح تک تھا رہے پاس کوئی پیغام نہ پہنچے تو سمجھ لینا کہ ہم مارے گئے۔ اور تم تیزی سے واپس چلے جانا۔

یہ پیغام دے کر وہ آگے بڑھا۔ اپنے جانی محمد کو بیس آدمیوں کے ہمراہ ریاض کے قریب کھجور دوں کے ایک جھنڈ میں چھوڑا۔ شام ہو چکی تھی صرف اس آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا۔ کھجور کا ایک تنا شہر کی تفصیل کے ساتھ لگا کر وہ لوگ اوپر چڑھے۔ اور اندر کی طرف اتر گئے۔ پھر مختلف جھنڈوں پر سے گزرتے ہوئے رشیدی گوردہ کے مکان پر پہنچ گئے۔ اور اس میں جو لوگ موجود تھے انہیں یہ کہہ کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ اگر ذرا بھی آواز نکالو گے۔ تو ایک ہفتا میں کام تمام کر دیا جائے گا۔ گوردہ کی گھر سے کھجوریں اور تھوہرے کر

(دقیقہ ص ۱۲) متحدہ پر قابض ہو گئے۔

دعویہ برادر ہو چکا تھا۔ ترکی بن عبداللہ نے ریاض کو دار الحکومت بنایا جو اب تک چلا آتا ہے۔ فیصل کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا عبدالرحمن تھا جس نے نہایت نازک حالات میں ریاض کو مجبور کر کویت میں سکونت اختیار کر لی (مذہب حالات آگے چل کر بیان ہوں گے)

بھونک اور پیاس مٹائی اور باقی رات وہاں قرآن کی تلاوت میں گزار دی
 پر پھٹتے ہی ریاض کے قلعے کا دروازہ کھلا۔ عبدالعزیز اور اس کے ساتھی اپنی
 جگہ بیٹھے تھے جہاں سے دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ
 گورنر کے گھوڑے قلعے سے باہر لائے گئے ہیں۔ محفوطی دیر بعد خود گورنر نکلا۔
 اس کا طریقہ یہی تھا کہ رات قلعے میں گزارنا تھا۔ گورنر کے نکلتے ہی عبدالعزیز
 اور اس کے ساتھی بجلی کی تیزی سے گورنر پر حملہ آور ہوئے۔ اسے نیز اس
 کے چند محافظوں کو آنا آنا قتل کر ڈالا۔ محافظ فوج کے باقی لوگ قلعے
 کے اندر کی طرف بھاگے تاکہ دروازہ بند کر لیں۔ ابن سعود کے رفیق خاص
 عبداللہ بن جلوی نے دروازے پر پہنچ کر انہیں اتنی دیر ٹھہرائے رکھا کہ باقی ساتھی
 اطمینان سے اندر داخل ہو گئے۔ محفوطی و کیرشمکش جاری رہی۔ پھر تلخ نشین
 فوج نے مقتدار ڈال دیئے۔ سترہ سال کے بعد دوبارہ خاندان سعود کا ایک شہنشاہ
 ریاض کا مالک و مختار بن گیا۔ عبدالعزیز کی اس کامیابی نے ترکوں کو بھی قدم
 اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۰۷ء کے موسم بہار میں آٹھ ترک کیمپش ابن رشید

لیج پہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مصنف نے حالات ٹھیک بیان نہیں کیے۔ عبدالعزیز شہر
 کے درہنچتے ہی ایک ایسے شخص کے گھر چلا گیا جس کے تمام افراد اس سے بخوبی واقف تھے۔ ان سے
 گورنر کے متعلق حالات معلوم کر کے مکاؤں کی چھتوں سے گزرتا ہوا گورنر کے مکان تک پہنچا۔
 تھا۔ جہاں نوکر وں چاکروں کے علاوہ صرف دو مرد تھے جو وہاں تھے۔ ایک گورنر کی بیوی و بچے
 اس کی بہن۔ عبدالعزیز نے دونوں مردوں کو ایک کو ٹھٹھری میں بند کر دیا۔ دونوں بخوبی فہم
 اور عبدالعزیز کو خوب پہچانتے تھے۔ لیکن یہ اس وجہ سے بھی انہوں نے چپ رہا
 (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اور اس کی قبائلی فوج کے ساتھ شمالی مشرقی عرب کے ریگستان میں پہنچے۔ ابن سعود
 پیچھے ہٹ گیا۔ تبین جیسے ملک دونوں لشکراؤں کے سامنے پڑے رہے اور کوئی لڑائی نہ ہوئی
 پھر ابن رشید کے قبائلی لشکر کی واپس چلے گئے تاکہ اپنے رپڑوں کو موسم خزاں کی چراگاہوں
 میں پہنچا دیں۔ ترکوں کو بھی لوٹنا پڑا۔ سعودی رسائے نے ان کے لیے ہراس کا
 خاصا سامان پیدا کئے رکھا۔ خود عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ترکی فوج کے تلبا پر
 حملہ کیا۔ یہ بڑا خطرناک کام تھا، لیکن جو افرادی کے اس کارنامے نے جنگ کا پائنا
 پٹا دیا۔ ترکی ہمیشہ تلبا، سامان اور سونا پھونڈ کر بھاگ گئے۔ پھر ابن رشید
 نے انتقال کیا اور نوجوان عبدالعزیز وسطی عرب کا مالک و مختار بن گیا۔

اب اس نے جنگ سے اپنی توجہ عارضی طور پر ہٹا لی اور داخلی اصلاحات
 میں لگ گیا۔ پہلے خوان کی تحریک تنظیم کی۔ جہاں جہاں کوئی منگھستان یا پانی
 کا چشمہ تھا۔ عبدالعزیز نے وہاں نئے گاؤں کی بنیاد رکھ دی یا پہلی آبادی
 میں توسیع کر کے اسے زرعی مرکز بنا دیا۔ ہر مرکز پر ایک دیوبالی مبلغ مقرر کر دیا
 (فقید ص ۱۷) مناسب بھجوا ہو۔ واقعے کی اس پر پڑھو غلوں کی نظر نہیں گئی کہ نجد کا فرمانروا خاندان
 اگرچہ مدت ہوئی جلاوطن ہو چکا تھا لیکن خود اہل نجد اسے جھوٹے نہیں تھے اور اس کی خاطر ہر قسم کی
 قربانیوں پر آمادہ تھے۔ عبدالعزیز بن سعود کو اس حقیقت کا پورا علم ہو گا۔ اس لیے وہ بہت
 تھوڑے بھراہوں کے ساتھ بے باکانہ ریاض میں پہنچ گیا۔ بااثر، بھرپور کارنامہ اتنا
 عظیم القدر اور نام نہاد شہرہ آفاق کہ تلخ بیابان اس کی مثالیں بہت ہی
 کم ہوتی ہیں۔

جو اپنے چند معاونوں کی مدد سے اس مرکز کو ایک فوجی چھاونی کی حیثیت میں چلاتا تھا۔ یہی مرکز آبادی کے لیے اشیاء خورد و ذی پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس کے تمام باشندے ٹھیکہ اسلامی معائدہ اعمال کے پابند تھے۔ وہ اخوان یعنی بھائیوں کے لقب سے معروف تھے۔ ایک سو سے زیادہ ایسی نوآبادیاں قائم ہو گئیں اور بڑے اعلیٰ پیمانے پر ان کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح عبدالعزیز کو وفادار اور جاں نثار معاون مل گئے۔ جو ایک لحاظ سے ترکی مسلمانوں کے بیچر ہیں جیسے تھے، اس کا قمری نتیجہ نکلا۔ کہ وہ تباہی چھاپے ایک دم ختم ہو گئے جو صدیوں سے وسطی عرب کی قیامی زندگی کا خاتمہ چلے آ رہے تھے۔

”اخوان کی تنظیم سے عبدالعزیز کی حیثیت مستحکم ہو گئی تو اس نے ۱۹۱۳ء میں صوبہ ”الحسا“ پر قبضہ کر لیا، جو خلیج فارس کے ساحل پر عرب کا انتہائی مشرقی صوبہ ہے۔ چنانچہ وہ جبل طہلیق کے پاس کے ایک فوجی مرکز سے اٹھ کر مہوف کے محستان میں پہنچا اور پانچ روز کی مسافت ڈیڑھ دن میں طے کر لی۔ کھجور کے تنے نصیل کے ساتھ لگا کر فوج اندر داخل ہو گئی۔ ترک انصار و دان کے اہل و عیال قصبے کی مسجد جامع میں منتقل ہو گئے۔ انجام کار ترکوں نے حوالگی قبول کر لی اور ایک گولی چلائے بغیر مہوف سے نکل گئے۔ اس طرح عبدالعزیز کی حکومت کا دائرہ خلیج فارس تک پہنچ گیا۔ اگر ترکوں کو یہ احساس ہو تا کہ الحسا

لے چری یا نی چری (دنی فوج) ترکوں کی ایک نہایت زبردست اور بے پناہ فوج تھی جس کے حملے صدیوں تک بے پناہ رہے۔ وہ لوگ بڑے جواہر و جانا باز تھے لیکن انجام کار ان کا نظام بھی ٹکڑا گیا۔ سلطان محمود مصلح نے اس فوج کو تباہ کیا۔



میں تیس کے اسے ہمارے خیرے ہیں۔ جتنے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہیں، تو اس
 صوبے کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرتے۔
 سعودیوں کی حدیں خلیج فارس تک پہنچ جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ
 عظیم چھڑ جانے پر برطانیہ نے عبدالعزیز سے تعلقات پیدا کر لیے۔ اور اسے
 اپنے ساتھ ملا لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ سر پرسی کا کسٹ نے کپتان شیکسپیئر کو ریاض
 بھیج دیا۔ رشیدیوں اور سعودیوں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ جو ب کے مقام
 پر دونوں میں لڑائی ہوئی۔ شیکسپیئر بھی اس لڑائی میں موجود تھا۔ اتفاقاً
 ایک گولی اس کے آگلی۔ رشیدیوں نے خنجر مار کر اسے ختم کر دیا۔ شیکسپیئر کی
 موت سے برطانیہ کے تعلق کی اصل کڑی ٹوٹ گئی اور جزیرۃ العرب میں اتحادیوں
 کی جنگی ماسمی کا کام ناہرہ کے عرب بیورو کی تحویل میں چلا گیا۔ بیورو نے عبدالعزیز
 کے سب سے بڑے حریف شریف حسین کو ترکوں کے خلاف تحریک کا قائد بنا لیا۔
 امیر فیصل بن شریف حسین اور لارنس بحاریلوے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے
 ان کی سرگرمیوں سے انگریزی خواں عوام بخوبی آگاہ ہیں۔ عبدالعزیز دوران جنگ
 میں نسبتاً چپ چاپ بیٹھا رہا۔

یہ امر تعجب انگیز نہ ہونا چاہیے۔ کہ پہلی جنگ عظیم کے آخر تک وہیں عبدالعزیز
 ابن سعود اور حسین شاہ حجاز کے درمیان کشمکش بہت بڑھ گئی۔ حسین بڑا اوصاف
 Percy Cox (i) یہ شخص خلیج فارس میں برطانوی سیاست کا سب سے زیادہ اہم چہ
 جاتا تھا اور برطانیہ کے خزانے عراق میں تاراری تھی ماس میں سب سے بڑا پولیٹیکل انسر ہی تھا۔

اور خدی آدمی تھا۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں اس نے اپنے بیٹے امیر عبداللہ کی سرکردگی میں ایک مہم اس فرض سے بھیجی کہ خلیفہ خرمادوبائیوں سے چھین لے۔ اس مہم میں پانچ ہزار آدمی شریک تھے۔ ابن سعود کے مجاہدوں نے اس پر بخون مارا اور پانچ ہزار میں سے صرف ایک سو زندہ بچ کر نکل سکے۔ بچ نکلنے والوں میں سے ایک امیر عبداللہ بھی تھا۔ جو بعد ازاں اردن کا بادشاہ بن گیا۔ یہ خبر سننے ہی جلدہ میں سرانگی پھیل گئی۔ ہر شخص کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہابیوں کی مشق ہی سے پہلے ہی گھبراہٹ پھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلا جائے۔ لیکن ابن سعود نے پھر تدریج کی طرف پیش قدمی مناسب نہ سمجھا۔ اس کے مجاہدوں نے مغربی سرحد پر ابن کا سلسلہ مستحکم کر دیا تھا۔ اور قاہرہ کا عرب بیورو بھی اپنی تجاویز کے سلسلے میں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا ماسی موقع پر ابن سعود نے اپنے دوسرے بیٹے امیر فیصل کو لندن بھیجا۔ فیصل اس وقت صرف چودہ سال کا تھا لیکن کوریت کے نئے برطانوی نمائندے سینٹ جان قلبی نے بطور مشیر ایسے انتظامات کر دیے کہ فیصل بڑا اچھا اثر پیدا کر کے لوٹا۔

حیدر کھلم کھلا حملے میں ناکام ہوا۔ تو اس نے عسیر کے قبیلہ رول کو ابن سعود کے خلاف براہیجینہ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ حجاز کے جنوب میں ایک علاقہ تھا جسے عام طور پر آزاد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ کسی ذکی شکل میں نہیں اور حجاز کے علاوہ ترکوں کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتا رہتا۔ ابن سعود نے پانچ

ہزار کا ایک لشکر تیار کیا جو امیر فیصل کی سرکردگی میں ریاض سے چلا اور سات سو میل کا فاصلہ طے کر کے حنیس کے دار الحکومت آہا میں پہنچ گیا۔ یوں حنیس خربہ گیا۔ ۱۹۲۰ء میں شہیدیں کا زبردست لیڈر دارا گیا اور اس کا جتہا عبداللہ بن مقب بائین حواریہ بڑا ہی کامل اور مہر تھا۔ سب عورتیں دیکھ کر ان کو نہ رشیدی دار الحکومت خاکی پر چل کر دیا عبداللہ بن مقب با در بہت سے دوسرے شہید امراء کو اپنے ساتھ ریاض نے آیا، جہاں عبداللہ نے بڑے آرام و اطمینان سے زندگی گزاری۔ ۱۹۲۶ء میں اس نے انتقال کیا۔ اس طرح رشیدی بھی ختم ہو گئے۔ اہل حائل کے ساتھ حسن و سلوک نے ابن سعود کی دو بڑی خصوصیتیں بہت نمایاں کر دیں۔ اول یہ کہ وہ زبردست قوت و طاقت کا مالک ہے، دوسرے بڑا ہی رحم دل ہے اس نے اپنے آدمیوں کو سائل میں نہ صرف لوٹ مار سے باز رکھا، بلکہ اپنی فوج کے لیے جو چاؤ لایا تھا وہ سب وہاں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے۔ حائل کے تمام اکابر سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے لیے سزائے موت کا وقت آ گیا ہے، لیکن ابن سعود نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور سخریری تحفظ ایک ایک کے حوالے کر دیا۔ اس طرح اہل شہید اور قصبہ حائل کے باشندوں کے علاوہ شمر کے نصف قبیلے نے ابن سعود سے وابستگی پیدا کر لی۔ باقی نصف لوگ عراق چلے گئے۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں شریف حسین دہلی حجاز سے مہابک ندلی سرزد ہوئی یعنی اس نے خلیفہ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ ابن سعود نے اس اعلان کا مضحکہ اڑایا۔ اور اپنے ہاں کے جنگی لیڈروں اور عاملوں کا ایک بہت بڑا اجتماع

ریاض میں منعقد کیا۔ اس کا سن رسیدہ والد امیر عبدالرحمن اس اجتماع کا صدر تھا۔ اس اجتماع میں انھوں نے بڑی زبردست تقریریں کیں اور کہا کہ ہم حج کے لیے مکہ معظمہ جانا چاہتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے حسین کی خلافت قبول کر لی۔ ابن سعود نے ان حالات میں حج سے انھیں روک دیا۔ اور کہا کہ جاؤ پہلے حجاز کر سچے دین اسلام کے لیے فتح کرو۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ نہ بنو چاہیے لیکن ہاشمیوں کو نکال دینا چاہیے۔ نیز مقامات مقدسہ کو ہر اس رسم سے پاک کر دینا چاہیے جو خالص دین اسلام کے خلاف ہو۔ خود ما اور تہذیب کے سخت تنازع

لے یہ حالات خدا جانے مصنف نے کہاں سے لینے۔ صحیح واقعات یہ ہیں کہ اہل نجد پر دت سے حج کے دروازے بند تھے خصوصاً شریف حسین انھیں کسی بھی حالت میں حجاز آنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ انھوں نے اپنے فرمانروا سے مطالبہ کیا تھا کہ ہم اس پابندی کو مصالحت سے دور کر کے۔ تو قوت سے کام لے کر دور کریں گے۔ اس آئنا میں شریفی فوجوں نے دوبارہ تہذیب کے سخت تنازعوں پر حملہ کر دیا۔ اس جگہ خالد بن لوطی سالار لشکر تھا۔ اس نے حملہ اور دلوں کو شکست دے کر تعاقب کیا۔ اور طائف پہنچ گیا۔ ابن سعود کو اس وقت کش مکش شروع ہو جانے کی بھی اطلاع نہ تھی۔ طائف پر قبضے کے بعد اطلاع ملی، پھر معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ بھی خالی ہو چکا ہے لہذا خالد مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ خالد قبیلہ قریش میں سے تھا مگر شریف حسین کے اقربا رہیں مگر ہوتا تھا۔ وہ شریف سے ناراض ہو کر ابن سعود سے جاملتا تھا۔ اسے ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا۔ بالکل بعد میں انھوں نے سنی زندگی اختیار کر لی تھی یہی بہت سادگی سے دہتا تھا۔

سے وہابی شہر سوار اگست ۱۹۲۲ء میں نکلے۔ اور طائف کا رخ کر لیا، جو پہاڑیوں کے اندر ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ شاہ حسین بھاگ کر مکہ چلا گیا، اور اسے اپنے بیٹے علی کے حق میں دست برداری پر مجبور کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ہاشمی فوجیں مکہ معظمہ سے نکل گئیں۔ ان کے پیچھے دہابی فوجیں داخل ہو گئیں۔ لوٹ مار کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ وہابی مجاہدین ابن سعود کی سرکردگی میں احرام باندھے ہوئے مکہ معظمہ آئے۔ انہوں نے بہت سے قبے اور مقبرے توڑ دیے جو دہاں جا بجا تعمیر کر لیے گئے تھے۔

کچھ مدت بعد انگریز شریف حسین کو قبرص لے گئے۔ جہاں انہیں باطینان زندگی کے باقی دن گزارے۔ ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔ ابن سعود ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو جدہ میں داخل ہوا۔ اور تمام سفارت خانوں کو مطلع کر دیا کہ میں امن و انصاف لے کر آیا ہوں۔ ہاشمی اور رشیدی مسخر ہو گئے۔ اور عرب میں ایک ایسی سلطنت معرض وجود میں آگئی جس کی حدیں خلیج فارس سے بحیرہ قزویم تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جہان کے مذہبی اہلہ سیاسی لیڈر۔ مکہ معظمہ میں جمع ہوئے۔

لے یہ صحیح نہیں کہ ابن سعود مکہ میں داخل ہونے والی فوج کے ساتھ تھا۔ یہ فوج خالد بن علی کی سرکردگی میں مکہ پہنچی تھی اور اس کے تمام افراد نے بچے مسلمانوں کی طرح محرم کے احرام باندھ کر سر زمین حرم میں قدم رکھا تھا۔ ابن سعود خاصی مدت بعد مکہ منسلک پہنچا تھا، اسباب نجدی فوجیں آگے بڑھ کر جدہ میں ہاشمیوں کا محاصرہ کر چکی تھیں۔

اور فیصلہ کیلئے سلطان نجد قرآن اور سنت کے مطابق حکومت کرے۔ ہم اسے
شاہ حجاز تسلیم کرتے ہیں۔ ۸۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو مسجد الحرام میں ایک سادہ سی
تقریب قرار پائی اور اہل مکہ نے اپنے نئے بادشاہ کی بیعت کر لی۔ اپریل
۱۹۲۶ء میں شاہ ابن سعود نے مکہ معظمہ میں موثر اسلامی کے نئے دعوت دی
ستر سے زیادہ علمائے کرام اس موثر میں شریک ہوئے اور یہ اطلاع لے کر لوٹے
کہ عرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ آئندہ سال قریباً اڑھائی لاکھ
مسلمانوں نے فریضہ حج ادا کیا۔ شاہ ابن سعود نے کچھ دیر پہلے یہ عزم کیا تھا
کہ میں مکہ معظمہ کو غیر اسلامی رسوم سے پاک کر دوں گا۔ اور عازمین حج کے لیے
راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا دوں گا۔ یہ عزم بڑی حد تک پورا ہو گیا۔
اب برطانیہ نیز یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا
اس نے اپنے بیٹے امیر فیصل کو برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے دورے
پر بھیجا۔ اس سلسلے میں امیر موصوف نے شاہ جابر جرحیم کو اہلیتنا عکہ ہالینڈ
اور صدد بجمہوریہ فرانس سے بھی ملاقاتیں کیں۔

امیر فیصل کی واپسی سے تھوڑی دیر بعد انگریزوں اور وہابیوں کے
درمیان ایک نئے معاہدے کے لیے گفت و شنید ہوئی۔ یہ ابتداء میں ناکام
رہی تو شاہ ابن سعود گفتگو کو ختم کر کے ریاض واپس چلا گیا۔ وہاں علماء
اور قبائلی سرداروں نے اسے شاہ نجد منتخب کر لیا۔ انگریزوں کے ساتھ
دوبارہ گفت و شنید جاری ہوئی اور ستمبر ۱۹۲۶ء میں بدھام جدہ معاہدے
پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کے زور سے انگریزوں نے شاہ ابن سعود

کی تمام فتوحات کو تسلیم کر لیا۔ جو پہلی جنگ عظیم کے بعد مہرئی تھیں اور اسے ہر لحاظ سے آزاد و خود مختار مان لیا۔

۱۹۲۷ء کے موسم گرما میں انخوان غیظہ و غضب میں آگئے ماس لینے کہ عراق پر چھاپے مارنے سے روک دینے کو اپنے اوپر نا واجب پابندی سمجھتے تھے۔ اور انھوں نے چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ اس نازک صورت حال کو ختم کرنے کے لیے شاہ ابن سعود نے حجاز میں قبائلی نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں سب لوگ آئے، لیکن وہ انخوان لیڈر نہ آئے جو سرکش اختیار کر چکے تھے۔ اس طرح ابن سعود کو خود اپنی پیدا کی ہوئی جنگی مشینری سے لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ابن سعود نے کانفرنس میں بڑی خوش اسلوبی سے تمام معاملات طے کرائے۔ شرکائے کانفرنس سے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ لوگ ہربانی فرما کر غور کر لیں کہ آیا میں آپ پر حکمرانی کے لائق بھی ہوں کہ نہیں۔ اس کے جواب میں شرکاء نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ ہم آپ کے سوا کسی کو بادشاہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔

ابن سعود کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ اس نے جگہ جگہ لاسکی مرکز قائم کر لیے ہیں اور ان کے ذریعے سے خبریں آتی جاتی ہیں اور اس طریقے کی تصدیق کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کوئی چیز نہیں ملتی بادشاہ نے خود کھڑے ہو کر اس الزام کا جواب دیا۔ اُس نے کہا کہ قرآن یا حدیث میں ایک حرف بھی لاسکی یا ریڈیو کے خلاف موجود نہیں۔ اور انھوں میں ریڈیو پر قرآن کا ایک رکوع حاضرین کو سنوایا۔ ساتھ ہی کہا کہ جس چیز

کے ذریعے سے اس وقت لائے کا کلام پاک نشر ہوتا ہے، کیا اس میں کوئی برائی
ہر سکتی ہے؟ علماء نے بادشاہ کے اس فعل کی بھی تصدیق کر دی۔ آگے
چل کر موٹروں، بجلی کی روشنی، ڈینل بیپریں، ریلوں اور ہوائی جہازوں
کے لیے تصدیق حاصل کرنے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

پھر بادشاہ نے امن کی پالیسی کا فرانس کے رد برداروں کی۔ اخوان
کے سوا سب سے قبول کر لیا۔ اخوان سے تصفیے کی کئی کوششیں کی گئیں،
مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب سلطنت کے اتحاد کو قائم رکھنے کی اس کے سوا کوئی
صورت نہ تھی کہ توت سے کام لیا جاتا۔ ابن سعود نے ملک کے اندر کا پورا
پٹرول جمع کر لیا۔ اور موٹروں، جیپوں وغیرہ کا ایک بہت بڑا قافلہ لے
کر سلطنت کے مشرقی حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی
ہم تھی۔ اخوان پہلے کویت اور عراق کی طرف پسماندہ ہوئے۔ ۱۹۲۹ء
کو انھوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ ایک زبردست جنگ کے بعد بادشاہ کامیاب
ہوا۔ جو باغی عراق اور کویت بھاگ گئے تھے۔ انھیں گرفت و شنید
کے بعد سلامتی کے عہد کے ساتھ واپس لے لیا گیا۔ اس طرح شاہ ابن
سعود نے اپنی سلطنت کے سب سے بڑے خطرے پر قابو پا لیا۔

مغربی طاقتوں نے۔ اخوان کی بغاوت کا بڑے غور سے مطالعہ کرتی رہیں
اور ابن سعود کی کامیابی کے اعتراف میں انھوں نے تامل نہ کیا۔ ۱۹۲۹ء
میں فرانس نے اپنے قونصل خانے کو سفارت خانے کی شکل دے دی۔
فروری ۱۹۳۰ء میں برطانیہ نے سرانیک ریور پر ان کو اپنا پہلا وزیر مختار بنایا

اسلامی طاقتیں اپنے منارات خالصے مکہ معظمہ میں قائم کرنا چاہتی تھیں، لیکن ابن سعود نے کہا کہ غیر مسلم نمائندے مکہ نہیں جاسکتے، لہذا اجودہ ہی کو طبعی منطقی مرکز رکھنا چاہیے۔ ۱۹۳۲ء میں سلطنت کا نام سلطنت نجد و حجاز کے بجائے دولت سعودیہ عربیہ قرار پایا۔ مئی ۱۹۳۲ء میں اس نے اعلان کر دیا کہ میرا بیٹا امیر سعود ولی عہد ہے۔ ساتھ ہی اسے نجد کا نائب السلطنت بنادیا۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت سعودیہ کے غیر معمولی نظام کو سمجھ لینا نسبتاً سہل ہو جائے گا۔ اسلامی قانون کی بنیاد شریعت ہے جو قرآن حکیم سے تمام احکام لیتی ہے۔ علماء کی ایک جماعت جو مکہ اور ریاض میں رہتی ہے، شرعی احکام کی تعبیر و تفصیل قرآن مجید اور رسول اللہ صلیع علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں پیش کرتی ہے۔ مصر و شام نیز دوسرے بہت سے اسلامی ممالکوں میں شریعت کے بعض احکام نافذ نہیں، لیکن دولت سعودیہ میں شریعت ہی پر عمل ہوتا ہے۔

شاء ابن سعود نے حجاز کو فتح کیا تھا تو اسے احساس ہو گیا تھا کہ بڑا پرانا نظام وسطی عرب کے قبائل کو متحد رکھنے کے لیے زمانہ قدیم میں مرتب ہوا تھا، نہ اس خطے میں عسکرانی کے لیے ناکافی ہے جس میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں اس نے ایک نیا دستور مرتب کر لیا تھا۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، لیکن دولت سعودیہ میں ابھی تک یہی دستور نافذ ہے۔ کسی مرتبہ نئے دستور کا معاملہ سامنے آیا

لیکن اس وجہ سے اسے ملتی گردنا پڑا کر آبادی کے مختلف حصوں کے رسوم و عوائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ووٹ کا حق کسی کو حاصل نہیں تمام افسر بادشاہ اور اس کے وزیروں کے حکم سے مقرر ہوتے ہیں بعض افسر مختلف آبادیوں کے اکابر مقرر کرتے ہیں۔ سلطنت کے لیے تمام قواعد و ضوابط ریاض کی مرکزی حکومت کی جانب سے نافذ کیے جاتے ہیں یہ حکومت ایک قانون ساز مجلس کی مدد سے سب کام کرتی ہے۔ قانون ساز مجلس ابتدائی دور کے برطانوی دارالامرا سے ایک حد تک ملتی جلتی ہے۔ قبائلی اور مذہبی لیڈر اس کے رکن ہوتے ہیں۔ سرکاری مالیات، معاشی نشو و ارتقاء و عادات، قرضیں، ضوابط، معاملات حج اور سولی سروس اسی مجلس کے دائرہ اختیار میں ہیں۔

۱۹۵۳ء تک دولت سعودیہ میں مغربی ممالک جیسی مجلس وزراء کوئی نہ تھی۔ پھر ولی عہد کے لیے ایک کامیاب تجویز ہوئی جس میں صدر کے علاوہ وزیر خارجہ، وزیر مال اور مجلس قانون ساز کا صدر بھی شریک ہونے لگے اس کے دو حصے تھے، ایک دیوان یعنی نائب السلطنت اور اس کا عملہ، دوسرا صدارتی مجلس۔ وزارت خارجہ، وزارت داخلہ، وزارت مالیات، فوجی معاملات قانون ساز مجلس، عدالتیں اور مختلف صوبوں کی ادارتیں سب صدر کے ماتحت رکھی گئی تھیں۔

۱۹۶۵ء میں تمام غیر ملکی معاملات کا انتظام بادشاہ خود کرتا تھا۔ پھر ایک حکمہ نظامت امور خارجہ کے نام سے قائم ہوا جسے آئندہ سال وزارت

کا درجہ دے دیا گیا۔ اور امیر فیصل کو وزیر خارجہ بنایا گیا۔ اگرچہ تمام اہم معاملات بادشاہ سے استعصواب کیے بغیر انجام نہ پاتے تھے۔

تمام مالی معاملات کا انتظام ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۳ء تک شیخ عبداللہ بن سلمان وزیر مالیات کے ہاتھ میں رہا اور شیخ موصوف دولت سعودیہ کے نہایت زبردست افراد میں محسوب ہونے لگا۔ اس لیے کہ ہر وزارت مالی معاملات کے لیے وزیر مالیات ہی کی محتاج تھی شیخ عبداللہ کے لیے مختلف مشکلات پیش آتی رہیں جن میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اول یہ کہ اسے ملک کے بعض بہت بڑے تاجروں کے ساتھ گہرا تعلق تھا جو انتہائی تیزی سے دولت کے انبار جمع کر رہے تھے، دوسری مصیبت یہ تھی کہ جس ملک کا مالیہ انیس کروڑ ڈالر سے بھی اوپر تھا اس کا انتظام قدیم وضع کے ایک مالی بھٹانچے کی بنا پر کرنا بہت مشکل تھا۔ با اس ہمبر شیخ عبداللہ بڑی محنت سے کام کرتا رہا۔ وہ کئی مرتبہ امریکہ گیا۔ لیجے لیجے سفر کیے، بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن اس کا کام شاہ ابن سعود کی وفات سے بہت پہلے اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ اس کے بس کا نہ رہا تھا۔

اپریل ۱۹۵۶ء میں ترقیاتی منصوبوں کی وزارت قائم ہوئی۔ ان منصوبوں کے لیے ایک ڈائریکٹر جنرل (ناظم عمومی) مقرر ہوا۔ اس کے مختلف شعبے تھے مثلاً پٹرول اور معدنیات کا شعبہ، غیر ملکی کمپنیوں کا شعبہ، قانونی معاملات کا شعبہ، بری بحری اور فضائی مواصلات کا شعبہ۔ یہ وزارت سرایے کے لیے وزارت مالیات کی دست نگاہ تھی۔

۱۹۶۶ء تک وزیر مالیات دفاعی ایجنسی کا سربراہ تھا اور براہ راست بادشاہ کی نگرانی میں یہ کام انجام دے رہا تھا۔ اسی سال موسم خزاں میں ایک فرمان کے ذریعے سے ایک نئی وزارت قائم کی گئی جس کا نام وزارت دفاع تھا اور فرجی معاملات کی نظارت عمومی بھی اسی کے حوالے ہوئی۔ امیر مہمور کہ یہ وزارت سوئچی گئی اور ۱۹۵۱ء میں اپنی وفات تک امیر مہمور اس عہدے پر قائم رہا۔ اس وزارت کی ہیئت بہت بڑھ گئی اس لیے کہ دولت سعودیہ تلوار اور اونٹ کے دورِ حرب و ضرب کے نکل کر نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا ایک مشبہہ پرواز کے لیے وقف تھا۔ اس شعبے میں دولت سعودیہ کے جنگی ہوائی جہازوں کا انتظام، نیز ان بخارتی ہوائی جہازوں کا انتظام ہوتا تھا جو حکومت کی ملکیت میں تھے۔ پائلٹوں کی تعلیم و تربیت کے لیے طائف میں ایک درسگاہ قائم کر دی گئی تھی۔ اس درسگاہ کا انتظام برطانیہ کے ایک فضائی مشین کے حوالے تھا۔ ہوائی اڈوں میں کام کرنے والے لوگوں کی تعلیم و تربیت ظہران میں ہوتی تھی اور یہ انتظام امریکہ کی ہوائی فوج نے سنبھال رکھا تھا۔

دولت سعودیہ کے نظام حکومت کے تعلق میں یہ بنیادی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جبو کے باوجود اسم فیصل اب بھی بادشاہ ہی کرتا ہے۔ یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ دولت سعودیہ شاہ عبدالعزیز بن سعود کی تخلیق تھی۔ وہی حقیقتاً دولت سعودیہ تھا اور دولت سعودیہ محض اس کا ایک سایہ تھی۔ عبدالعزیز ابن سعود سے ملنے ہی فوراً احساس پیدا ہو جاتا تھا کہ ایک

ایسے شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔ جس میں خدا نے طبعی لیڈر کے تمام جوہر جمع کر دیے تھے۔ اس میں معاملہ فہمی کے ساتھ اخلاص اور مستحکم مزاج کے ساتھ سادگی اور بے تکلفی جمع تھی۔ اس لئے ملکی اور بیرونی معاملات کے متعلق جو معلومات جمع کر رکھی تھیں وہ باہر سے آنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی تھیں جو رنگ ریاض پہنچتے تھے، وہ مختلف دائروں کے باہر ہوتے تھے مثلاً کسی کراہیات میں درجہ شخصہ جس حاصل ہوتا، کسی کو حفظانِ محنت میں اور کوئی شخص حمل و نقل کے معاملات میں حد درجہ باہر ہوتا عبدالعزیز ان سب کے ایسے امتاز میں گفتگو کرتا جس سے ظاہر ہوتا کہ اسے ہر چیز کا سیرت انگیز حد تک صحیح اندازہ ہے۔ معاملات کے متعلق اس کا علم، دولت سعودیہ کے حدود سے باہر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پاس چار ترجمان غیر ملکی زبانوں کی نشریات سنتے اور بر وقت دنیا کی خبریں عربی میں ترجمہ کر کے سناتے اور ملک جنگ عظیم میں بعض اوقات حد درجہ نازک دور پیش آتے رہے۔ اس زمانے میں۔ نصف گھنٹہ کے بعد خبریں اس کے پاس پہنچائی جاتی تھیں، اگرچہ وہ ریاض سے باہر بھی ہوتا

دوسری جنگ عظیم کی مختلف مہموں کا مطالعہ وہ بڑی دلچسپی سے کرتا رہا۔ اس کے مترجموں میں سے ایک اس امر کا سرگرم حامی تھا کہ اتحادیوں کو بلقان میں سے یورپ پر حملہ کرنا چاہیئے۔ بادشاہ ہمیشہ کہتا کہ یورپ پر حملے کے لیے بہترین مقام نارمنڈی ہے اور اصل حملے سے بہت رت پیشتر اس نے ایک خاکہ بھی بنا دیا تھا۔ جب حملہ ہوا تو بڑی حد تک اسی خاکے

کے مطابق تدبیریں اختیار کی گئیں۔ بادشاہ اخبار شاہ بھی دیکھتا تھا، تمام اے تمام معاملات سے پوری آگاہی حاصل رہتی تھی اور یہ معاملات ادھر واشنگٹن ملنگ ہاؤس یا ماسکو کے اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ ادھر ریاض میں ان پر بحث شروع ہو جاتی تھی۔

مرحوم بادشاہ کے محرکات میں سب سے بڑی قوت اس کا گہرا مذہبی ایمان تھا، یعنی اللہ تعالیٰ سے قرب کا ایک احساس اور یہ عقیدہ کہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ ہادی و رہنما ہے۔ یہ ایمان اس کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا۔ اس طرح وہ ہر ایک وقت مذہبی اور سیاسی لیڈر بن گیا۔ وہ نماز، روزے اور حج کی پوری پابندی کرتا اور اپنی رعایا کی اہمیت کا فرض بڑی طمانیت اور سکون قلب سے سمجھاتا۔ اس کی ایک خوشی یہ تھی کہ محل میں ہر وقت ایک یاد و آدمی قبلہ آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہیں۔

بادشاہ کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ دہائیوں کا مسلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مقدسہ کی صحیح ترین تعبیر ہے۔ وہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں مکہ منظم میں داخل ہوا۔ تو ان تمام غلط رسموں کو ختم کر دیا جو وہاں جاری ہو چکی تھیں مثلاً مقبول یا نام نہاد مقدس مقامات کی زیارت کے لیے حاجیوں سے روپے وصول کرنا۔ وہ قرآنی تعلیمات کا پورا پابند تھا اور عدل، غریب و مساکین کے ساتھ حسن سلوک اور دوسرے معاملات میں اسلامی اصول ہی سے ہدایت حاصل کرتا تھا۔ قلب و بخشش کاری، غلو طعشل، مغربی رقص و عورتوں کی بے پردگی کا سخت مخالفت تھا۔

بادشاہ کو اپنے ملک کی ترقی کا بہت خیال تھا۔ ہر وہ چیز جو اس ترقی سے متعلق ہوتی، اس کی توجہات کا خاص مرکز تھی۔ مثلاً بڑے بڑے شہروں کے درمیان سڑکوں کا جال بچھا دینا۔ یا پانی کے برساتی الارض خزانے موجود ہیں ان سے بہتر طریقے پر کام لینا۔ خاصی مخالفت کے باوجود اس نے اصرار کیا کہ خلیج فارس سے دارالحکومت تک وہنا کے ریگستان میں سے ریل کی پٹری بچھائی جائے۔ یہ فاصلہ قریباً ساڑھے تین سو میل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ شمالی افریقہ میں ریل کی جو سڑک بنائی گئی ہے، وہ بھی ایسے ہی ایک نام میں سے گزری ہے اس نے نکتہ چینلوں کو یہ حقیقت بھی یاد دلانی کہ مغرب اور ریاض کے درمیان کوئی قابل ذکر قصبہ موجود نہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مغربی حصے کو دیکھو وہاں ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ شہر بن گئے، حالانکہ پہلے یہ موجود نہ تھے۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ نل کنوئیں لگائے جائیں تاکہ بدو و مان کھیتی باڑی شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ شہروں کی بنیاد رکھی جائے اس کا خیال تھا کہ اس طرح تدریجاً بدوؤں کو فائدہ پہنچے گا اور ریل میں آمد و رفت بڑھ جائے گی۔ یہ ریل مکمل ہو چکی ہے اور تاج کے مطالبے سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ اس پٹری کے بنوانے میں بالکل حق بجانب تھا اس لیے کہ جو سامان ریاض بھیجا جاتا تھا اس کے خرچ میں مندرجہ کی آگئی ہے۔

مرحوم ابن سعود ملکی معاملات، جس انداز میں طے کرتا تھا اس کے متعلق یہاں تین کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔

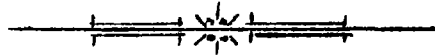
ایک عورت مقدمہ عدالت میں لائی کہ کھجور کے ایک درخت پر سے ایک کدو

میرے شوہر پر کہ بڑا اس وجہ سے میرے شوہر کی موت واقع ہوئی، لہذا مجھے بدلہ دلایا جائے۔ ابتدائی عدالت نے یہ اصرار دعوہ سے کہا کہ اس حادثے کے بدلے میں روپیہ لے۔ عدالت نے اصرار کیا کہ میں تو اپنے شوہر کی موت کے بدلے میں ملزم کی موت ہی کی طلبگار ہوں۔ یہ مقدمہ مختلف عدالتوں میں چکر لگاتا ہوا بادشاہ کے پاس پہنچا جو دولتِ سعودیہ کی سب سے بڑی عدالت عالیہ ہے۔ بادشاہ نے مقدمہ سن کر عورت سے کہا: بے شک قرآن مجید کے حکم کے مطابق تو ملزم کی موت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ملزم بھی اسی طرح مرے جس طرح تیرا شوہر مرا تھا۔ ہم اسے کھجور کے درخت کے نیچے باندھ کر بٹھا دیتے ہیں اور کسی کو اوپر سے اس پر گرانا چاہیے، یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ چونکہ تیرا اس معاملے سے خاص تعلق ہے، لہذا تجھے اوپر سے گرائے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ عورت نے چپ چاپ روپیہ لیا۔ اور چلی گئی۔

دوسری کہانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ نے چوری اور زہری کو کیوں کر روکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک یرود بادشاہ کے کیمپ میں آیا اور بتایا کہ قدر جنوب میں ریح الخالی کے بیرونی حصے میں ایک کنواں ہے جس پر بمبئی قبو سے کی ایک بوری بڑی ہے۔ میں اس کے متعلق اطلاع دینے کے لیے آیا ہوں۔ بادشاہ نے کہا شاہنشاہ جی اسے تین زیال دے دو۔ اس لیے کہ اس نے اطلاع ہم پہنچائی۔ ساتھ ہی مین تازیانے لگاؤ۔ بدو نے پوچھا بھلا یہ سزا مجھے کس لیے دی جا رہی ہے؟ جواب ملا: اس لیے کہ تو نے بتایا کہ بوری بمبئی قبو سے بھری ہوئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تو نے اسے کھولا حالانکہ میری

سلطنت میں کسی شخص کو اجازت نہیں کہ دوسرے کی ملکیت کو چھوئے۔
تیسری کہانی یہ یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب کسی معاملے میں اس سے اتفاقیہ
بے انصافی ہو جاتی تھی تو اس کی تلافی کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ جب اہل حم ایک
جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے تو بادشاہ کی ہر یکم کو ایک ٹکٹ مل جاتا تھا۔
جس کے مطابق وہ خود اس کے بچے، رشتہ دار اور ملازم ایک مستقل ہوائی جہاز
میں سفر کرنے کے حقدار بن جاتے تھے۔ ۱۹۴۹ء کے موسم بہار میں ایک ٹیم
کو ٹکٹ ملا جس میں ذکر تھا کہ وہ پندرہ لاکھ تین اور سامان کے ساتھ سفر
کر سکتی ہے۔ سامان عموماً بہت وزنی ہوتا ہے۔ خاتون لے مزید رشتے
داروں کے ساتھ لینے کی غرض سے پندرہ لاکھ تین بادل کپتیس بنادیا۔
ہوائی اڈے پر جو افسر تھا، اس نے اس ٹکٹ کے مطابق سفر کی اجازت
دینے سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اس طرح ہوائی جہاز میں وزن خطرناک
حد تک زیادہ ہو جائے گا، بیگم نے بادشاہ سے شکایت کی۔ اور اسے خوب
غصہ دلادیا۔ فوراً ایک ایئر کمانڈ کے ذریعے سے افسر کے نام حکم پہنچا کہ
جب تک میرے سپاہی گرفتاری کے لیے نہ آجائیں، اپنی جگہ سے مت ہلے۔
افسر کی خوش نصیبی تھی کہ اس موقع پر بادشاہ کا فرزند منصور بھی موجود تھا۔
وہ وزیر دفاع ہونے کی حیثیت میں محکمہ پر راز کا بھی نگہبان تھا۔ اس نے
پورا واقعہ سن لیا اور اس افسر کو مکہ منظم بھیج دیا۔ دوسرے دن پورے حالات
بادشاہ کے گوش گزار کر دیے گئے۔ اس نے منصور اور افسر کو معاف کر دیا اور
اپنی بیگم پر سخت خفا ہوا۔

جو شخص دولت سعودیہ میں کچھ دیر رہے وہ مرحوم بادشاہ کے متعلق ایسی
 کہانیاں ضرور سنے گا۔ جنہوں نے افسانوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے برواگ
 جدا کر بیٹھتے ہیں یا تاجر سودا خرمینے کے لیے جاتے ہیں۔ تو ایسی کہانیاں
 ایک دوسرے کو ملتے ہیں۔ شاہ ابن سعود اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے
 لیکن اس کے سوانح حیات اور کارنامے اس سرزمین کی روایات کا جزو
 بن چکے ہیں۔ جسے اس کی بدولت اتحاد و استحکام کی نعمت ملی۔ کہ فی عرب
 اپنے بیٹے اس سے بڑی یادگار تعمیر نہیں کر سکتا۔



چوتھا باب

شاہ سعود، آل سعود

آل سعود اور ان کے دارالحکومت کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرتا ہونے ضروری ہے کہ میلج جدہ سے ریاض تک اونٹ پر سفر کرتے۔ اگر وہ اکیس روز اس سفر میں بسر کرنے کے لیے تیار نہ ہو، معاہدہ ہی عرب کے مغربی حصوں کے متعلق بہتر تصور کا خواہاں ہو، جو ہوائی جہاز کے ذریعے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا، تو مناسب یہ ہوگا کہ وہ ایسے ٹک پر سفر کرے جس میں ریت پر چلنے کے لیے بڑے بڑے ٹائر لگے ہوں۔ آل سعود نے اپنی مملکت میں ایسا امن قائم کر رکھا ہے کہ اجنبی سیاح اندیشہ آزار کے بغیر پورے عرب میں سے گزر سکتا ہے یہ سفر دشوار اور تکلیف دہ ضرور ہوگا، مگر مناسب سامان ساتھ لے لینا چاہیے اور ایک دو سپاہی بھی ہمراہ ہوں۔ کہ قطعاً کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ ضروری سامان میں کھانے کی چیزوں کے ڈبے، جن میں پھول

کار میں بھی شامل ہونا چاہیے، موٹر کی درستگی کے اوزار، فالتو ٹائر، ٹائمرز کی مرمت کے سامان کا تحویل، پینے اور مرطوبی ڈالنے کا پانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انعام کے لئے ریال کی بھی خاصی مقدار رکھ لیئے چاہیے۔

عبرہ سے جو بڑی سڑک ریاض کو جاتی ہے۔ وہ حدودِ حرم میں سے گزرتی ہے۔ جس میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے، لہذا ایک دشوار گزار چکڑے کاٹنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ شرکت میں۔ نیاتِ سعودیہ کی سڑک اختیار کر لی جائے۔ ڈیڑھ سو میل کی مسافت طے کر چکنے کے بعد برکہ زبیدہ سے شرکت کی سڑک چھوڑ کر ایک میدان میں سے گزرتا پڑتا ہے۔ اگر زیادہ بارش ہو جائے تو اس حصے میں سیلاب آجاتا ہے۔ اگر موسم خشک ہو تو بیس میل کی مسافت طے کر چکنے کے بعد سیاح مکہ سے ریاض جانے والی شاہراہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جو شارعِ ملک کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں صرف ایک دقت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ مقدسے مقدسے فاصلے پر زمین کے ایسے ٹکڑے آجاتے ہیں جن میں ریت کے موٹے موٹے دھل چیلے جوتے ہیں۔ یہاں ہینچکر سیاح کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی سواری صحرائی علاقے میں چلنے کے قابل ہے یا نہیں۔

اس سڑک پر سب سے پہلا قابل ذکر مقام مویہ ہے، جہاں دولتِ سعودیہ نے اٹھارہ ہزار گیلن پٹرول کا ذخیرہ قائم کر رکھا ہے۔ پاس ہی موٹروں کی مرمت کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ نیز ریڈیو اور تار کا ایک مرکز بھی ہے۔ اس سے آگے برہیں تو یہ شاہراہ سڑک نہیں رہتی۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اونٹوں کے راستے کو ڈراہوڑا کر دیا گیا ہے۔ قریباً بیس میل تک ایک نامور راستے پر چکولے

گتے ہیں۔ آگے ایک خشک علاقہ آتا ہے۔ جہاں نہ بہرن ہیں اور نہ کوئی درخت، بلکہ صحرا کی روئیدگی بھی نہیں ملتی۔ کوئی ایک سو میل کا فاصلہ طے کر لیا جائے تو سیاح عقیقت نام کے گاؤں میں پہنچتا ہے، جہاں کوئی دروید آدمی آباد ہیں۔ یہ لوگ ساحلوں اور مسافروں کے ہاتھ اٹھ سے مرغیاں اور بھڑی فرخنت کد کے گزارا کرتے ہیں۔ یہاں اکثر موٹر سوار ٹھہر جاتے ہیں تاکہ پیٹرول اور کھانے پینے کی چیزیں لے لیں۔ آبادی سے باہر ٹھہرنا زیادہ مناسب ہے اور لوگ سڑک کے پاس ہی کھلے میدان میں مقیم ہو جاتے ہیں۔

خمید لگ جانے کو چند بردہ پانی یا خرداک کی طلب میں پہنچ جاتے ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد خشکی شروع ہو جاتی ہے۔ کوئلے یا صحرائی بھاڑیاں سنگا کر آگ کا بندوبست کر لیا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد آگ بجھا دی جاتی ہے اور مسافر کل اوڑھ کر ریت پر لیٹ جاتا ہے۔ رات کی ہوا خاردار بھاڑیوں اور گھاس میں سے مہر مہر کرتی ہوئی آتی ہے۔ سر پر عرب کی صاف فضا میں تارے جگمگ جگمگ کرتے ہیں، اور دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت سقف کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ صبح اٹھتے ہی یعنی قہوہ مل جاتا ہے اور عقیق کے پورے ابلے ہوئے اٹھائے پھلوں کے رس کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ اس مقام سے ایک سو پندرہ میل کی مسافت تک "شارح ملک" سموار میدانوں سے گزرتا ہے۔ پھر سیاح دو آدمی پہنچ جاتا ہے۔ یہاں دو نخل تان ہیں جن کے ارد گرد چھوٹی سنگلاخ پہاڑیاں ہیں۔ اس جگہ کوئی چار ہزار عرب آباد ہیں، جو کھجوروں اور سبز یوں کی کاشت کرتے ہیں۔ دولوں نخلستان کے درمیان

مٹی کی دیواروں کا قلعہ ہے جس میں پٹرول کی بھی خاصی مقدار موجود رہتی ہے اور لاسکلی کا ایک برج بھی موجود ہے۔

دو آدمی سے آگے بڑھیں تو نجد کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی علاقہ عرب کی وسطی سطح مرتفع اور اس کا قلب ہے۔ اپریل کے چھینے تک یہاں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ سن کے پہلے پہلے پھول اور صحرائی جھنگلی پودے وغیرہ چیزیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اپریل کے چھینے میں نجد کو دیکھنا جب اطراف کے سیاہ خیموں سے دھوئیں کی لہریں اٹھ رہی ہوں، اونٹ کا دودھ پینا، اور رگڑ میں بجلی کی لہریں دوڑا دینے والی خالص ہوائیں سانس لینا عربوں کے نزدیک زندگی کی اصل نعمتیں ہیں۔ اس ذخیرہ میدان میں چالیس میل طے کر چکنے کے بعد مرالی افق پر ایک نقطہ مامور دار ہوتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ پھیلتے پھیلتے تانبے کے رنگ کی ریت کی مٹی بن جاتا ہے۔ یہ نفود السمر ہے۔ ریت کی یہ مٹی سعودی دار الحکومت کو شمالی عرب کی ریت سے محفوظ رکھنے ہوئے ہے۔ بہت سے امریکیوں کا خیال ہے کہ دولت سعودیہ مسلسل لہریں لینے والی ریت کا ایک سمندر ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ شمالی جانب یقیناً ریت کی ایک جھیل ہے جسے ”نفود“ کہتے ہیں مشہور برطانوی سیاح ہنٹ نے بتایا تھا کہ اس کا رنگ ربوئینڈینی اور میگنیشیا سے ملتا جلتا ہے۔ جنوبی جانب ریح الثالی واقع ہے جو ریت کا ایک وسیع متواج سمندر ہے۔ ہواؤں کا سرخ شمال اور مغربی ہے۔ نفود کی ریت آہستہ آہستہ دولا سترل سے ریح الثالی کی طرف بڑھتی ہے۔ ایک نفود السمر کا راستہ جو ریاض کے مغرب میں واقع ہے وہ لڑنا کا راستہ جو ریاض اور شلیج فارس کے درمیان ریت کے ٹیلے بنانا چلا گیا ہے۔ جس

جگہ شامع مکی منفذ السمر کو عبور کرتے تھے۔ یہاں سے ایک زائر کا عرض پندرہ میل ہو گا۔ تاجے کے رنگ کے شاندار ٹیلیجن ہیں سے بعض پاسبان ہیں فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ سہل قریباً تیس فٹ کی زب سے جنوب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ ان میں بعض کی شکل ہلال کی سی ہے۔ اور ان کی پشت ہوا کی جانب رہتی ہے۔ مرمگ گراما میں یا بعد دو پہر یہاں سے گذرنا جو تو ریت میں گزرتے والے نائز مرثیہ میں لگا لینے چاہئیں۔ بہر حال بہتر یہی ہے کہ دوسری سواریوں کے نشان سے مہا کر چلا جائے اور دقتاً نیز رکھی جائے۔

”نفوذ السمر“ سے آگے بڑھیں تو پالیس میں پر مڑنا مقام آتا ہے۔ جو مکہ اور ریاض کے درمیان سب سے بڑی آبادی ہے۔ اس نصیب کے ارد گرد تفصیل نبی ہوئی ہے۔ ریڈیو کا انتظام ہے، پٹرول موجود رہتا ہے۔ نیز یہاں بہت سے باغات ہیں۔ اس کا موقع اور محل خاص طور پر اہم ہے۔ مغربی جانب نفوذ السمر کا۔ ایک زائر اپنے ٹیکو کے ساتھ نظر آتا ہے مشرقی جانب جبل طوبی کھڑا ہے اور پر جانے کا راستہ دھولان تنگ اور ناہموار ہے۔ اوپر پہنچ جانے کے بعد سڑک ریت کی دلدلیوں میں سے بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ بہت سے مسافر رات گزارنے کے لیے یہاں بھی ٹھہر جاتے ہیں۔ گویا سفر میں یہ ان کی دوسری منزل ہوتی ہے۔ کئی جنس سطح مرتفع کی ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ واضح رہے یہ مقام بحیرہ قلم سے تین تہزار فٹ اونچا ہے۔

اگلی صبح کو اٹھیں تو جزوی اور مشرقی رخ اختیار کیا جاتا ہے۔ تیس میل کا نامہ سطر کر چکنے کے بعد نصیب جیکبہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ایک پرانی عرب آبادی تھی۔ جو دیران ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں یہ نصیب از سر نو بنایا گیا۔ اس حصے میں دولت سعودیہ کی آبادی سب سے زیادہ گنتی ہے۔ سطح مرتفع میں جا بجا گاؤں، کنوئیں کے لہر لگے ہیں۔

کسیوں میں سبزیاں کھجور، بواگندم وغیرہ چیزیں خوب پیدا ہوتی ہیں جُبنیلہ کے ارد گرد
دودھ دودھ نیک یومیدان نظر آتا ہے۔ اسی میں سبز کھپیں نہیں۔ پھر کھجوروں کے جھنڈ آجاتے
ہیں یا دیواروں سے گھرے ہوئے باغ۔ سامنے مٹی کی اونچی دیواریں یہ بتاتی ہیں کہ
ریاض پہنچ گئے جو شخص ہوائی جہاز میں ریاض جائے، اس کا تجربہ میڈل میں جانے
والے سیاح سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دولت سعودیہ یا اراکلو کا ہوائی جہاز چار گھنٹے
میں ریاض پہنچا دیتا ہے۔ ہوائی جہاز پہلے جس میدان میں اتارتے تھے، وہ شہر سے
خاصی دور تھا۔ موجودہ اڈہ شہر سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ امریکی کمپنی
نے یہاں پتھر کی بہت سی عمارتیں بنادی ہیں۔ اور ہوائی جہازوں کو کئی دو پرواز گاہیں
میں گئی ہیں جن پر روشنی کا انتظام کر دیا گیا ہے تاکہ رات کے وقت بھی ہوائی جہاز
بے تکلف اتر سکے۔

مغربی ملکوں سے سیاح ریاض پہنچیں تو دولت سعودیہ کی محافظ فوج سلامتی
دیتی ہے۔ یہ عرب سبز رنگ کا لباس پہنتے ہیں جس کی وضع قطع یورپی ہوتی ہے۔
سروں پر مسرخ رنگ کا چوخاندہ رومال ہوتا ہے جسے عام طور پر مندریل کہا جاتا ہے
اس پر سیاہ لٹیم کا عقاب ہوتا ہے۔ کوئی بڑا سرکاری مہمان آنے والا ہو تو پتھری
کے لینے وزیر دربار آتا ہے۔ یہ سیاح کو ایک سفید خیمے میں لے جاتا ہے۔ جس میں اعلیٰ
درجے کے خفایین کچے رہتے ہیں اور ارد گرد کو کرسیاں پڑی ہوتی ہیں۔ کوئی پندرہ منٹ
تک بادشاہ کی صحت اور سفر کے متعلق بات چیت کے بعد میاںوں کو میڈل میں ہمار
کرا دیا جاتا ہے۔

ریاض کی دیواریں مٹی کی ہیں۔ ایک زلزلے میں اس کی تفصیل میں بچاؤ ہو گیا۔

اور ان کے علاوہ درمے تھے جمیع مسجد اور قلعہ بھی مٹی ہی کے ہیں جو آنے سے سننے واقع ہیں۔ قصبہ کی سب سے بڑی عمارت سفید رنگ کا شاہی محل ہے۔ جو مروجہ ابن سعود نے بنوایا تھا۔ اس کے کئی حصے ہیں۔ عورتوں کی چول اور ملازموں کی قیام گاہوں کے علاوہ اس میں بہت سے ہال، بار یا بی کسے ایوان، دفاتر اور دوسرے کمرے ہیں، شاہ سعود اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ اس کا اپنا نیا محل بھی قریب ہی واقع ہے۔

جو سیاح سرکاری مہمانوں کی حیثیت میں ریاض پہنچتے ہیں انہیں بذریعہ محل میں لے جاتے ہیں، جو ریاض سے آگے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر مغربی جانب کی وادی میں واقع ہے۔ اس میں دور درجہ کی مختلف چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔ محل کی کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے ہیں۔ ساز و سامان کی کوئی کمی نہیں۔ ملازم غسل کے لیے ہانی گرم کر دیتے ہیں۔ کھانا بڑا اچھا ملتا ہے۔ بادشاہ سے ملاقات کے لیے محل میں جانا پڑے تو تجربہ کار سیاحوں پر بھی اک گونہ اضطراب طاری ہو جاتا ہے۔ موٹر بجلی کے مرکز کے پاس سے گزرتی ہے، جو محلہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ پھر شہر میں سے ہنر کر جاتے ہیں۔ ڈرائیور کو مسلسل ہارن بجاتا پڑتا ہے۔ آواز سننے ہی لوگ اصرار دھر ہو جاتے ہیں۔ مکانات کی کھڑکیاں عموماً دوسری منزلوں سے شروع ہوتی ہیں اور کھڑکیوں میں رہے کی سلامیں لگی ہوتی ہیں۔ محل کے دروازے پر محافظ فرج سلامی دیتا ہے۔ اندرونی دروازے سے گزرتے ہی پتھر کے ایک تنگ زینے پر کھڑے ہونے ایک آراستہ بالا خانے میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں آداب دیار کی پیروی کرتے ہوئے عربی لباس پہنا جاتا ہے۔ یہ ہر چکنا ہے تو مہمانوں کو مجلس میں درجے کے مطابق بیٹھا دیتے ہیں۔ ہال ایک سو فٹ لمبا چالیس فٹ چوڑا اور میں فٹ

اوپنچا ہے۔ بھاری ستونوں کی ایک قطار وسط میں سے گزرتی ہے رنگ و عن سے
 ۱۔ میں سنگ مرمر کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ کی دیوار میں سلاح دار کھڑکیاں
 ہیں۔ دیواروں کے ساتھ صفوں سے لگے ہوئے ہیں۔ جن پر نہایت عمدہ دریافت پڑھا
 ہوا ہے۔ ہال کے دائیں گوشے میں جو سب سے بڑا صوفہ ہے اس پر شاہ سعود بن عبدالعزیز
 بیٹھتا ہے۔ اکاون سال کی عمر پہرے کا رنگ ہسپانیوں جیسا ہے۔ خط و خال ابھرے
 ہوئے۔ ناک کا بائیں اعر لول کی طرح بلند ہے۔ آنکھوں پر تلک سیاہ رنگ کے چٹھے۔
 بادشاہ جہانوں کا استقبال کھڑے ہو کر کرتا ہے۔ اگر گرجو شہی سے ہاتھ ملا کر دائیں جانب
 کے صفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ بیرونی لوگوں کے ساتھ رجحان کے ذریعے
 سے باتیں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ دولت کی غزرائی کے باوجود بادشاہ بہت سادہ لباس
 پہنتا ہے۔ ایک چٹخہ عموماً زیب بدن دیکھا گیا جو گھٹنوں تک لمبا ہوتا ہے۔ ظاہری
 وضع قطع کے اعتبار سے اسے شبِ ثوبانی کے سفید سونی گاؤں جیسا سمجھنا چاہیے۔
 اور سیاہ یا کھٹی رنگ کی عبا ہوتی ہے۔ جس کے کنارے سنہری کلاتوں لگائے جاتا
 ہے۔ سر پر سیاہ "قطرہ" اور اس پر سنہری کلاتوں کا عقاب۔ یہ عرب میں بادشاہی
 کا خاص نشان ہے۔ مرحوم ابن سعود سفید اور سرخ خانہ دار قطرہ پسند کرتے تھے۔
 موجودہ حکمران بھی وقتاً فوقتاً ایسے قطرے استعمال کرتا ہے۔ سود اپنے والد
 کے برابر کشیدہ قامت نہیں، پھر بھی قد چھ فٹ دو انچ سے کم نہ ہوگا۔ بینائی ذرا
 کمزور ہے۔

سعود جنوری ۱۹۰۲ء کو اسی شب میں پیدا ہوا تھا جس شب میں اس کے والد
 نے چند جانبازوں کے ساتھ ریاض فتح کیا تھا۔ اس سے بڑا ایک بھائی ترکی نام

تھا۔ جو ۱۹۱۶ء - ۱۹۱۹ء کے دہائی اخلو ستر میں انتقال کر گیا۔ تاہم سعود کی دلی مہم کی کا اعلان ۱۹۳۳ء تک نہ ہوا، اس لیے کہ عربوں کے نزدیک ولی مہدی اور جانشینی کا فیصلہ محض عمر میں اولیت کی بنا پر نہیں، بلکہ قیادت کی صلاحیت اور کردار کی موزونیت کی بنا پر ہونا چاہیے۔ مرحوم ابن سعود نہ نقطہ نگاہ سے اپنے فرزندوں کی صلاحیت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ ان کا تیسرا بیٹا محمد جو ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا تھا، بڑا فیاض جوان مرد اور بے پروائی کی حد تک مخلص تھا، لیکن یہ خصوصیتیں بڑی قبائلی سرمداری کے لیے تو موزوں تھیں۔ ایک بہت بڑے ملک کا نظم و نسق منبطلانے کے لیے تو اذن اور بالغ نظری و پختہ کاری کے جن اوصاف کی ضرورت تھی، وہ اس میں موجود نہ تھے۔ دوسرا بیٹا فیصل بڑا ہوشیار اور متعلم تھا، وزیر خارجہ کی حیثیت میں اسے بہت زیادہ وقت باہر صرف کرنا پڑا، اور مغربی دنیا میں ایسی مدت تک قیامت عربی مابینوں جیسی راسخ العقیدہ قوم میں ہر دلائل و برہان کے لیے موزوں نہ سمجھی جاسکتی تھی۔ ان دونوں کے برعکس سعود نہ تو بہت زیادہ مخلص تھا، اور نہ بہت زیادہ متین فہم۔ جسمانی وضع و ساخت میں وہ اپنے والد سے ایک حد تک ملتا تھا۔ مگر فکر و نظر کے لحاظ سے وہ ایسا مولوی حکمران تھا جس کے ساتھ برہمی اور حضری دونوں یکساں و فاداری پر آمادہ ہوں۔ وہ نہایت اچھا سوار اور نہایت عمدہ تیغ زن تھا، یمن کے ساتھ جنگ کی تربیت آئی تو سعودی فوج کے مشرقی محاذ کی کمان اسی کے سپرد تھی۔ اس موقع پر وہ نہ صرف بہادر اور قابل سالار ہی ثابت ہوا، بلکہ خوش نصیب بھی اس کے ہمراہ رہا۔ چونکہ وہ اپنے والد کی اولاد میں سب سے زیادہ متقی اور پابند شرع تھا، اس لیے ناز میں امامت خود کو کرنا اور قرآن مجید کی تلاوت

بھی اس کے لیے مسرت کا باعث ہوتی۔ اسلامی اداروں خصوصاً مسجدوں کی دستی اور بجالی کے لیے اس نے ہمیشہ گراں قدر امداد دی۔

امیر سعود کی فوت کا سب سے بڑا سرچشمہ یہ ہے کہ بدوی قبائل کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہیں۔ جوانی کے عالم میں وہ شکار کھیلنے کے لیے نکلتا تھا یا جنگ میں جاتا تھا تو قبائلی سرداروں میں اس نے بڑی ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی۔ والد نے قبائلی معاملات اسی کے سپرد کر دیئے تھے اور مختلف جہلوں کو جو مالی امداد ملتی تھی وہ بھی سعود ہی کے ذریعے سے تقسیم ہوتی تھی۔ انجام کار مرحوم ابن سعود نے اسے ولی عہد نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ پہلی مرتبہ پچیس سال کی عمر میں وطن سے باہر نکلا اور ایک طبیب سے آنکھوں کے متعلق مشورے کے لیے مصر گیا۔ ۱۹۳۵ء میں اس نے یورپ کے مختلف مکزول کا دورہ کیا۔ شاہ جارج پنجم کی سلطنت پر وہ دولت سعودیہ کے نمائندے کی حیثیت میں شامل ہوا اور شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کی تقریب میں بھی موجود تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اٹلی گیا، ۱۹۳۶ء میں عربوں کی اس کانفرنس میں شریک ہوا جو مصر میں منعقد کی گئی تھی۔

جنوری ۱۹۳۶ء میں وہ امریکہ جانے کے لیے ٹھہران سے ہوائی جہاز میں ہوا۔ اس موقع پر بڑی عظیم الشان تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔ موسم کی خرابی کے باعث امیر سعود کا ہوائی جہاز دو دن تک لنڈن میں رکا رہا۔ اس موقع پر گرینکلیش نام ایک ارمنی نے امیر کو صوف سے مقفل ملا تاہم کہیں اور تیل کی بین الاقوامی

حالت کے متعلق قسّم کی معلومات بہم پہنچاؤں۔ خود گل نیکیاں عراق پٹرولیم کمپنی میں پانچ فی صد حصول کا مالک تھا۔ واشنگٹن میں امیر سعود کا استقبال بڑے شاندار طریقے پر کیا گیا۔ امیر نے صدر ٹرومن کو ایک تلوار پیش کی جس کا میان سنہری تھا اور اس پر جواہرات لگے ہوئے تھے۔ صدر ٹرومن نے اس تحفے کے بدلے میں اپنی دستخطی تصویر پیش کی۔ سعودی سفارت خانے میں اخباروں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا اس موقع پر امیر سعود نے جو بیان دیا اس کا ایک حصہ ذیل میں درج ہے :

”ہمارے آپ کے ملکوں نے دنیا میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہمیں باہم قریب تر لے آیا ہے۔ میرا ملک اسلام کی ارض مقدس اور عربوں کی دینداری کا گہوارہ ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام آج نسل انسانی کے بہت بڑے حصے کا مذہب ہے۔ یہی سرزمین ہے جس کی طرف دنیا کے تمام حصول میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے دل اور ان کی نگاہیں دن میں پانچ وقت متوجہ ہوتی ہیں۔ یہی سرزمین ہے جس نے دنیا کی مختلف قوموں اور آبادیوں کو ایک بہت بڑی روحانی روشنی اور دنیا و عقبی میں نجات کی امید عطا کی ہے۔ دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ جمہوریت کی عملدار ہیں۔ یہ سرزمین صنعت و حرفت اور سائنس کی ترقیات کا مرکز ہے اور دنیا میں آزادی سے محبت رکھنے والے جتنے قلوب ہیں وہ رہنمائی اور فیضان کے لیے اسی ملک کی طرف دیکھتے ہیں۔“

امیر سعود نے اخباری نمائندوں سے اسی بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کی

جیسے وہ بددعویٰ اور دل کے مجھے میں بیٹھ کر کرنے کا عادی تھا۔ انھوں نے تمام سوالات کا جواب بڑی خوش اسلوبی سے دیا۔ امیر موصوف کو کوئی آدھ گھنٹے کے لیے سینٹ کے اجلاس میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ عین اسی موقع پر سینٹ کے ایک ممبر نے صدر جمہوریہ پر اس لیے شدید نکتہ چینی کی کہ انھیں فوجی مصارف کا اتنا زیادہ اختیار دے دیا گیا ہے۔ امیر موصوف صدر کے مت پر اس نکتہ چینی سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ میری گلیڈ کا سرکاری زرعی مرکز بھی اس نے دیکھا اور وہاں ان پھول کے پردوں سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا جو نسبتاً آشکاب آب و ہوا کے لیے تیار کئے گئے تھے۔ اسی طرح پھیڑوں کی اس قسم میں بھی بڑی گہری دلچسپی لی۔ جو غیر معمولی طور پر جفاکش ہوتی ہیں۔

امیر سعود نے واشنگٹن میں صدر جمہوریہ امریکہ سے بھی ایک گھنٹے تک مفصل گفتگو کی۔ ایک موقع پر امیر سے کہا گیا کہ نیویارک اتراڑڈا شہر سے کہ مشرق قریب کے تمام شہر بھی ملائیے جائیں تو ان کی آبادی اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی صرف ایک نلک بوس عمارت میں پانچ ہزار آدمی کام کر رہے ہیں۔ امیر سعود نے فوراً کہا کہ میرے والد کے محل میں بھی قریباً اتنے ہی کارکن موجود ہیں۔ نیویارک کو دیکھ کر امیر سعود نے کہا کہ میں پہلے سمجھتا تھا میرے بھائی اس شہر کا ذکر کرتے ہوئے مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا وہ حقیقت کا محض ایک حصہ تھا۔ سفارت خانہ دولت سعودیہ میں نہایت

Maryland. ۵ جمہوریہ امریکہ کی ایک ریاست جس کا مشہور

شہر بالٹی مور ہے۔

پرنسٹن اور ان کے پیٹریل میں چاول، خربا، بادام اور دوسرے
رکھ کر پیش کیے گئے۔

مسلے بھرے ہوئے تھے۔
امیر سعود نے ایک دن پرنسٹن یونیورسٹی دیکھنے میں صرف کیا جہاں
عربیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر طلب کے قریبی امیر موصوف کو مختلف حصے دکھائے۔
امیر یونیورسٹی کا عربی کتب خانہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ نیز اس بات پر
اسے سخت تعجب تھا کہ طلبہ کی اتنی بڑی تعداد عربی زبان اور مشرق وسطیٰ
کے مسائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہے۔ ایک دن امیر سعود نیکو رکھ کر
بنیاد کے ترخاؤں میں پہنچا، جہاں چالیس کھرب ڈالر کی سنہری سلاخیں پڑی
تھیں۔ ایک شخص نے امیر موصوف سے مخاطب ہو کر کہا: آپ کی دولت تیل
ہے اور وہ زمین کے اندر محفوظ ہے۔ ہماری دولت سونا ہے اور ہم اسے یہاں
رکھتے ہیں؟ امیر نے فوراً جواب دیا: اب ہم تیل نکال نکال کر آپ کو بھیج رہے
ہیں۔ اور آپ اپنا سونا نکال نکال کر ہمارے حوالے کر رہے ہیں۔ دعا کیجئے کہ
یہ لین دین ہم دونوں کے لیے خوشگوار کی کا باعث ہو۔

Philips K. Hitti مشہور لبنانی مسیحی عرب، جو پرنسٹن یونیورسٹی
میں پروفیسر ہیں اور جس نے تاریخ مغرب، تاریخ شام اور تاریخ لبنان جیسی تصانیف
کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل کی۔ پرنسٹن یونیورسٹی یو جی ریاست میں ہے۔
جو نویارک سے متصل ہے۔

امیر سوئے نے ایک سکس بس انجن اتوم متحہ کا دفتر بھی دیکھا اور فرمایا مسلمان ہر سال حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں مجھے یہ مقام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، جہاں دنیا بھر کے نمایندے جمہوری مقاصد کی حفاظت کے لیے ہر سال جمع ہوتے ہیں۔ عربی امریکی آئل کمپنی کے یہاں کی حیثیت میں امیر موصوف نے ریاستہائے متحہ کا دورہ کیا۔ وہ پیش ٹرک، ڈیٹ رائے اور شکاگو کے صنعتی مرکزوں کے علاوہ مکس اس ایئر رونا اور کیلے فرینیا بھی گیا، جہاں کی گرم و خشک ہوا اور اکثر ریگستانی زمین خود امیر موصوف کے ملک سے زیادہ ملتی جلتی تھی۔ اس دورے میں امیر نے بوڈروڈیم بھی دیکھا، جہاں پانی کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ اس سے بچل بھی حاصل کی جا رہی ہے۔ نہریں اور سرنگیں بھی بنی ہوئی ہیں جو کیلیفورنیا کے جنوبی حصے میں پانی پہنچاتی ہیں، حالانکہ فاصلہ دو سو چالیس میل سے کم نہیں۔ امیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: میں نے جو کچھ دیکھا اس میں سب کے زیادہ متاثر اس منصوبے سے ہوا۔ یہ واقعی امریکہ کی عظمت کا نشان ہے۔ کہ قدرت کے مسائل پر عوام کی بہبود کے لیے قابو پا لیا گیا۔ ایسے منصوبوں سے متعلق ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

-
- (i) Lake Success انجن اتوم متحہ کا مرکز جو نیواک کے نزدیکی ہے
(ii) Pittsburgh ریاست پنسلوینیا میں
(iii) Detroit ریاست میچوگن میں
(iv) Texas (v) Arizona جہاں فوڈ ٹرول کا کارخانہ ہے
(vi) California Boulder Dam جمہوریہ امریکہ کی ایک ریاست
Nevada ہے جو کیلیفورنیا کے مشرق میں واقع ہے۔ بوڈروڈیم یا بند بوڈروڈی ریاست میں ہے جو یہ انجینیری کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

اس دورے سے چھ سال بعد ۱۹۵۴ء کو امیر سعود تخت نشین ہوئے
 چھ سال کا یہ زمانہ دلی عہد کے لیے روز افزوں ذمہ داریوں کا زمانہ تھا۔ بیرونی دنیا
 سمجھ رہی تھی کہ امیر سعود اپنے باپ کے زیر سایہ فاسخ العالی کی زندگی بسر کر رہے
 ہیں اور خردان کے ذمے کی کام کاج نہیں تحقیقت یہ ہے کہ ولی عہد اپنے سن
 رسیدہ والد کی نگرانی میں آہستہ آہستہ حکمرانی کی زیادہ تر ذمہ داریاں
 سنبھالتا چلا جا رہا تھا۔ سالہا سال سے شاہی معاملات اور دور دور تک
 پھیلے ہوئے شاہی املاک کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ قبائلی معاملات بھی اسی
 کے حوالے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ تیل کی مراعات کے متعلق "اراکمہ"
 کے ساتھ گفت و شنید بھی اس کے ذمے لگا دی گئی۔ امریکی سفیر کے ساتھ
 سیاسی تعلقات کا معاملہ بھی اسی کو سونپ دیا گیا۔ سب سے آخر میں ظہران
 کے ہوائی اڈے کا معاملہ تھا۔ اس بارے میں جو مسائل پیدا ہوئے، امریکی کمانڈر
 کے ساتھ امیر سعود ہی بات چیت کرتا۔ امیر فیصل بدستور وزیر خارجہ تھا،
 لیکن امیر سعود کو بھی معاملات خارجہ کے بعض پہلوؤں میں حصہ لینا پڑتا۔
 مثلاً دولت سعودیہ اور خلیج فارس کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے
 ساتھ سرحدوں کے متعلق اختلافات تھے۔ یہ ریاستیں برطانیہ کے زیر حمایت
 تھیں۔ اس وجہ سے اختلافات کے متعلق برطانوی نمائندوں ہی سے گفتگو
 کرنا پڑتی۔ بہت اذواہیں اٹریں کہ امیر سعود اس سلطنت کو متحد نہ رکھ سکے
 گا۔ اس کے والد نے پیدا کی تھی، اور اسے اپنے بھائیوں پر بھی پورا قابض
 نہیں، لیکن ولی عہد نے انتظام مملکت میں ایسی صلاحیتوں کی نمائش کی کہ

بھائیوں کے پیسے بھی اس کی سرکاری تبدیل کر لینے میں تامل کی کوئی وجہ نہ رہی اس سلسلے میں پہلا مظاہرہ امیر فیصل نے کیا۔ ۱۹۵۸ء میں امیر فیصل انجمن انوار مستند کے اجلاس سے واپس آیا تو امیر سعود نے ریاض کے ہوائی اڈے پر اس کا استقبال کیا۔ دونوں بھائی کھلی موٹر میں سوار ہوئے۔ امیر سعود موٹر کی کچھ پی نشست پر بیٹھا تھا، امیر فیصل بھائی کے قدموں میں موٹر کے فرش پر بیٹھ گیا۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ محض نمائش ہی نمائش ہے لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ حقیقت یہی تھی اور مرسوم بادشاہ نے امیر سعود کو ولی عہد بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا، بالکل درست تھا۔

۱۹۵۸ء کے وسط میں شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی صحت میں نمایاں خرابی شروع ہوئی اسے پہلے رات، کے وقت کام چھوڑ دینا پڑا۔ پھر دن میں بھی سرکاری معاملات پر توجہ کے اوقات پہلے سے کم کر دیئے گئے۔ صرف صبح کے وقت چند گھنٹے وہ ضروری کام دیکھ لیتا تھا۔ حکومت کا مارا بھرا ہستہ آہستہ آہستہ امیر سعود کے کندھوں پر آ پڑا۔ ستمبر ۱۹۵۲ء میں ملک عبدالعزیز بن سعود طائف میں تھا، جب اس پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس وقت تک امیر سعود حکمرانی کے تمام معاملات سنبھال چکا تھا۔ والد کے انتقال تک امیر وصوف دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ سلطنت کے سپہ سالار اعظم اور وزیر اعظم کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ ۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو وزارت بنادی گئی، جو اس کے دوبرو جواب دہ تھی۔ یہ دراصل ۱۹۳۲ء کے ایک شاہی فرمان پر عمل پیرائی کا پہلا قدم تھا۔ ستمبر میں ملک عبدالعزیز کی صحت یمن روزہ کے

بعد بھل گئی لیکن یہ واضح ہو چکا تھا کہ انجام زیادہ دور نہیں۔ بادشاہ ستر پھر
 میں سوار ہو کر طائف سے ریاض جانے پر راضی نہ ہوا۔ ۸۔ نو مبر کو اس کی صحت
 پھر بگڑ گئی۔ دولت سعودیہ کے تمام ہوائی جہازوں کی پرواز روک دی گئی اس
 لئے کہ سارے ہوائی جہاز شاہی خاندان کے مختلف افراد کو طائف پہنچانے کی
 فرض سے فراہم کر لئے گئے۔ بلکہ جو افراد ملک سے باہر تھے انہیں واپس لانے
 کے لیے غیر ملکی جہاز کرائے پر لے لئے گئے۔ تھوڑی دیر تک یہ خیال رہا کہ
 بادشاہ کا فولادی ڈھانچہ اس مشکل سے بھی بچر و عافیت گذر جائے گا، لیکن
 تہتر سال کی عمر تھی جو پوری کی پوری انتہائی جھنجھٹاؤ میں گزری تھی، اور گیارہ
 پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ ۹۔ نو مبر کی صبح کو چھ بجے کے قریب شاہ عبدالعزیز
 بن سعود جو ارجست میں پہنچ گئے۔ ایک گھنٹہ بعد مرحوم کے تمام فرزند طائف کے
 محل میں جمع ہوئے۔ انہوں نے امیر سعود کے ساتھ حلف و فدا داری کی تجدید کی
 اور امیر فیصل کو نیا ولی مہدین لیا گیا۔

دوسرے روز مرحوم بادشاہ کی میت ہوائی جہاز کے ذریعے سے ریاض
 پہنچا دی گئی اور اسے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ پانچ روز تک سرکاری
 حیثیت میں سوگ منایا گیا۔ بازار بند رہے۔ پرچم سرنگوں رکھے گئے۔ لوگ
 بلند آواز سے بات نہیں کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات معمول پر
 آ گئے۔

ملک عبدالعزیز کی وفات کے تھوڑے دیر بعد نئے بادشاہ نے ریڈیو پر
 تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میں والد کے نقش قدم پر چلوں گا۔ ان تمام لوگوں

کی حمایت کروں گا۔ جو مرحوم کے حامی تھے۔ زیادہ تر افسر اپنے عہدوں پر بحال رہیں گے۔ اور دولت سعودیہ کی خارجہ پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہوگی۔ تقریباً
کا ایک حصہ یہ تھا۔

میں ملک کے نظم نسق اور دوسرے معاملات میں مذہبی احکام پر چلتا رہوں گا۔
خدا نے قادر و توانا کی امداد حاصل کرنا میرا نصب العین ہو گا۔ میں عہد کرتا
ہوں کہ خدا کے کلام پاک اور رسول اکرم صلیم کے ارشادات کا پابند رہوں
گا۔ میری تمنا اور میری زبان ان احکام کے نفاذ کے لیے ذلت
رہے گی اور میں اپنی محبوب رعایا کو مطمئن اور خوشحال رکھنے کے لیے
کوئی دقیقہ سنی اعطاء نہ رکھوں گا۔ میں ملک کی سیاسی، معاشی اور مجلسی
ترقی کے لیے کام کرتا رہوں گا۔ ملک کے مفاد کا نگہبان رہوں گا۔ عوام
کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ ان حقوق کی راہ میں جتنی مشکلات پیش
آئیں گی، ان پر قابو پاؤں گا۔ جو مظاہر، خلافت اخلاق اور شرمناک
ہو گا اس کا قلع قمع کر ڈالوں گا۔ اپنی فوجی اور قومی قوتوں پر میری
توجہ خاص طور پر مبذول رہے گی۔ تمام اسلامی اور عرب ممالک کے
ساتھ اسلامی اور عربی برادری کے رشتے زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دوں گا۔
ان غیر ممالک کے ساتھ میری دوستی برابر جاری رہے گی، جو مرحوم
بادشاہ کی مشفقانہ توجہات سے مستفید ہوتے رہے۔ میری کوشش
ہو گی کہ امن و عافیت کے سلسلے میں میرا ملک اپنا اصل مقام
حاصل کرے۔

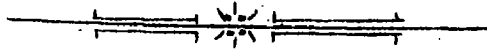
نئے بادشاہ نے تمام قیدی رہا کر دیئے۔ غیر ملکبیل پر جو پانچ دہائیوں منور تھا عائد کی گئی تھیں، وہ اتحادی ملیں۔ تخت نشینی کے بعد بادشاہ کا زیادہ وقت حیدر میں گزارا، جہاں اس نے غیر ملکی سفیروں اور کاروباری آدمیوں سے ملاقاتیں کیں مکہ معظمہ میں وہ علماء کرام سے بات چیت کرتا رہا، لیکن اس کی اصل سکونت ریاض ہی میں ہے، جہاں اس کے رشتہ دار، دوست یا دوسرے ملکوں کے حکمران آکر ملاقاتیں کرتے ہیں۔

مرحوم بادشاہ کی دانشمندی و دوراندیشی ہی کی برکت تھی کہ دولت سعودیہ کا موجودہ حکمران اپنے منصب کے تمام وظیفوں کے بارے میں پوری تربیت پا چکا ہے۔ سیاسی سمندر ساکن ہو کر وہ گہرائیوں میں بھی تیرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ابھی دیکھنا ہے کہ آیا وہ طوفانی سمندر میں بھی اسی طرح تیر سکتا ہے؟

مرحوم بادشاہ کے عہد حکومت کا آغاز ہوا تھا۔ تو جزیرہ نمائے عرب خاد برکشش قبائل کے ایک ایسے وفاق کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جیسا برنجی دور کے آخر میں ہو گا۔ اس وفاق میں متحارب دیہات اور آزاد شہری ریاستیں بھی شامل تھیں، لیکن ایک نسل کے باہر اندر اتنا زبردست انقلاب آیا کہ اس وفاق نے ایک متحدہ وفاق کی شکل اختیار کر لی۔ جسے سرسری طور پر انگلستان کے ولیم فاتح کی سلطنت کے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آیا تیس سال میں سیاسی ترقی دستوری بادشاہی

کی سمت میں ہوگی، یا رب کچھ ذرہم برہم ہو کر قدیم زمانے کی قبائلی حکومت
 عود کر آئے؟ مستقبل کی بھلیہ شاہ سعود کے ہاتھ میں ہے یہ



پانچواں باب:

الخارج کے زرعی فارم

الخارج بحیرہ قلزم کی جانب سے کم و بیش پانچ سو میل مشرق میں اور ساحل نقطہ کی جانب سے کوئی پورے تین سو میل مغرب میں ہے۔ وہاں مسطحی صحرائی کی ماہرین زراعت نے، جو دولت سعودیہ کے اکھڑ اور آن پڑھ قبائلیوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، صحرا کو گلزار بنا دیا ہے۔ یہاں کے زرعی فارم دولت سعودیہ کی جدید زرعی ترقیات کا پہلا سنگ میل ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ایسے منصوبے کے ماتحت شروع ہوا ہے جس کے مکمل ہو جانے پر دولت سعودیہ کی زرعی پیداوار چار گنا ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں حدود و جہ ضروری امر یہ ہے کہ وسط عرب کے وسائل آب

لہذا اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ اس کے علاوہ ذخیرے موجود ہیں جیل کوہی میں نقطہ "کیتھ" ہے، اسے ساحل کا نام "ساحل نقطہ" ہے، اس کی کوسٹ OIL COAST یعنی تیل و ملا ساحل ہو گیا۔

کا ایک سرسری نقشہ پیش نظر رکھ لیا جائے۔ یہاں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ واقع ہے، جن میں سے بعض چار ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اس سلسلے کو جبل طوبق کہتے ہیں، جہاں سالانہ چار پانچ اینچ بارش ہو جاتی ہے۔ طوبق کے مشرقی دامن میں پانی زمین کے اندر جذب ہو کر پچاس فٹ سے آٹھ سو فٹ کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ مہنوف دولت سعودیہ کا سب سے بڑا تختہ ان ہے۔ یہاں پانی کوئی چالیس چشموں کی شکل میں سطح پر آگیا ہے۔ ان میں سے صرف ایک چشمہ بائیس ہزار گالین پانی فی منٹ ہم پہنچاتا ہے۔ پھر یہ پانی خلیج فارس تک پہنچ گیا ہے اور متعدد چشموں کی شکل میں سمندر کے اندر جا بجا پھوٹ نکلا ہے۔ بحرین کے موتی نکالنے والے غوطہ خوروں کا سالہا سال سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت غوطہ لگا کر سمندر کی تریں پہنچ جاتے ہیں اور میٹھے پانی کے چشموں سے پانی بھر لیتے ہیں۔

الخروج میں پانی نے سطح زمین کے اندر ہی اندر چلنے کی چٹانوں کو تحلیل کر دیا اور جا بجا ایسے گڑھے یا کنڈ پیدا ہو گئے جنہیں پانی کے قدرتی کنوئیں قرار دینا چاہیے۔ ان میں سے دو کنوئیں یعنی عین بح اور ایک اور چشمے کا قطر کم و بیش تین سو فٹ ہے۔ اور یہ چار سو بیس فٹ گہرے ہیں۔ دونوں میں پانی کی سطح کوئی تیس فٹ زمین کے نیچے ہے۔ جب پمپ جاری ہوں تو سطح نیچے چلی جاتی ہے اور زمین کے اندر دونوں کے درمیان تعلق ہے۔ زمانہ گذشتہ میں یہاں اوتھوں کے فریج سے پانی نکالا جاتا تھا۔ اور اس عہد کے نشان اب تک باقی ہیں۔ اسس پاس آبادیوں کے نشان بھی ہیں، جو مدت ہوئی مٹ چکی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ مرحوم شاہ ابن سعود کے ظہور سے پیشتر عربوں کی قبائلی خانہ جنگی کے دور میں ان قدر قی کنوئل سے استفادے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء میں شیخ عبداللہ سلیمان نے سب سے کنوئیں پر پیپ لگانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی نہر کے راستے پاس کی زرخیز زمین تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عراق کا ایک انجینئر اس سارے انتظام کا مددگار تھا۔ چونکہ مشینری زیادہ اچھی نہ تھی، اس لیے نتائج محدود رہے۔

جب وسط عرب میں زیادہ غذائی اجناس کی ضرورت پڑی تو ۱۹۵۲ء میں مرحوم بادشاہ نے جمہوریہ امریکہ کے صدر روز ویلٹ سے امداد کے لیے اپیل کی۔ اس نے قوری ضروریات کے سرٹیفکیٹ سے ایک رقم کا انتظام کر دیا۔ اور کارل فوہل کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا جس میں محکمہ زراعت اور محکمہ داخلہ کے آدمی بھی شریک تھے۔ اس وفد نے وسط عرب میں گیارہ ہزار میل کا سفر کر کے ایک رپورٹ تیار کی، جسے بعد کے زیادہ تر فلاحی منصوبوں کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ پھر ایک زرعی فارم کے لیے ”الاکو“ نے بہتر زمین کا انتظام کر دیا جو اخراج میں ایک چغٹے کے کنارے پر لگائے گئے۔ وہاں سے پندرہ کلومیٹر قریباً دس میل اگے فاصلے پر آٹھ ہزار ایکڑ کا ایک ہموار قطعہ زمین موجود تھا اس تک سینٹ کی نہر بنادی گئی۔ اس زرعی فارم کی ترقی کی رفتار بڑی سست تھی اور پیداوار اتنی محدود تھی کہ وسط عرب کے لیے گندم، چاول، سبزیاں اور چارہ زیادہ تر باہر سے منگوانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں پہلے سے غذائی سامان عرب نے میں مشکلات پیش آئیں تو خطرہ پیدا ہو گیا۔ کہ انہیں

انجینئر رہتے تھے۔ پھر ریت کے نو دسے ہر لحظہ متحرک رہتے اور آبادی کی بڑش
یا تو مخالفانہ تھی یا کم از کم بے پروا یا نہ ضرور تھی۔ درجہ حرارت سلیے میں ۱۲۵
تھا۔ یڈیو کے سوا بیرونی دنیا سے اور کوئی تعلق نہ تھا۔ ان تمام مشکلات کے
باوجود لاجوس نے حوصلے اور حسن تدبیر سے کام لے کر منصوبے پر عمل پیرا کی مسلسل
جاری رکھا۔ ۱۹۶۵ء میں کام شروع ہوا۔ تیرہ سو مزدور یاد خواہ نے جہاں کر دیئے
ساتھ دلبے سے میل تھے جنھیں دو میں مرد و مرد کہ چلایا جاتا۔ اور چند ٹریکٹر
تھے۔ آہداری کی نہریں وسیع کر دی گئیں اور کنوؤں کا پانی پراسی زمین
میں پہنچنے لگا۔

فصل بوئی جا چکی تھی کہ جبل طلیق کے دامن میں زبردست بارش ہوئی۔
ایک دادی پانی سے بھر گئی۔ یکایک سیلاب آگیا ادوہ اس جوش و خروش
سے آیا کہ نصف میل کی چوڑائی میں ہر چیز بہا لے گیا۔ بڑی تہر کا ایک اہم حصہ
بھی برباد ہو گیا اور اس سے بھونٹ چھوٹی نہروں کا جو وسیع سلسلہ جاری کیا
گیا تھا۔ وہ بھی ماتی نہ رہا۔

لاجوس نے پھر آدمی فراہم کیے اور ایک مہینے کی محنت سے سب کچھ از سر نو
تیار کر لیا۔ دوبارہ فصلیں بوئی گئیں۔ اور صحرائی علاقہ گندم، اوسر، اور
سبزلیوں کی روئیدگی سے سبز نہ رہن گیا۔ عین اس موقع پر طویں دل نمودار
ہوا اور پانچ میل کی چوڑائی میں زمین پر طویں کا ایسا فرش بچھ گیا کہ آدمی
قدم رکھتا تو کم دیش ایک درجن ٹڈیاں بھٹی جاتیں۔ پنتالیس روڈ تک اس
دل کے خلاف سلسلہ جنگ جاری رہا۔ کھائیاں کھو دی گئیں، مٹی کے ہندو

گئے۔ جلتے ہوئے تیل کی ایک حدفاصل تاٹم کر دی گئی۔ عرب مزے لے لے کر ٹڈی بال کھاتے ہیں۔ وہ جدوجہد کرتے کرتے تھک گئے اور پلے ٹھیکٹا لہی کے خلاف لڑنا حماقت ہے۔ اور قدرت کی طرف سے غذا کا ہوسامان ہو گیا ہے۔ اسے تباہ نہ کرنا چاہیے۔ امریکیوں نے جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ دین میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے محنت و مشقت کرتے رہے۔ آخر میں نصلوں کا صرف ایک حصہ بچایا جا سکا۔ یہ لوگ بال بچوں کو چھوڑ کر نصف کرہ ارض طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ انھیں کوئی مشکل ہراساں نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ بیج کا بیانا خیر منگو کر از سر نو کاشت شروع کر دی گئی۔ یہ آسمانی آفت ایک لحاظ سے برکت ثابت ہوئی، اس لیے کہ معلوم ہو گیا اگر مناسب پانی اور مناسب توجہ مل جاتے تو بہت سی مقامی فصلیں امریکی فصلوں سے زیادہ پیداوار دیتی ہیں۔ ابتدا میں خود عرب بھی امریکیوں کو دیکھ کر سر کر جیسے ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا کا اسلام کے قلب میں یہ کافر کیوں آگئے۔ راجس کو مزدور مہیا کرنے کے لیے بہت کوشش کرنی پڑتی تھی۔ بھرتی کے بعد مزدوروں کو رکھایا جاتا کہ کام کیوں کر کرنا ہو گا۔ انھیں لمبے دسے والے پیچے دے دیئے جاتے، جو کبھی انھوں نے دیکھے نہ تھے۔ بعض نے ان کے دسے کاٹ کر اپنے دستوں جیسے بنالینے۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اونٹوں کی منگنیوں کو کبھی کھا د کے طور پر استعمال نہ کیا تھا۔ حبیب راجس نے بادشاہ کے اصطلیل سے بھترنڈ لینے تاکہ ارد گرد پھیر کر انڈیا کی مینگنیاں فراہم کر لائیں تو فتریاؤں نے اس مسیح کے مجنونا نامہ اور نام کا عجیب انداز میں مذاق اڑایا۔ اگر بادشاہ کی طرف سے امریکیوں

کی اعلیٰ کا حکم جاری نہ ہو چکا ہوتا تو سب کان بغاوت کو دیتے۔ مہینوں بعد یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ جس زمین میں مینگنیوں کی کھاد استعمال ہوئی تھی، اس کی پیداوار دوسری زمینوں کے مقابلے میں نہیں چار گنا زیادہ رہی۔ اس وقت عربوں نے اعتراف کیا کہ اونٹ کی مینگنیاں جلانے کے علاوہ اور کام بھی دے سکتی ہیں۔

صدیوں تک عرب کھیتی باڑی میں اس نظریے پر عمل پیرا رہے کہ اگر تھوڑا پانی فصل کے لیے مفید ہے۔ تو پانی کی بہت بڑی مقدار بدرجہا زیادہ مفید ہوئی چاہیے۔ چنانچہ مقامی کاشتکار اپنے کھیتوں کو مہربا پانی سے بھرا رکھتے۔ اس طرح پانی بھی بے کار جاتا اور فصلوں کو بھی نقصان پہنچتا۔ علاوہ برسی وہ سمجھتے تھے کہ فصل جتنی گھنی ہوگی اتنی ہی پیداوار بڑھے گی۔ چنانچہ وہ اس کے لیے تیار نہ تھے کہ فصل کے پودے یا پھلوں کے درخت ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر ہونے چاہئیں۔ چنانچہ بار بار کے تجربوں سے انھیں بتایا گیا کہ بانی کا محدود استعمال ہی مناسب ہے اور درختوں یا پودوں کے درمیان خاص فاصلہ ہونا چاہیے۔

۱۹۲۱ء میں جنگ ختم ہو گئی اور بادشاہ نے الخرج کے زرعی منصوبوں کا خراج دیکھتے ہوئے اپنے فمے لے لیا کہ میری قوم کو غذائی اجناس کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ کھیت باڑی میں رہنمائی کے محتاج ہیں۔ الخرج کے زرعی فارم نے دوا مقصد پودے کر رہے ہیں۔ لہذا ان میں جو کچھ خراج ہوگا، وہ میں دوں گا۔ اس وقت بادشاہ کو تیل کی مائٹھی بڑی کثیر مقدار میں ملنے لگی تھی۔

اس کے بعد امریکہ نے تیسرا زرعی وفد الخارج بھیجا جس کا صدر ریاست
 اڈولف کے زرعی کالج کا پروفیسر فرینکلن سٹیورٹ ہیرٹس تھا۔ اس کے
 ساتھ دو اور ماہرین زراعت بھی تھے۔ الخارج کے دورے کے بعد انھوں نے
 جو رپورٹ پیش کی اس کا مفاد یہ تھا کہ مشکلات کے باوجود ترقی کا سلسلہ
 جاری ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے زرعی فارمولہ کی توثیح کا فرمان جاری کر دیا اور
 ہر خرچ کی ذمہ داری خود قبول کر لی۔ "ارالکو" نے ضرورت کے مطابق آدمی
 مہیا کرنے کا ذمہ اٹھا لیا۔ ۱۹۶۶ء میں راجس واپس جا چکا تھا اور
 ۱۹۶۷ء میں ولی عہد نے امریکہ کا دورہ کیا تو کئی دن راجس کے ساتھ
 اہرماؤں و نائیں بسر کیے۔ اس وقت سے الخارج کے فارمولوں میں قریباً دو درجن
 امریکی ماہرین زراعت کا کام کر رہے ہیں۔ ابتدا میں نگرانی ٹکس اس کے کینیڈا جیٹورڈز
 کے ہاتھ میں تھی۔ بعد میں اس کے دو گارفرٹیک بروک شیشر کو نگران بنا دیا گیا بروک
 شیشر کی نگرانی میں فارم بحیثیت مجموعی تین ہزار ایکڑ تک پہنچ گئے اور امید
 ہے کہ دس ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ رتبہ زیر کاشت آ جائے گا۔

جو شخص فارمولہ کو دیکھنا چاہے اسے تین جداگانہ فارمولوں پر ضرور جانا
 چاہیے۔ لکنیٹ کی بنی ہوئی آبپاشی کی نالیوں کے ساتھ ساتھ صاف ستھری
 میٹرکیں بنی ہوئی ہیں۔ نالیوں کے دونوں کناروں پر پوکیشن اور ببول کے
 Utah جو رہ امریکہ کی ریاست نیواڈا کے مشرق اور ایوی زونا

کے شامل ہیں

(ii) Franklin Stewart Harris

(iii) Keneth J. Edwards (iv) Frank Brookshior

درخت لگا دیئے گئے ہیں۔ دونوں جانب دوسرن کے سبز کھیت صحرا میں ایسے نظر آتے تھے۔ جیسے شطرنج کے مربع خانے ہوں۔ حال ہی میں نو سو ایکڑ گندم، تین سو ایکڑ یاجرو، تین سو ستائیس ایکڑ بیو، دو سو اٹھتر ایکڑ دوسرن پھالیس ایکڑ سودائی گھاس، اٹھائیس ایکڑ مکئی، دو ایکڑ گنا وغیرہ جنس بودی گئی تھی۔ نصف ایکڑ ہیں انگور کی کاشت ہوئی تھی۔ غرض الخارج سے ٹرکوں اور موٹر کاروں پر مختلف چیزیں روزانہ ریاض پہنچ رہی ہیں۔ مثلاً تربوز، ٹماٹر، گلاب، مولی، کھیرے، گدھ، ایک قسم کا خربوزہ، پیاز، کدو، گوہ بھی، پھول گوہ بھی، کرم کلا، مینگن، سلاد، مٹر، سبزی، شلجم وغیرہ۔ عرب میں چند سال پیشتر ان سبزیوں کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ بلکہ ان کا میسر آنا ہی محال تھا۔

جن فصلوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ الخارج کے فارموں میں بعض نئی فصلیں بھی رائج کی گئی ہیں۔ مثلاً آر لینڈ کے اعلیٰ قسم کے آلو اور اسٹابری۔ عراق سے ناشپاتی، انار، انجیر، خوبانی، شگترے اور شفتالو کی مختلف قسمیں منگائی گئی ہیں۔ ریت کے اندر بڑھنے پھولنے والی پھلیاں بھی کاشت کی گئیں جن سے تیل نکلتا ہے اور یہ تیل آدمی بھی کھاتے ہیں، مصنعت و حرفت میں بھی کام دیتا ہے۔ چاول کی مختلف قسموں کے تعلق تجربات جاری ہیں۔ چونکہ دولت سعودیہ کثیر مقدار میں چاول درآمد کرتی ہے۔ اس پیناس کی پیداوار ملک کے لئے مفید ہوگی۔

بولوگ فارموں میں کام کاج کرتے ہیں ان کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے بھی مستظموں نے پوری کوشش کی ہے۔ مثلاً کم تنخواہ والے ملازمین

چاہیں تو فادمول کے ذخیروں سے ایک چوتھائی رعایتی قیمت پر غذائی جنسیں خرید سکتے ہیں۔ نیز زیادہ تنخواہ پانے والے کارکنوں کے لیے سکونتی مکانات کا بندوبست شروع ہو گیا ہے۔

نجد میں ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہاں درخت قریباً ناپید تھے وخت لگا کر ریت کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکتا تھا یا لکڑی جلانے کے کام بھی آسکتی تھی۔ عمارتوں میں بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ الانحرج میں کوئی پینتیس ہزار درخت ایسے فرض سے نکلائے گئے کہ ریت کو روکا جاسکے۔ پچیس ہزار درخت اعلیٰ اور بھول کے آٹھ آٹھ ایکڑ کے رقبوں میں لگ چکے ہیں۔ جب یہ پرورش پاتا جائے گا تو ازریقہ سے بلیاں منگوائے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ الانحرج میں دس ہزار درخت کھجور کے نکلائے گئے۔ عرب خدا جانے کب سے کھجور کی پرورش کرتے چلے آئے ہیں۔ اب کیلے فوریا سے اعلیٰ درجے کی پود منگائی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں الانحرج نے پہلے سے چار گنا کھجوریں پیدا کیں اور ان کی تمہیں بھی بڑی اچھی تھیں۔ پود کے ذخیرے بنائے گئے ہیں جن میں سے کھجور، انجیر، انار، شہتوت اور سنگترے، بیمرل وغیرہ کی قلمیں مل سکتی ہیں۔ البتہ یہ بنادینا ضروری ہے کہ عرب کے اس حصے میں کھیتی باڑی کے لیے جو پانی استعمال ہوتا ہے اس میں نمک کی مقدار زیادہ ہے اور زمین کے جن قطعوں میں مدت تک آبیاری کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پانی نکال دینے کا مناسب انتظام نہ متعارف نہ ہو چکا ہے۔ اب مختلف ذریعوں سے انہیں درست کیا جا رہا ہے۔

بڑی نہروں کی لمبائی میں سیل سے زیادہ ہو گئی۔ ان کے علاوہ آبپاشی کی
 نالیاں مجموعی طور پر پائسو میل سے کم لمبی نہ ہوں گی۔ پھر ایسے بندھی بنا دیئے گئے
 ہیں کہ سیلاب آجائے تو کھیتوں کی حفاظت کا کام دے سکیں۔ اگرچہ عرب
 میں مزدور بہت ارزاں مل جاتے ہیں لیکن تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ مشینوں
 کے ذریعے سے کام لینا زیادہ ارزاں رہتا ہے۔ مثلاً ہفوف میں مشین کے ذریعے
 سے بل چلایا گیا تو فی ایکڑ اٹھارہ ریال خرچ ہوئے۔ مزدوروں کے ذریعے
 سے یہی کام لیا گیا تو ایک ایکڑ پر سینتیس ریال خرچ کرنے پڑے۔ علاوہ
 بریں مزدوروں کو ایک وقت کا کھانا بھی دیا گیا۔ چائے اور قہوہ بھی پلایا گیا۔
 اب امریکی ماہرین بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے مکانوں
 میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ بجلی کی روشنی لگ گئی ہے اور ضرورت کی
 تمام چیزیں بھیجا ہو چکی ہیں۔ سب سے اچھا کمرہ وہ ہے جسے عربی کمرہ کہا جاتا ہے
 اس میں اعلیٰ درجے کے قالین بچھے ہوتے ہیں۔ گاؤں کیے پڑے ہیں۔ نفیس
 پردے لگے ہوئے ہیں۔ اور بادشاہ نے اپنے محل سے نہایت عمدہ صوفے
 بھیج دیئے ہیں۔ جو ممتاز اصحاب فارم دیکھنے کے لیے آتے ہیں انہیں یہاں
 ٹھہرایا جاتا ہے۔ ان فارموں کو دیکھ کر شاہی خاندان کے افراد اور دوسرے
 بڑے بڑے مالکان اراضی نے اپنے ہاں کھیتی باڑی میں نئے طریقے جاری
 کر دیئے ہیں۔ وہ لوگ بیج یا فلیس بھی یہاں سے لے جاتے ہیں۔ خود ملک
 سود بھی عموماً الخرج آجاتا ہے۔ اور تمام فارموں میں پھر کر زراعت کی ترقی
 کا معاملہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ شیخ کویت کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ تاکہ شیخ

الخروج کی سبز لیں اور پیلوں کی قسموں کا بخوبی مشاہدہ کر لے جب وہ واپس جاتے لگا تو اس کے ہوائی جہاز میں بڑے بڑے تربہ زار اور دوسری چیزیں رکھ دی گئیں۔

شیخ عبداللہ سلیمان اور شاہی خاندان کے ممتاز افراد کی تائید کے باوجود چھ سال پیش تک ان فارموں پر سختی سے نکتہ چینی جاری تھی۔ نکتہ چینی کرنے والوں میں ایک طرف راسخ العقیدہ رہا بی ہتھے، جو کہتے تھے کہ نجد کی مقدس سرزمین میں کافروں کو کیوں رکھا گیا ہے۔ دوسری طرف عام کسان مقرر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو طریقہ ہمارے آباد اجداد کے لیے اچھے تھے وہی ہمارے لیے اچھے ہیں۔ اس مخالفت کو ختم کرنے کے لیے شیخ عبداللہ سلیمان نے مرحوم بادشاہ کو سالانہ کے موسم گرما میں آمادہ کیا کہ الخرج کا دورہ فرمائیں۔ چنانچہ وہ دو ہزار سے زیادہ آدمی ساتھ لائے جن میں ان کے رشتہ دار اور بڑے بڑے سانسر شامل تھے۔ ان کی آمد سے پیشتر صدر مقام کے ارد گرد چند میل تک ڈی ڈی ٹی پھڑک دی گئی۔ جہاں جہاں پانی ٹپھرا ہوا تھا اس پر تیل ڈال دیا گیا۔ چنانچہ عربی حکمران کے دربار کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ اس پاس نہ کوئی ٹھکسی ہے اور نہ چھڑ۔ ولی عہد اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنے محل میں بھی اسی پیمانے پر صفائی کرائی۔ بادشاہ کی آمد سے پہلے جہازوں کے اترنے کے لیے دو میدان تیار کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک شاہی محل کے قریب تھا اور دوسرا درجنی فارموں کے صدر دفتر کے پاس دو خاص زمینے تیار کر لیے گئے۔ تاکہ بادشاہ کو ہوائی جہاز سے اترنے میں کوئی دقت پیش

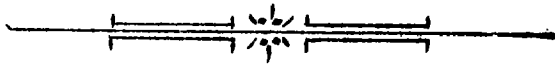
و آئے زمینوں کو دیکھ کر بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ فوراً زیسے بنانے والے کو انعام سے نوازا۔

اتنے جہان آجلنے کی وجہ سے امریکی مینز بالوں کو خاصی مشتقیں اٹھانا پڑیں۔ چنانچہ پانی لانے والے ٹرک رات دن نقل و حرکت میں رہتے تھے۔ تاکہ پیاسے عربوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مقدار میں پانی مہیا رہے۔ بعض اصحاب نے پہلی مرتبہ برف ملا پانی پیا۔

بادشاہ کے لیے جو ریفریجریٹر ریاض سے بھیجا گیا تھا وہ بگڑ گیا تو رات کے وقت فارم کے مینجر کو جگا کر اس کی درستی کا انتظام کرایا گیا۔ مینجر نے ظہران سے مستری منگوانا چاہا اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے اپنا ریفریجریٹر بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ اس موقع پر فارم کے صدر دفتر میں تربوزوں کی دعوت ہوئی۔ بادشاہ، شہزادے اور وزیر عربی کمرے میں بیٹھے۔ جہاں تھوے کے ساتھ بڑے بڑے قابوں میں تربوز پیش کئے گئے۔ باقی اصحاب کو دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا۔ بادشاہ نے کہا، میری قوم کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگر میری مملکت میں ایسے فارم جگہ جگہ بن جائیں تو بدو خانہ بدوشی ترک کر دیں۔ اور سبز چراگاہوں میں مستقل طور پر مقیم ہو جائیں۔ بحیرہ قلزم سے علیچ فارس تک بے شمار فارم بن جانے چاہئیں۔

ایڈمز نے اپنے سولہ ماہرین زراعت کی مدد سے دولت سعودیہ کے مختلف حصوں میں چار اور فارم بنا دیے ہیں۔ ایک قطیف میں دوسرا

ہفتوں میں تیسرا طائفہ میں اور چوتھا وادی قاطمہ میں۔
 پیداوار بڑھ رہی ہے۔ فصلوں کی حالت بہتر ہو رہی ہے کھیتی باڑی
 کے نئے طریقوں کا علم ترقی پا رہا ہے اور عربوں میں اسے قبولیت حاصل
 ہو رہی ہے۔ چند ورجن امریکی دنیا کے ایک الگ تھلگ علاقے میں آئے
 تھے آہستہ آہستہ انھوں نے نمونے کے فارم قائم کئے۔ نیلیج فارس
 سے ہجرت قلعہ نم تاکہ بننے والے عربوں میں کھیتی باڑی اور کاشت کاری کا
 ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بدوؤں کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب کا
 پیش خیمہ ہے۔



پھٹا باب:

نیشین

اگرچہ الفرج کے فارم ریاض کے جنوب میں ساحل خلیج فارس سے صرف پونے تین سو میل کے فاصلے پر ہیں، لیکن راستہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے طے کیا جاسکے۔ یاریت پر چلتے ملے مخصوص ٹائروں، پانی کے خاص ذخیرے اور پٹرول کی زیادہ مقدار ساتھ لیے بغیر اس پر قدم رکھا جاسکے جب تک فارم کی صاف ستھری عمارتوں اور کھیتوں کے مرتع سبزہ زاروں سے باہر نکلنا ہے تو گرد و غبار کے بادلوں میں سے بچکولے کھاتا ہوا مشتری جانب کے ان منجر میدانوں میں سے گزرتا ہے جن کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ درجہ حرارت موسم گرما کے مہذب تاب سے پیشتر بھی سائے میں ایک سوئس سے کم نہیں ہوتا۔ اور چلتے چلتے ہر آدھ گھنٹے کے بعد پانی بدل کر انجن کے ریڈیٹر کو ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں رکتے ہیں وہاں پانی بھی

پنا ضروری ہے اور پانی کے مشکیزے لڑک کے ساتھ لٹکے رہتے ہیں۔ بعض ایسے میدان بھی آتے ہیں جہاں باریک سنگریزے بچے ہوتے ہیں اور موٹر کی رفتار چالیس میل سے بھی زیادہ رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن عموماً رفتار اس سے نصف ہی رہتی ہے۔ وادی الخرج سے آگے بطحیں تو مٹرک تین ڈھلوانوں میں سے چمکہ کھاتی ہوئی ایک پتھرے میدان میں پہنچکر بالکل سیدھی ہو جاتی ہے۔ مطلع صاف ہو تو سورج سرخ تھال کی شکل میں طلوع ہوتا ہے۔ اس وقت نظر آتا ہے کہ گرد و غبار کے چھوٹے چھوٹے بگولے مہوار میدان میں ایک دوسرے کا تقاب کر رہے ہیں اور کبھی کبھی زور سے ٹرک کے ساتھ ٹکرا جاتے ہیں۔ عرب اٹھیں "جن" کہتے ہیں۔ دُور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیلے پانی کی بھیل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ موٹر نزدیک آتی ہے تو یہ تصور ناپید ہو جاتا ہے۔ یکا یک سرخ رنگ کی ایک چوٹی نمودار ہوتی ہے مگر زیادہ اونچی نہیں۔ اس کے بعد دوسری پتھر تھیری اور پتھر ڈی دیہیں مشرقی افق پر چوٹیوں کی ایک غیر منقطع قطار سامنے آ جاتی ہے۔ ابتدا میں مسافر سمجھتا ہے کہ یہ محض سراب ہے۔ لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں یہ چوٹیاں مستقل ماحول کی صورت اختیار کرتی جاتی ہیں۔ یہ دہناء کے ٹیلے ہیں۔ یعنی تانبے کے رنگ کی ریت کا وہ مشرقی دریا جو شمالی عرب کے صحرائے نفود کو جنوب کے صحرائے ریح الخالی سے ملتا ہے۔ دہناء چودہ سو میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوڑائی کم سے کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سو میل ہے۔ کہیں کہیں یہ دریائے رنگ چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ گیا ہے۔ لیکن عموماً یہ یکجا ہی ہے۔

اور اس کی لمبی چالیں فٹ سے ایک سو فٹ تک ہو گی۔ یہ ریگ زار شمالی عرب کے ریتے پتھروں کی تحلیل سے پیدا ہوا تھا۔ ہواؤں کے زیر اثر یہ ریت دس فٹ سے تیس فٹ تک جنوب کی جانب بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ راستہ الفرج سے نخلستان مغوف کی طرف آتا ہے، وہ دہنا کے ایک حصے میں سے گزرتا ہے، جو سب زیادہ ٹنک ہے، لیکن آبی دریاؤں کی طرح دہنا کے دریاے ریگ کی کیفیت بھی یہی ہے کہ جب چوڑائی کم ہو جاتی ہے تو گہرائی (دریاے ریگ کے تعلق میں اونچائی) بڑھ جاتی ہے۔ آدمی ہوا جالور یا موٹر اس میں سے گزرتا بڑا مشقت خیز ہے جب تک "اراکو" نے ریت پر چلنے والے بڑے بڑے ٹائر نہیں بنوائے تھے، موٹروں پر ان ٹیلوں میں سے گزرتا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کئی درجن آدمی موٹروں کو دھکیلنے کے لئے نہ لگائے جاتے۔ اگر صبح کی خشکی میں اسے طے نہ کر لیا جائے تو صحرانورد گرم ٹائروں میں ہوا کا دباؤ کم کر لینا چاہیے۔ نیز میدان سے قدم بڑھاتے وقت موٹر کو ٹھنڈا کر لینا مناسب ہے۔ کھلے ٹرک میں سوار ہو کر دہنا کے بلند ترین حصے میں پہنچیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماکن سمندر کی سطح پر لانچ میں بیٹھے ہونے بڑی بڑی سرخ لہروں میں سے گزر رہے ہیں جب ایک ٹیلے کے دامن میں پہنچ کر گرد و پیش نظر ڈالتے ہیں تو سطح زمین سے نیلے آسمان تک سنگترے کے رنگ کی ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سمندر کی لہروں کی طرح یہاں بھی ہر چالیسواں ٹیلہ ارد گرد کے ٹیلوں سے بلند نظر آتا ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی ریت کے

ہلکے سے بادلوں نے چھپا رکھی ہے۔ وہنا ہم حالت میں ایک شاعر اور قابل
دید منظر پیش کرتا ہے، لیکن اس منظر کو انتہائی خوبصورت شکل میں دیکھنا ہو
تو اسی میں خیمہ زن ہو جانا چاہیئے اور علی الصباح طلوع آفتاب کا نظارہ
کرنا چاہیئے۔ اس وقت ان ٹیلوں کی رنگینی واقعی حیرت انگیز بن جاتی ہے۔
عربی صبح کی تلیلیں الاوقات شفق سرخی اور زردی کو بڑھاتی چلی جاتی ہے
اور آخر شب کے ساتے تاریک بجایہ چمکتے جاتے ہیں۔

دہنا کو عموماً اسی راستے سے عبور کیا جاتا ہے۔ جہاں سے عام لوگ گزرنے
ہیں، لیکن ہوائیں راستے کا نشان اس طرح مٹا دیتی ہیں کہ ہر مسافر محسوس کرتا
ہے کہ صرف اسی کی سواری پہلی مرتبہ اس ساکن سمندر میں داخل ہو رہی ہے۔
جب راستہ ناپید ہو جانے کو ڈرائیڈ قطب نما کی مدد سے موڑ چلا تا ہے۔ بعض
مقامات پر نشان بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہ سفر اس درجہ مشکل ہے کہ صحرا میں سفر
کے قابل ٹوک بھی ہر نپدرہ منٹ کے بعد روکنے پڑتے ہیں تاکہ انہیں ٹھنڈا
کر لیا جائے۔

دہنا میں طلوع آفتاب جیسا ہی دوسرا خوشگوار نظارہ یہ ہے کہ قافلے
کے اونٹوں کی قطار ان سرخ ٹیلوں میں چلتی ہوئی دیکھی جائے۔ وہ بے پتے
عرب شتر سوار اپنے عقاب کے کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں تاکہ ہوا اور ریت
سے محفوظ رہیں۔ وہ اونٹ ہی کا ہنر و معلوم ہوتے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صحرا
کے جہاز پر مسافر سوار ہیں۔ ابتدائی دور کے انسان اونٹ کے بغیر عرب کے
صحراؤں میں سے گزر نہیں سکتے تھے، بلکہ اونٹ کے بغیر وسط عرب کے لوگ

زندگی بھی سبیر نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ یہ جانور ان کے لینے حمل و نقل ہی کا ذریعہ نہیں، بلکہ ان کی غذا بھی ہے۔ اور مشروب بھی، لباس بھی ہے اور دوا بھی۔ جسک آغز میں یہ کہ آرائش حسن کا بھی ہی ایک ذریعہ ہے۔

عرب کے اونٹ ایک کوہان والے ہوتے ہیں۔ ان کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً سیما ہی نکل اونٹ جو بد مزاج ہوتے ہیں۔ ان سے عموماً بار بار اڑی کا کام لیا جاتا ہے۔ سرخ نما جو بے رنگ کی نسل جسے "عمانیہ" کہتے ہیں اس لینے کہ یہ نسل ابتدا میں عمان سے آئی تھی۔ یہ اونٹ بڑے تیز رفتار ہوتے ہیں، مگر ان میں دم زیادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بادامی رنگ کی نسل جسے "حورہ" کہتے ہیں۔ یمنل شمالی نجد کے اونٹ اور عمانیہ کے اختلاط سے پیدا ہوئی اس نسل کے اونٹ عمانیہ جیسے تیز رفتار تو نہیں ہوتے، مگر ان میں قوت براشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اونٹ برو کی زندگی کا لاینفک جزو ہے۔ اور بدو کے نزدیک ہر شخص کی دولت کا شمار اونٹوں کی تعداد ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہ جانور دونوں جانب دو دو سو پونڈ کا وزن اٹھا کر ایسے مقامات پر بے تکلف چلا جاتا ہے جہاں دوسرا جانور قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ رفتار قریباً دو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ اور چلتے چلتے راستے کے آس پاس کی جھاڑیوں سے ایک دو نرالے بھی کھا لیتا ہے، لہذا اسے کھانے کے لیے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگرچہ اونٹ روزانہ پانی پینا پسند کرتا ہے، لیکن اگر تین روز بھی اسے پانی نہ ملے تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اسد ضرورت پیش آجائے تو یہ پانی پانی

پانی کے بغیر گزار لیتا ہے۔

باربرداری کے علاوہ اونٹ کا دودھ بدو کی خاص خوراک ہے۔ اگرچہ اس دودھ میں چکنائی نہیں ہوتی کہ مکھن نکالا جاسکے، تاہم اسے بلو کر ایسا پتیر بنایا جاسکتا ہے جسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ضرورت کے وقت اونٹ سے قے کرائی جاتی ہے اور چوہاب اس کے معدے سے نکلتا ہے، اس سے راہ گم کردہ بدوئل کی جانیں محفوظ رہتی ہیں۔ اونٹ کا گوشت بدوے مزے سے کھایا جاتا ہے۔ جران اونٹ کا کوہان اس درجہ خوش ذائقہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر اہم دعوت کے موقع پر یہ مہانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ عربوں کے نزدیک یہی مواقع پر بہترین کھانا ہے کہ سالم اونٹ کو بھونا جائے۔ اس کے پیٹ میں ایک بھنا ہوا دینا ہو، ورنہ کے پیٹ میں مرغی اور اس کے پیٹ میں ابلے ہوئے اڑسے ہوں، نیز ان سب کے پیٹ میں چاول ہوں۔

اونٹ کی مینگنیاں عربوں کے لیے عام ایندھن کا کام دیتی ہیں۔ بہت سے مقامات پر بدو اونٹ کے چمڑے کی پتیلیوں میں مینگنیاں بھر کر فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ اونٹ کے بالوں سے کپڑا بنتے ہیں۔ بعض اوقات جیسے اونٹ اسی کے بالوں کے ہوتے ہیں سیاہ رنگ کی کبریوں کے بال بھی عموماً اس غرض سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اونٹ کے چمڑے سے جوتے پیٹیاں اور مشینریے بنتے ہیں۔ گو فصل کے علاوہ اونٹ عرب میں بل چلانے اور کھودنے سے پانی نکالتے کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً نجد انہا زمین میں اب بھی اسی طریقے پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

تایسج عرب میں ایسی بہت سی کہانیاں ذکر کر رہی ہیں کہ اونٹوں نے اپنی جیز زقاری یا قمرت برداشت یا پانی کے لیے احساس کی بدولت آقاؤں کی جانیں بچالیں۔ اونٹوں پر بہت سی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ اور بے شمار واقعات قتل بھی پیش آئے بہت سے قبیلوں کی زندگیاں انھیں پالنے اور فروخت کرنے ہی پر موقوف ہیں۔ جابجا مشہور منڈیاں بنی ہوئی ہیں، جہاں اونٹ فروخت ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی منڈی شمالی نجد کے شہر تبوکہ میں ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان وہاں ہر سال پندرہ ہزار اونٹ فروخت ہوتے تھے۔ اب یمن، ترک اور ہوائی جہاز اونٹ کی جگہ لے رہے ہیں۔ اور تجارتی راستوں پر بھی قبضہ کرنے جا رہے ہیں۔ پچیس سال پیشتر شاہ ابن سعود اونٹ ہی پر سفر کرتے تھے۔ اب ان کے پاس موٹروں اور ہوائی جہازوں کے بیڑے موجود ہیں۔ تاہم اب بھی ریاض، انگلستان، ہفوت اور خلیج فارس کے درمیان چار ہزار اونٹ تجارتی مال لانے لے جانے میں مصروف ہیں، لیکن ریگ زار میں چلنے والے ٹوک اور ریلوں پر چلنے والی گاڑیاں زیادہ عام ہو رہی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے مقابلے میں گھوڑا جزیرۃ العرب میں تناثر پہنچا۔ غالباً یہ مصر سے آیا تھا۔ وسط عرب کی صحت بخش آب و ہوا میں پہنچنے کے بعد اس کی نسل خوب بڑھی۔ کیونکہ یہ علاقہ بیرونی دنیا سے منقطع تھا اس لیے گھوڑوں کی نسل میں باہر سے کوئی آمیزش نہ ہو سکی۔ اس طرح عربی گھوڑے کی تیزی و طواری، خوش اطواری اور قوت برداشت نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ بخیر گھوڑے سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ جو پانی دہیچتے ہیں ان میں چوہے کے اجزاء

زیادہ ہیں، جن سے ڈیال خوب مضبوط ہو جاتی ہیں۔ نیز وہاں کی زمین میں سرسبز ہے جس سے گھوڑے کا رنگ سیاہی اٹل پیدا ہو جاتا ہے۔ گھڑ دوڑا اب بھی جزیرۃ العرب میں ایک ہر دلعزیز تفریح ہے۔ گزشتہ صدی میں حاکم کے رشیدی خاندان کا اصلیل سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اب ابن سعود کے پاس بہترین گھوڑے موجود ہیں ۛ

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب آٹھویں صدی مسیح میں شمالی افریقہ کو سفر کرتے ہوئے ہسپانیہ پہنچے اور گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں سے عربی گھوڑوں کی نسل پورے یورپ میں پھیلی۔ جب ولیم فاتح ۱۰۶۶ء میں انگلستان پر حملہ آور ہوا تو جو گھوڑے اپنے ساتھ لے گیا، وہ اسی ہسپانوی نسل کے تھے۔ صلیبی جنگوں میں ایک حکمران نے مہری اول شاہ انگلستان کو دو عربی گھوڑے بطور تحفہ دیئے تھے۔ ملکہ ایلزبتھ کے مہدی میں بہت سے عربی گھوڑے نسل کشی کے لیے انگلستان لائے گئے۔ پھر جیمز اول کے زمانے میں عربی گھوڑے ڈوڈ کی غرض سے منگوائے گئے۔ اصطلاحاً کسی گھوڑے کو اس وقت تک اصلیل قرار نہیں دیا جاسکتا، جب تک اس کا سلسلہ ان میں گھوڑوں تک نہ پہنچا دیا جائے۔ جو ترمین صدی کے اوائل میں طویل بحری سفر طے کر کے انگلستان پہنچے تھے۔ اول برلی ٹرک، دومارڈاری اریٹن، امیراگرڈ فین اور پین ۱۷۱۸ء میں انگلستان کے شائقین پر واضح ہو گیا۔ کہ اصلیل گھوڑے خالص عربی نسل

-
- (i) Byerly Turk (ii) Darly Arabian
(iii) Godophin Arabian.

کے گھوڑوں سے زیادہ تیز رفتار ہوتے ہیں۔ اگرچہ دوسری خصوصیتوں کے اعتبار سے خاص عربی گھوڑے عرب میں زیادہ پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، کچھ مدت پیشتر کی بات ہے۔ کہ عرب اپنے ہاں سے ساڈھوں کے سولے کوئی گھوڑا باہر نہ جانے دیتے تھے۔ گھوڑیاں نسل کشی کے لیے محفوظ رکھی جاتی تھیں۔

صحرائی علاقے میں سفر کرنے کے لیے گھوڑا اتنا مفید نہیں جتنا کہ گدھا اور اونٹ مفید ہوتا ہے۔ نیز گدھے اور اونٹ کے مقابلے میں گھوڑے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے خاص خوراک کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی کے بغیر وہ لمبے سفر نہیں کر سکتا۔ رقراریت کے ٹیلوں یا پہاڑی علاقوں میں خود بخود بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ لہذا گھوڑے زیادہ تر بادشاہ یا اس کے بیٹوں یا بڑے بڑے مالکان اراضی کے اصطبلوں ہی تک محفوظ رہ گئے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں دولت سعودیہ کے بعض حصوں کے اندر اونٹ تین سو دریاں میں مل جاتا تھا۔ گرہے کی قیمت ایک ہزار ریال یعنی رادر گھوڑا تین ہزار ریال بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پاتا تھا۔ جنگ میں بھی گھوڑے کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے۔ جب مروجہ ابن سعود نے عرب قبیلوں کے چھاپے روک دیے تو رقراریت و نیز دوسرے جنگجو قبیلے گھوڑوں کا گھوڑوں استعمال کرتے تھے۔ امیر فیصل (ابن شاہ ابن سعود) نے ۱۹۳۱ء میں مین کی ایک فوج کو شکست ناش دی تھی۔ تو ملکی کٹر بند کلاڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ شاہ سعود کی فوج میں بھی قلعہ حیثیت اسی گردہ کہ حاصل ہے، جس کے پاس موٹریں ہیں۔

عرب میں افریقی اصطلاح کے مطابق آج بڑا شکار بہت کم ہے۔ ہر

سویز کی کھدائی سے پیشتر حجان کے پہاڑوں میں دنٹا فوٹائشر مل جاتے تھے اور شیر کے شکار کی تصویریں بھی "معہد فہب" کے قریب چٹانوں پر ملتی ہیں چیتے اور تیندوے بعض دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ پر طعن شکار شتر مرغ کا ہوتا ہے جو محفوظ سے حاصل تک گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہے۔

زہریلے سانپ نسبتاً بہت کم ہے۔ حشرات الارض میں سب سے بڑا وہ ہے جسے موسا کہتے ہیں۔ لگژ بگڑ، بھیڑیے، لومڑیاں اور خرگوش مختلف علاقوں میں یا چھوٹے چھوٹے گردہوں میں ملتے ہیں۔ برف جیسے سفید سلقے والے غزال نیز ہرنوں کی دوسروں قسمیں صحراؤں میں پھرتی رہتی ہیں۔ جدہ کے غیر ملکی سفارت خانوں کے لوگ شکار کے لیے نکلتے ہیں تو جیپوں میں بیٹھ کر غزال ہی کا شکار کھیلتے ہیں۔

بہت سے عرب شیخ شکار کے لئے بازوں سے کام لیتے ہیں۔ ہانوں کو شکار کے لئے تیار کرنا بڑا وقت لیتا ہے اور اس کے لئے ایک سے زیادہ آدمیوں کو پورا دن دینا پڑتا ہے۔ باز کا شکار عمدہ ماہر سے اسج تک کیا جاتا ہے۔ بازوں کی قسمیں ہیں۔ اول شکرے جن کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ دوسرے باز جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ انہوں میں شکرے سے زیادہ تیز اور چلے میں زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ ہاد کی تربیت کے سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بند کر دیتے ہیں اس غرض سے پکوں میں ایک دھاگہ پھیر دیا جاتا ہے۔ بعد میں دھاگے کی جگہ خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ باز کو مدھلنے میں دو یا تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ اس

زبان میں تربیت دینے والا شخص باز کو ہر وقت ساتھ لئے رہتا ہے۔ خود چارہ دیتا ہے۔ سونے کے وقت بھی اپنے قریب رکھتا ہے۔ جب باز مالک پر بھروسہ کرنے لگ جاتا ہے۔ اور پکار کا جواب دیتا ہے۔ تو پھر اس کے سامنے کسی پوندے کے پرول کو بانٹ دھ کر طعنے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں باز کی ٹانگ ٹٹتے کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عام سدا ہوئے باز کی قیمت پچاس ساٹھ ریال سے کم نہیں ہوتی، مگر مشہور باز اس سے تین گنا بلکہ اور زیادہ قیمت پاتے ہیں۔

دہنار کے لڑکے نار سے ذرا آگے اور مشرقی سمت کی وادیوں میں بدوول کے غیمے دیکھ کر یہ حقیقت تافہ ہو جاتی ہے۔ کہ اگرچہ اب تک صحیح مردم شناری نہیں ہوئی، تاہم یہ اندازہ درست ہے کہ عرب کی قریباً ایک تہائی آبادی خانہ بدوش ہے۔ یہ لوگ ان قبیلوں کی اولاد ہیں جو بہت پہلے زرخیز اور سیراب خطوں سے جبراً نکال دیئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض یمن میں رہتے تھے۔ شاید پانچویں صدی عیسوی میں بندہ عرب کے ٹوٹنے پر باہر نکلنے پر مجبور ہوئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے خشک اور بے پھر ماحول سے مطابقت پیدا کر لی۔ وہ چند مہینے اپنے ریلڈ اس گھاس میں چراتے ہیں جو وادیوں کے کناروں پر آگ اُتی ہے۔ پھر جو عرب کے مختلف حصوں میں جیسے جیسے بارش ہوتی جاتی ہے، اوپر منتقل ہوتے جاتے ہیں۔

دولت سعودیہ کے بدوہی وہ اصل سرچشمہ ہیں جہاں سے دتناؤ قناد دوسری آبادیاں زندگی کی نئی روح حاصل کرتی رہیں۔ ان کے چار بڑے گروہ ہیں

سب بلیجیت بادیر کی ہے۔ یہ لوگ سیاہ خیموں میں رہتے ہیں۔ سال بھر میں نو مہینے قلب محرا کے اور گزارتے ہیں۔ اونٹ پالتے ہیں۔ اپنے دائرے سے باہر شادی نہیں کرتے اور ساری دنیا کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان میں سے جن لوگوں کو اہل کا درجہ حاصل ہے، وہ اپنا مسئلہ نسب حضرت اسماعیل اور قحطان تک پہنچاتے ہیں اور ان کے نسب میں کہیں امیر ش نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ قحطان کے بیٹے یارب ہی کی وجہ سے ملک اور ان کے باشندوں کا نام عرب پڑا۔ جن قبیلوں کو نسب کے اعتبار سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:-
منیرہ، شمر، عرب، مطیر، عجمان، ظافر، مرہ، قحطان، دواسر، منہیر، تواسم، سولیط، بادیر بھی انہی قبیلوں میں شامل ہیں۔ حوازم، رثارہ اور حلیحہ نسب خالص نہیں سمجھا جاتا، لہذا وہ اشراف میں داخل نہیں مصلیہ بدوئل میں سب سے زیادہ کم حیثیت والے شمار ہوتے ہیں سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان مسیحوں کی اولاد ہیں جو صلیبی جنگوں میں شام پہنچے تھے۔

ان سے بود و باش میں ذرا پست لیکن نسل و نون میں ملتے جلتے وہ لوگ ہیں جنہیں ”عرب دار“ کہا جاتا ہے یعنی نیم خانہ بدوش لوگ۔ وہ اپنی اصل حیثیت اس وجہ سے زائل کر چکے ہیں کہ سال کا کچھ حصہ صحرا میں گزارتے ہیں اور کچھ حصہ آس پاس کے قصبوں مثلاً کیت میں۔ بعض ”عرب دار“ اشراف کے گردہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے بدو بھائیوں میں شادیاں بھی کر لیتے ہیں۔ مگر عام طور پر انہیں پست ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ کسی بدو کو شہر میں آنا پڑے تو ”عرب دار“ کے ان ٹھہرنے میں اسے تکلف نہیں ہوتا۔ تیسرا گروہ

ان صحرائوں کا ہے جنہیں مکہ یا مکہ بان کہتے ہیں۔ وہ شہر میں بسنے والے عربوں نیز اہم قبیلوں کی بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ چونکہ بھیڑ بکریوں کے ریڈھ صحرائیں دور نہیں لے جاسکتے اس لیے آبادیوں کے قریب ہی رہتے ہیں اور بدوؤں کی طرح پورے صحرا کو اپنا سرمائی وطن نہیں سمجھتے۔ سب سے پہلے وہ بدو ہیں جنہیں ”حدیارہ“ کہتے ہیں۔ یہ لوگ خمیوں میں نہیں آگے گا رہے یا پتھر کے مستقل سکائوں میں رہتے ہیں، اس لیے حقیقی بدو انہیں حقیر سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ شہروں سے ضروری چیزیں لے کر فروخت کے لیے صحرائی علاقے میں نکل جاتے ہیں۔ تو کوئی بھی ان سے خریدنے میں تامل نہیں کرتا۔

بدوؤں کی سرداری شیخ کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہر شخص کو ایک خاص قبیلے کا فرد ہونا چاہئے۔ اگرچہ شیخ قبیلہ کا بڑا بیٹا ہوتا ضروری نہیں۔ شیخ کے بیٹے یا بھتیجے میں سے ہر شخص جو اہل مردی اور قیادت کی خصوصیات کا جامع ہوا اسے شیخ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نصیبیہ یا ”خلفہ“ کے بغیر دوسری خصوصیات قبیلے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ البتہ سردار کا سختی اور قیامت ہونا ضروری ہے۔

ہر قبیلے کے اپنے کنوئیں ہیں جن کے ارد گرد یہ لوگ موسم گرما میں یعنی جون سے اکتوبر تک خیمہ زن رہتے ہیں۔ جب بارشیں شروع ہو جاتی ہیں تو یہ اپنے صحرائی دائرے میں گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ بدوی قبیلوں کا دائرہ عموماً سوسا سو میل مشرقاً فرما اور دو سو میل شمالاً سمجھا جاتا ہے۔ خشک سالی کے وقت مختلف قبیلے اپنے حبیث قبیلے کے دائروں میں بھی چلے

جاتے ہیں۔ اس طرح مختلف قبیلوں کے درمیان ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً حجام، مرہ، اور سجدان، یا ظفر، شمر اور عوازم کے وفاق۔ اگر کسی قبیلے نے ایک یا زیادہ وفاق قائم کر رکھے ہیں تو اس سے صحرائی زندگی کے مجلسی نظام میں زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ جانور چرانے کے علاوہ سالانہ منڈیوں میں بھی جاتے ہوئے مختلف لوگ اپنے حلیف قبیلوں کے دائرے میں سے گزر جاتے ہیں۔

عنیزہ گرمیاں شام و عراق اور سردیاں شمالی عرب کے صحرائے نفوذ کے آس پاس گزرتے ہیں۔ یہ نہایت اہم قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے۔ ان کا گروہ چھوٹا ہوتا ہے اپنے سیاہ خیمے ایک دائرے میں لگاتے ہیں۔ اگر تعداد زیادہ ہو تو پھر خیمے تضاروں میں لگتے ہیں۔ اس قبیلے کے دولت مند خاندان بھی عموماً ایک ہی خیمہ استعمال کرتے ہیں۔ البتہ کسی شخص کی دو دیوہیاں ہوں اور وہ اکٹھی خوشگوار زندگی بسر نہ کر سکتی ہوں تو بڑے خیمے کے پاس ایک چھوٹا خیمہ نصب کر لیا جاتا ہے۔ لیکن تعداد ازواج برووں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ البتہ طلاق کا رواج موجود ہے۔ عنیزہ ماضی قریب تک قبائلی جنگوں میں سرگرم تھی اور ان میں خون کے انتقاموں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بہت سے بڑے قبیلوں کی طرح یہ لوگ بھی کسی پر رات کے وقت حملہ نہیں کرتے، چھاپوں میں عورتوں، بچوں یا آدمیوں کو قیدی بھی نہیں بناتے، صرف مال لے کر چلے جاتے ہیں۔

عنیزہ ہی کی ایک شاخ رولہ بھی ہے جن کی زیادہ تعداد شام میں مقیم ہے

کچھ لوگ دولت سعودیہ اور عراق میں رہتے ہیں۔ چند سال پیش تک وہ عموماً لڑائیوں میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح انہیں اپنی جوانمردی، استقامت اور مزہ مندی دکھانے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے کم و بیش چھ افراد چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے یا مارے جاتے۔ بہت سے دوسرے بدروئل کی طرح روئے بھی سیاہ خیموں میں رہتے ہیں جو بکریوں کے بالوں یا بیڑوں کا ڈن سے بنے جاتے ہیں۔ فرش پر پہلے دریاں اور ان کے اوپر روئی بھرے ہونے لگے بچھالتے ہیں اور فرش کے کنارے تکیے رکھ دیتے ہیں۔ عرب کا ایک قبیلہ جس کے حالات بیرونی دنیا تک اکثر پہنچے رہے، قبیلہ حرب ہے جو حجاز میں رہتا ہے۔ چونکہ اس کا وطن بحیرہ قلزم سے قریب ہے اس لیے قبیلہ میں سے بعض نے حبشوں سے شادیاں کر لیں اور عام بدروئل کی طرح ان کا نسب خالص نہیں رہا۔ یہ لوگ پہلے دمشق، مدینہ منورہ، جدہ اور مکہ معظمہ آنے جانے والے قافلوں پر چھاپے مارا کرتے تھے۔ حجاز پر بن گئی تو اس پر چھاپے مارنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں یہ لوگ ترکوں کے طرف دار ہر کر لڑے۔ لارنس نے حجاز پر لڑے تباہ کردی۔ تو حرب نے پھر عازمین حج و زیارت پر چھاپے مارنے شروع کیے شاہ ابن سعود حجاز پر قابض ہوا تو ان لوگوں کو بارہا متنبہ کیا۔ حجب کوئی اثر نہ دیکھا تو ابن سعود نے ان کو ان کی گر شمالی کا حکم دے دیا۔ انہوں نے ایسی سخت مزاحمت کی کہ اب ان کی بہت معتدلی تعداد باقی رہ گئی ہے۔ بعض گروہوں میں سے صرف ایک آدمی زمرہ سچا جس نے شکست کی خبر دوسرے گروہوں کو پہنچائی

حرب سے بھی درجہا زیادہ اہم قبیلہ ثمر ہے۔ جو رشیدی خاندان ابیسویں صدی کے آخری حصے میں وسط عرب پر قابض رہا۔ اس کا تعلق ثمر ہی سے تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر حائل کے ارد گرد رہتے ہیں، لیکن شمالی جانب ان کا سلسلہ بہت دور شام اور عراق تک چلا جاتا ہے۔ ثمر کا آخری بڑا سردار عبدالعزیز ابن متعب تھا جو ۱۹۰۶ء تک حکمران رہا۔ وہ بڑا بہادر آدمی تھا۔ درست اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دشمن اس سے ڈرتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ایک رات وہ ابن سعود سے جنگ کی تیاری کے سلسلے میں فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اتفاق سے رات بھول گیا۔ اور ابن سعود کے خیمے کو اپنا خیمہ سمجھ کر چلا جا رہا تھا کہ مارا گیا۔ ثمر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے طرفدار ہو کر لڑے، لیکن ان کی قیادت بدر سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ نومبر ۱۹۲۱ء کو انہوں نے ابن سعود کی اطاعت قبول کر لی۔

دولت سعودیہ کے شمالی و مشرقی گوشے میں کویت سے قریب قبیلہ مطیر آباد ہے۔ یہ لوگ بڑے فیور اور جنگجو ہیں۔ اور مرحوم شاہ ابن سعود کے لیے خاصی مصیبت کا باعث بنے رہے۔ یہ امر توجہ طلب ہے کہ خوان کی زیادہ تعداد قبیلہ مطیر ہی میں سے تھی۔ مطیر کے جنوب میں مبحان رہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان اتحاد تھا۔ اور ابن سعود کے خلاف جنگ میں انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔ مبحان ابتدا میں سین سٹے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ لوگ کویت سے ربح الخالی کے شمالی کناروں تک اپنے ریوڑ چرایا کرتے تھے اگرچہ یہ لوگ بیرونی لوگوں سے دغا بازی میں بھی تامل نہیں کرتے، لیکن لڑنے

میں بہت بہادریاں۔ انہوں نے ابن سعود کو کئی مرتبہ شکست دی۔ ایک لڑائی میں ابن سعود کا بھائی سعد مارا گیا۔ انجام کار یہ بھی مسخر ہو گئے۔

دہنار کے ویران ریگ زار سے آگے بڑھیں تو دریائے ریگ اور چھوٹی چھوٹی چھوٹی ساحلی پہاڑیوں کے درمیان ایک میدان آتا ہے۔ جس میں باریک کنکڑ چھبے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں گھاس کے ٹکڑے بھی ہیں۔ وہاں سیاہ میٹرل اور بادامی رنگ کے اونٹوں کے چلنے پھرنے کے وسیع نشان ملتے ہیں۔ یہ مناصیر قبیلے کا مقام ہے۔ جو قطر کی سرحد سے شمالی سمت میں عین تاق تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مناصیر عرب کے مشہور جنگجو قبیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور انہوں نے ہمایوں کو لوٹ کر بڑی دولت جمع کر لی تھی۔ اب بھی جگہ جگہ پچیس پچیس فٹ بلند گول برج دکھائی دیتے ہیں۔ جو ایک زمانے میں لگہ بالوں نے مناصیر سے بچاؤ کے لیے تعمیر کئے تھے۔ دولت سعودیہ کے اندر تو بڑے پُر امن طریق پر زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۸ء تک شیخ ابو ظہبی سے برسرِ پیکار تھے۔ ابو ظہبی عمان کے اس حصے میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کے ساتھ انگریزوں نے معاہدہ کر رکھا ہے۔

بدواً اجنبیوں کے ساتھ اس وقت تک سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہیں جب تک ان کے حلیف قبیلوں میں سے کوئی شخص اجنبیوں کی دہری کے لیے مائدہ نہ ہو۔ اگر ثابت ہو جائے کہ رہبر کا تعلق کسی حلیف قبیلے سے ہے۔ یا اس کے ساتھ قبیلے کا کوئی غوثی رشتہ ہے۔ تو سرد مہری کی جگہ گروشی لے لیتی ہے۔ اور اصرار کیا جاتا ہے۔ کہ مسافر ٹھہر جائے۔ عورتیں اور بچے نیچے میں ایک طرف

ہو جاتے ہیں عزیز قائلین بچھائیے جاتے ہیں اور قہوے کا دور شروع ہو جاتا ہے قہوے کے بعد مسافر کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور کم و بیش تین گھنٹوں میں مہمان کی شان کے لائق کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ بات چیت یا تو بارش اور گھاس کے متعلق ہوگی۔ یا بیٹریوں اور اونٹوں کے متعلق یا لڑائیوں کا ذکر چھڑ جائے گا۔ مسافر بادشاہ اہل کی کہنی بھر میں اچھا، قاہرہ وغیرہ کی خبریں سناتا ہے اگر کسی شہری عرب کو بتایا جائے کہ امید ہے۔ آپ سے واشنگٹن میں ملاقات ہوگی تو وہ اس ملاقات کی خوشی کے سلسلے میں بڑے دلکش الفاظ استعمال کرے گا، لیکن اگر کسی بد سے یہی بات کہی جائے تو وہ جواب دے گا اس ذکر سے کیا فائدہ ہو جانتے ہیں کہ میں کبھی واشنگٹن نہیں جا سکتا۔ گریادہ بتا دیتا ہے کہ فضولی باتوں میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

بدوں کے خیمے صحرائی زندگی کے عین مطابق بنائے جاتے ہیں۔ شام کے وقت ایک طرف کا پردہ اٹھا دیا جاتا ہے تاکہ ہوا اندر آنے لگے۔ یہ شیخ کا خیمہ کم و بیش پچھتر فٹ لمبا ہوتا ہے۔ گھومتے پھرنے کے لیے اس سے زیادہ بڑا خیمہ بنایا نہیں جا سکتا۔ خیموں میں چوبلیں ہی کے مطابق رسے استعمال ہوتے ہیں۔ بدوں کے خیمے عام طور پر دو یا تین حصوں میں بٹے رہتے ہیں۔ ان کے پردوں پر خوب کشیدہ کاری کی جاتی ہے یہ سب کام عورتوں کا ہوتا ہے۔ مردوں کے خیمے میں قائلین بچھائیے جاتے ہیں۔ اونٹ کیوں کے علاوہ کم از کم اونٹ کا ایک نین ضرور کھا جاتا ہے۔ اور چند نبدہاں لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ قہوہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ قہوے میں پن کے لئے قہوہ دو رتوں سے توڑا جاتا ہے تو پتے کی طرح اس کے دانے ہوتے ہیں۔ انہیں بن کہتے ہیں اسے کرکٹ گرم پانی میں جوش دیا جاتا ہے۔ قہوہ تیار ہوتا ہے عرب بدوں میں فرنگی کی طرح قہوے کے سفوف کا دستور نہیں۔

علاوہ الائچی ڈالی جاتی ہے۔ آگ جلنے کے لئے لکڑی اور اونٹ کی بینگیاں استعمال کرتے ہیں۔ عورتوں والے حصے میں مہوڑا چھوٹے چھوٹے قالین اور پرانی چٹائیاں ہوتی ہیں ان کے علاوہ کھانے کے برتن، کھجور، چینی، آٹا اور دوسری ضرورت کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ عام دستور یہ ہے کہ عورتوں کا حصہ خیمے کی انتہائی مغرب جانب ہوتا ہے۔ جہاں گرمی کے موسم میں بھی ہوا آتی جاتی رہتی ہے۔ شکا ری کتے عورتوں والے حصے میں بھی آجا سکتے ہیں، لیکن جو کتے نگہبانی کرتے ہیں، وہ ہمیشہ خیموں کے باہر رہتے ہیں۔ خیمے مہوڑا اس جگہ لگائے جاتے ہیں۔ جہاں پانی اور چراگا ہیں قریب ہوں۔ ایک ہفتے یا دو ہفتے کے بعد خیمے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔

دولت سعودیہ کے صحرائی علاقے میں قدرتی وسائل ایسے نہیں جو بروں کے لئے کفایت کر سکیں۔ اور ان میں جو چیز کھانے کے قابل ملتی ہے کھا جاتے ہیں۔ تھوڑے کے سوا ہر چیز عورتیں پکاتی ہیں۔ پانی بھی وہی لاتی ہیں۔ البتہ اگر پانی فاصلے پر ہو تو اس کا لانا گلابوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

پانی سے بدرجہا زیادہ مقدار میں اونٹ کا دودھ پیا جاتا ہے۔ دودھ یا تو تازہ تازہ پی لیا جاتا ہے۔ یا اسے چمڑے کے ایک مشکیرے میں بھر کر رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس میں ترشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشروب گرم آب دہا میں حد سے کئے لیے بہت سازگار ہوتا ہے۔ خانہ بدوش مہوڑا اپنے گلوں اور لیلوں کو لسی چاگا ہوں کی تلاش میں لیے پھرتے رہتے ہیں۔

خمس تالوں میں رہنے والے عرب باشندوں کی عام غذا کھجور ہے وہ بدو بھی کھجوریں ہی استعمال کرتے ہیں، جو ضرورت کے مطابق جنس مہیا کر لیتے ہیں۔ کھجوریں

ناہتے، دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے میں استعمال ہوتی ہیں بیض بدوئل
 نے ان نخلستانوں پر قبضہ جمارکھا ہے جہاں کوئی نہیں رہتا۔ وہ سال میں دو مرتبہ
 ایسے نخلستانوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھل آنے کے وقت، دوسری مرتبہ پھل پکنے
 کے وقت۔ دولت مند گھرانوں میں معمولاً روٹی کھائی جاتی ہے، لیکن بدوئل کے دو
 تہائی خاندان بہ مشکل سال بھر میں ایک مرتبہ روٹی پکاتے ہیں۔ بیض بدوئل نے
 زندگی میں صرف ایک آدھ مرتبہ روٹی پکائی ہوگی۔ عام طریقہ یہ ہے کہ گندم سے
 آٹے کو خوب پھیلا لیا جاتا ہے۔ پک چکنے کے بعد دہی روٹی رکابی کے طور پر استعمال
 ہوتی ہے۔ سہی کانٹے، چمچے اور رو مال کا کام دیتی ہے۔ گرمی کے موسم میں عموماً
 خمیر کے بغیر روٹی پکائی جاتی ہے۔ سرسوی میں شام کے وقت آٹے میں خمیر ملا دیا
 جاتا ہے۔ اور دوسرے دن روٹی پختی ہے۔ اکثر بدوئلے میں نمک اور پانی ملا
 کر اسے جوش دے لیتے ہیں۔ اس طرح ایک پیلا سا مرکب تیار ہو جاتا ہے جو شام
 کے کھانے میں استعمال ہوتا ہے۔ عرب میں گیموں بہت ہنگے ہیں۔ خربیدہ باجوہ،
 چنے، اکنی کا آٹا استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات تلوں کا آٹا گھی اور پانی میں
 گوندھ کر دیے کی طرح پکا لیتے ہیں۔

چاول عرب میں بہت زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ بدوئل کے لیے یہ بڑا امیرانہ
 کھانا ہے۔ چنانچہ وہ چاول کم کھاتے ہیں۔ ان کی ایک غذا ”بسبیسہ“ کہلاتی ہے
 یہ پیلا سا حیرہ ہوتا ہے جو آٹے اور شہد سے بنا ہے۔ ایک کھانا ”دروہہ“
 ہے۔ جو روئل کو آٹے اور گھی میں ابال کر پیلا سا حیرہ بنا لیا جاتا ہے۔ ایک کھانے

کا نام سمجھتا ہے ، یعنی روٹی کو دودھ میں االایا جاتا ہے ۔ اور اس پر اونٹ کی چربی پھیلائی جاتی ہے ۔

بدو ٹڈیاں بھی بڑے مزے سے کھاتے ہیں ۔ عرب میں فعلیں زیادہ نہیں پڑتی جتنیں ۔ جہاں پڑتی جاتی ہیں ، وہاں ہر وقت ٹڈی دل کا خطرہ لگا رہتا ہے جس شخص نے عرب میں سفر کیا ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ دل جب آتے ہیں تو کس طرح فضائتا ریک ہو جاتی ہے ۔ امریکی ماہرین ان کی بیخ کنی کے لیے سا لہا سال تک کوشش کرتے رہے ۔ اور جبکہ میں ان کا ایک مستقل دفتر قائم ہو گیا تھا ۔ جہاں سے صحرائوں میں پھرنے والے ٹوک کیت سے مین اور عقبہ سے عمان تک گشت کرتے رہتے تھے ۔ انھوں نے ملک کے اندر ہزاروں میل کا سفر کیا ان لوگوں کو ایک مشکل یہ پیش آئی کہ بدو ٹڈیاں پسند کرتے تھے ۔ اور انہیں ختم کرنے پر سخت مقررہ ہوتے تھے ۔ حب ٹڈیوں کا دل آتا ہے تو پورا قبیلہ خیرل سے باہر نکل کر انہیں مارنے لگ جاتا ہے ۔ اس طرح بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں ۔ انہیں دھوپ میں سکھا کر آٹے کی طرح پس لیا جاتا ہے یا دھاگوں میں پرو لیا جاتا ہے ۔ تاکہ ضرورت کے وقت کھایا جاسکے ۔

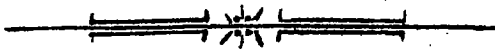
عربی امریکی تیل کی کمپنی نے شروع میں جن بدوؤں کو ملازم رکھا ، یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ بہت جلد محکم جاتے تھے ۔ اور آٹھ گھنٹے کی مقررہ میعاد مزدوری پوری نہیں کر سکتے تھے کمپنی نے چھ مہینے تک انہیں گشت کھلایا تو وہ بہت ترقی ہو گئے ۔ بحالت موجودہ بدو گائے کا گوشت بالکل نہیں کھاتے اس لیے کہ عرب میں ایسی چراگاہیں ہی نہیں ہو گائے کی بدوؤں کے شگایت کر سکیں ۔

بھیڑیں، بکریاں اور اونٹ اتنی قیمتی جنسیں ہیں کہ بدواً انھیں صرف خاص تقریبات پر فوج کرتے ہیں، البتہ وہ غزال، موہرا اور اس قسم کے دوسرے شکار ضرور کھاتے ہیں جو لوگ بلیغ فارس یا بحیرہ قلزم کے قریب رہتے ہیں وہ مختلف قسم کی مچھلیاں بھی استعمال کرتے ہیں۔

تاہم یہ واضح کر دینا چاہیے کہ قبائلیوں کی خوراک بہت سادہ ہوتی ہے۔ ناشتے میں عموماً مسطحی بھر کھینچیں کھائی جاتی ہیں۔ دوپہر کا کھانا دوپہر کے کسی قدر پہلے کھالیا جاتا ہے اس میں اونٹ کا دودھ استعمال کرتے ہیں۔ رات کا کھانا اصل کھانا ہوتا ہے۔ جو سوکھا ڈوبنے کے بخوڑی دیر لید کھایا جاتا ہے۔ جن کھانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ زیادہ تر لوات ہی کے کھانے ہیں کھائے جاتے ہیں۔

کھانا مختلف ٹکڑیوں میں کھایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے سن رسیدہ آدمیوں کی باری ملتی ہے۔ اور جوان اٹھنے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ پھر جوان آدمیوں کی باری آتی ہے سب سے آخر میں عورتیں اور بچے کھاتے ہیں۔ ان کا مشرب صرف تہوہ ہے۔

بدوؤں کی زندگی سخت مشکلات میں گزرتی ہے اور وہ ہر اس شخص کو حقیر سمجھتے ہیں جو ان کی طرح جفاکشی کی زندگی بسر نہ کرے۔ اگرچہ ان کے پاس کھانے اور پہننے کا سامان بہت کم ہوتا ہے تاہم وہ کسی کی خدمت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ البتہ موسم شاہ ابن سعود موجودہ شاہ سعود، شیخ کویت یا دوسرے ومارے شخصے ضرور قبول کر لیتے تھے۔ بدوؤں کی چیزوں کی بہت قدر کرتے ہیں، اولاً خرفہ وغیرہ سے خود داری اور حب وطن کا مرکب سمجھا جاتا ہے، دوم خاندانی عزت جس کا تعلق زیادہ تر منکورات سے ہے، سوم ہمان داری اور ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک جنھیں خاندان کا بزدمان لیا جائے۔



ساتواں باب:

نخلستان نشین

دہانے اپنی مشرقی جانب سرخ ریت کے بے ترتیب ٹکڑے ایک سنگلاخ سطح مرتفع پر بکھیر دیے ہیں۔ مسافر کا ٹرک درگھنٹے تک اس خطے میں چلتا رہتا ہے۔ پھر پانی کا ایک ذخیرہ آتا ہے جس کے ساتھ کچھ مازیں اور خیمے ہیں۔ یہ مقام آسانی کہلاتا ہے۔ یہاں ٹرک کے پتیل کا ذخیرہ بھی موجود ہے اور معمولی موت بھی ہو جاتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں عربی امریکی فیل کیمپ نے یہاں اونٹنوں کے لیے پانی کا ایک کنواں تیار کر دیا تھا۔ یہی کنواں آج کل ان ٹرکوں کی منزل ہے، جو ضرورت کی چیزیں معفوت سے دریافت کر رہے ہیں۔ اس کنوئیں کے ارد گرد ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہو گیا ہے۔ مسافر اہائی پہنچ کر ٹرک سے اتارتا ہے۔ اور سیشن والے سے اپنا تعارف کراتا ہے۔ اس کو کچھ کھانے کے لیے مل جاتا ہے۔ پینے کے لیے توہ بھی ہوتا ہے اور کوکا کولا بھی یہاں ٹرکوں والے بھی صحیح ہو جاتے ہیں اور اونٹنوں والے بھی اور اس

امر پوچھتے تھے کہ حجب و نام سے ریاض تک ریل چلنے لگے گی تو ایسا وقت
 بھی اوتوں اور بڑوں کو سامان لانے لے جانے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟
 شام کی خنکی میں موٹر کا سفر بہت خوشگوار ہوتا ہے، اس لیے کہ انجن
 یا ربار گرم نہ ہوگا اور موٹر کی رفتار کم و بیش چالیس میل فی گھنٹہ دکھی جائیگی۔
 الہائی سے ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ان پر روشنی کی جھلک نمودار
 ہوتی ہے۔ یہ مقام عین واقع ہے، جہاں تیل کا بہت بڑا چشمہ ہے۔ زمین سے تیل نکلتا
 ہے اس میں گیس شامل ہوتی ہے جسے بہت مضر سمجھا جاتا ہے۔ اس مقام پر گیس
 کو تیل سے الگ کرتے ہیں اور وہاں سے گیس پائپ کے ذریعے سے قصبے
 کے ایک کنارے پہنچا دی گئی ہے۔ اسی گیس سے ان میناروں میں روشنی ہوتی
 ہے، جو اتنی آستنی میل کے فاصلے سے نظر آتے ہیں جیسے جیسے تیل کے چشمے
 مغربی جانب نکلتے آتے ہیں ان میناروں کی روشنی بھی آگے آگے بڑھتی جاتی ہے
 موٹر پھرتی ہوئی بجیڑوں کے ریوڑ سے جتنی سچائی دو گھنٹے میں منہ فوٹ
 کے مغربی دروازے پہنچ جاتی ہے۔ یہ عرب کا سب سے بڑا نخلستان ہے جہاں
 دولت سعودیہ کے قریباً ایک لاکھ افراد کھجوریں کے جھنڈوں اور متحدہ شہروں
 کے پانیوں کے کنارے رہتے ہیں۔ شہر کے بیرونی حصے میں دو عرب پاسبی ٹرکس
 پاسبانوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ مسافر کو ابن سعود کے وزیر مال شیخ
 عبداللہ سلیمان کے محل پر پہنچا دیتے ہیں محل کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ وہ مہدوں
 کے کندوں سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ دربان بیدار ہوتا ہے۔ ساتھی ایک
 درجن نوکر کو کہہ جاتا ہے۔ دروازہ چونکہ تنگ ہے اس لیے اس میں سے ٹرک
 نکالنا ہے کہ یہ صدمہ اس وقت تک کھایا جاتا ہے جب تک کہ مکمل نہیں ہوئی تھی۔

نہیں گزر سکتا۔ مسافر اگر اندر چلے جاتے ہیں۔ ملازم سامان اٹھالتے ہیں۔ اس طرح یہ گروہ اندرون دروازے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں روشنی موجود ہے۔

ایک چوڑے زینے پر چڑھتے ہوئے مسافر دوسری منزل پر چلے جاتے ہیں۔ ان ملازم مسافروں کا منہ ہاتھ دھلاتے ہیں۔ پھر وہ ایک اور زینے پر چڑھتے ہوئے چھت پر چلے جاتے ہیں۔ جہاں نہایت عمارتِ قالیبن بچھے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک گھنٹے تک تھوڑے کا دور چلتا ہے اور یہ کاری افسروں سے باتیں ہوتی ہیں۔ سر پر تارے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ارد گرد کے کنوئیں چلنے کی آواز شب بھر جاری رہتی ہے۔ پھر مسافر کھانے کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے ہیں۔ دروازے پر تین ملازم ٹھہرے رہتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں پانی کا آفتابہ ہوتا ہے دوسرے کے ہاتھ میں سیلابچی اور تیسرے کے ہاتھ میں تریہ۔ ہاتھ منہ دھو کر مسافر اندر جاتے ہیں۔ فرش پر دسترخوان بچھا ہوتا ہے جو کم و بیش بیس فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا ہوگا۔ ان کے سامنے بڑے بڑے قابوں میں سالم بخنے ہوئے دنبے لگ جاتے ہیں جن سے بخنی نکل نکل کر چاولوں میں گرتی ہے۔ ان کے علاوہ مٹر، لہ بیا، آلو، ٹماٹر، چاول شوربا، مرغ وغیرہ مختلف پلیٹوں میں لگے ہوتے ہیں۔ چھری، کانٹا یا چمچ استعمال نہیں کیے جاتے۔ ہاتھ سے سب کچھ کھانا پڑتا ہے۔ ہر نشست پر کم و بیش دس مختلف کھانے پیش کیے جاتے ہیں۔ بخوف کی کھجوریں اور دوسرے میوے ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں سے صرف ایک حصہ ہی کھایا جاتا ہے، لیکن عرب میں کھانا ضائع نہیں ہوتا۔ بیرونی مہمان اٹھ جاتے ہیں اور ہاتھ دھو کر چھت پر جا بیٹھتے ہیں، تو عرب مہمان کھانے کے کمرے میں پہنچ جاتے

جاتے ہیں۔ وہ کھا چکے ہیں تو باقی غذا مردوں اور بچوں کی قیامگاہوں میں پہنچادی جاتی ہے۔
 سب سے آخر میں گھر کے ملازم اور ان کے بیکھرے باہر کے ملازم اور غلام کھاتے ہیں اس
 طرح ایک وقت کا کھانا کم درمیش بچا پس یا اس سے بھی زیادہ آدمی کھاتے ہیں۔ عرب
 میزبان مہمانوں سے یہ پرہیز کی تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ آپ کیا کھائیں گے جو کچھ
 اس کے پاس ہوتا ہے، وہ ستر خوان پر لگا دیتا ہے آپ جو چیز کھانا چاہیں کھا لیں بھت
 پر پہنچ کر مسافر با مہمان سو جاتے ہیں۔ صبح موزن کی صدا انہیں بیدار کرتی ہے اور باقی
 ہے کہ نماز سونے سے پہلے ہے۔ (الصلوات خیر من النوم) ناشتے میں انڈوں کے
 علاوہ ٹماٹر، چاول، کھجوریں اور تھوہ ہوتا ہے۔

ہم لوگ ناشتے کے بعد الحسا کے سخت گیر اور کم سخن امیر سعود بن جلوی کے محل
 کی طرف روانہ ہوئے۔ دربار کے باب داخلہ کے اندر میں جنگجو آلتی پالتی مارے
 بیٹھے تھے اور چہروں سے بڑے ورشت خون نظر آتے تھے۔ ہم ان سے گزرتے
 ہوئے پنجاہ سالہ امیر کے پاس پہنچے اور مصافحہ کیا۔ امیر متوسط قد کا آدمی ہے
 داڑھی بالکل سیاہ، ناک لمبی، آنکھوں سے سردھری اور درشت چٹکتی تھی۔
 امیر کا والد عبداللہ ابن جلوی مرحوم شاہ ابن سعود کا عزیز ترین دوست تھا۔
 جنوری ۱۹۰۲ء کے واقعے میں وہ مرحوم بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد ہی
 عبدالعزیز اس شاہراہ پر روانہ ہوا جسے عرب کے بہت بڑے حصے کا مالک بنا
 دینے والی تھی۔ عبداللہ بن جلوی نے ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ سعود بن جلوی
 بہت آہستہ بات کرتا ہے۔ اتنا آہستہ کہ آواز کانوں تک بمشکل پہنچتی ہے۔
 جیسا کہ طبیعت، ناساز ہو تو محض شکریہ کے دو حرف ادا کر دیتا ہے۔ یا مزار پر

کہ لیتا ہے جب مزاج درست ہو تو اس کی رفیقانہ باتیں دل پر اس طرح نقش
 ہو جاتی ہیں کہ مدت تک یاد رہتی ہیں۔ گفتگو میں کبھی یہ ذکر آ جاتا ہے کہ ہر کیلے
 مینہ پر سنانے کے جو تجربے کر لیے ہیں، آیا ان سے عرب میں بھی کام لینا ممکن
 ہو گا۔ کبھی الحسا میں عدل و انصاف کے اختیار کر وہ طریقوں کا ذکر آ جاتا
 ہے۔ امیر سعود بن جلوی اسلامی شریعت کے مطابق عدل و انصاف میں خاص
 شہرت کا مالک ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آج عرب میں لوگ اس سے
 زیادہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ یقیناً اس نے صوبہ الحسا میں قیام امن کمال پر
 پہنچا دیا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی ڈرائیو رہتا بھی صحرائیں رات گزارے تو
 اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا، حالانکہ پہلے مسلح محافظوں کا ایک جتھا بھی
 کسی کے لیے یقینی حفاظت کا ذریعہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ کوئی شخص لرزہ بلانام
 ہوئے بغیر امیر کے سامنے قیدی کی حیثیت میں پیش ہونے کا تصور ہی نہیں کر
 سکتا۔ لیکن دوست کی حیثیت میں امیر غریب ہمان نوازی کی بلند ترین
 روایات پیش کرتا ہے۔

امیر نے اچانک آہستہ سے کہا ”تہوہ“۔ جو جنگجو دروازے کے پاس
 بیٹھے تھے انہوں نے پکار کر کہا ”تہوہ“ اسی طرح یہ آواز باورچی خانے تک جا
 پہنچی اور تہوہ آگیا، لیکن اب یہ طریقہ بھی بدل رہا ہے۔ اس لیے کہ امیر کے
 لئے حسن ظن قیام امن اور عدل میں خاص شہرت عبداللہ ابن جلوی نے حاصل کی تھی اور جب
 وہ زندہ تھا تو لوگ دولت سعودیہ میں اس سے زیادہ کسی سے ڈرتے تھے۔ بالکل وہی طرز
 میں سعود ابن عبداللہ ابن جلوی نے اختیار کیا۔

قریب ایک ٹن لگا دیا گیا ہے، جس کے دبانے ہی توہہ پلانے والا حاضر ہو جاتا ہے
 امیر کے سلام سے فارغ ہو کر ہم سفوف کے دورے پر روانہ ہوئے اور
 وہ چشمے دیکھے جو ننگستانوں کو سیراب کر رہے ہیں۔ ان میں سے بڑا چشمہ عین
 الحقل ہے جو ہر منٹ میں بائیس ہزار گیلن سے زیادہ ٹھنڈا اور خالص پانی نکالتا
 ہے۔ ایک اور چشمے پر غور سے فاصلے تک لڑا رہیں بنا دی گئی ہیں۔ یہ حصہ عورتوں
 کے غسل کے لیے وقف ہے۔ ایک تیسرے چشمے پر ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے اور اس
 تک سڑک تیار کر دی گئی ہے۔ یہ بنگلہ خاص بادشاہ کے استعمال کے لئے ہے۔ بہت
 سے چشموں کا پانی گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ عرب ان میں چھنا لگیں لگاتے ہیں اور
 مزے سے نہاتے ہیں۔ چشموں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں جو
 کچھ روں اور دوسرے میدانوں کے باغوں، نیز غلے اور ممبریوں کے کھیتوں کو
 سیراب کرتی ہے۔

باہر کا دورہ کر چکنے کے بعد ہم پھر شہر میں داخل ہوئے۔ داخلے کا دروازہ
 تنگ ہے اور محدود پیمانی والی پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ سامنے بڑی منڈی ہے
 جس میں ایک طرف اونٹوں کو گھٹنے باندھ کر بٹھا رکھا ہے۔ ایک مسقف اور ایک
 کھلا بازار ہے جو مال سے عرب قوم کے برتن اور دوسری چیزیں خریدتے
 ہیں۔ سفوف کے زیادہ تر مکان دو منزلے ہیں اور ان کی کھڑکیاں بازار کی
 طرف نہیں، بلکہ اندر صحن کی طرف کھلتی ہیں۔ بڑے مکانوں کے لیے مشرقی افریقہ
 سے شہتیر منگائے جاتے ہیں۔ چھوٹے مکانوں کے لیے کچھوڑ کے تنے استعمال
 ہوتے ہیں۔ کنبے کے افراد بطور جائیں تو نیا مکان بنوا لیتے ہیں۔ اگر نئے مکان

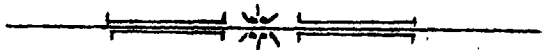
کے لیے زمین نہ مل سکے، تو چھت پر نئے کمرے تعمیر کرائے جانے لگے۔ ان کا زمین باہر کی طرف رکھا جاتا ہے۔ تعمیر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ دروازے کھڑکیاں اور شیشے خوب منتش ہوتے ہیں۔ چونکہ دیواریں بہت چوڑی رکھی جاتی ہیں اور ان میں کھڑکیاں کم ہوتی ہیں، اس لیے مکان گرمیوں کے موسم میں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں۔ میزوں اور کرسیوں کی جگہ کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے دیوان بنادیئے جاتے ہیں، جن پر رنگین گدے رکھے رہتے ہیں۔ لمبوں کے ذریعے سے کمروں میں روشنی آتی ہے۔ فرشوں پر ایمانی قالین بچھے ہوتے ہیں۔ غسل خانے عموماً چھوٹے دیکھے گئے۔ گرمیوں کے موسم میں عموماً چھتوں پر لوگ کھانا کھاتے ہیں اور وہیں سوتے ہیں۔ اگرچہ بازار اور گلیاں صاف نہیں ہوتیں، لیکن مکانوں کے اندر صفائی بہت اعلیٰ پیمانے پر دیکھی گئی ہے۔ البتہ بار بار دھوئی ٹی چھڑکنے کے باوجود دن کے وقت گھسیوں سے نجات ملتی ہے اور نہ رات کے وقت پھروں سے۔ عورتیں سخت پردہ کرتی ہیں۔ بچے دس سال کی عمر تک بے تکلف باہر آجاسکتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکے مردوں کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں، لڑکیاں گھر میں عورتوں کی مدد کرتی ہیں۔ کسی عورت کو ضرورت کے لیے باہر جانا ہوتا تو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتی۔ چونکہ پردے کی سخت پابندی ہے، اس لیے لڑکوں، لڑکیوں کی شادیاں ماں باپ ہی کرتے ہیں۔ شام کی تنگی میں ہفتوں کے بازار اور گلیاں کچا کچھ بھر جاتی ہیں۔ جب مولوں کی صداسجروں سے بلند ہوتی ہے۔ تو عرب سب کام کاج چھوڑ کر نماز ادا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ اول کلمہ توحید، دوم نماز، سوم زکوٰۃ، چہارم رمضان، پنجم حج، حج کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ اسے عام طور پر حج اکبر کہتے ہیں۔ حج اصغر یعنی عمرہ ہر وقت ادا کیا جاسکتا ہے۔ سو دیوں کے علاوہ حج کے لیے ہر سال ڈیڑھ لاکھ کے قریب آدمی مغرب میں مراکش تک سے اور مشرق میں نیپینز تک سے مکہ منظمہ آتے ہیں۔ اس طرح کروڑوں مسلمانوں کے فکر و نظریں ہر سال رحلت کا نظام ہوتا رہتا ہے۔ جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ محض ایک تہہ ہی قرینہ ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کا ایک بہت بڑا اجتماع بھی ہے۔ انہی پانچ ارکان اسلام کو مرکز بنا کر عربوں نے اپنی زندگی کا نقشہ تیار کیا۔

کھجور غالباً قدیم ترین زمانے سے عرب میں کاشت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ صدیوں سے یہ دستور ہے کہ جو ٹکوفے مادہ کھجور کے تنوں کی جڑوں میں پیدا ہوتے ہیں، انہیں الگ کر کے ریتیلی زمین میں لگا دیا جاتا ہے۔ دوسرے سال یہ مضبوط دھخت بن جاتے ہیں اور آٹھویں سال پھل دینے لگ جاتے ہیں یہی صوبی سال کھجور کا دھخت کمال پر پہنچ جاتا ہے اور اس کی عمر کم و بیش ایک سو سال ہوتی ہے۔ اسے نشو و نما دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ سر پر سورج کی روشنی پڑتی رہے اور جڑیں سیراب رکھی جائیں۔ اس کے لیے مینہ کی ضرورت نہیں، البتہ ہوا ضروری ہے جو اسے آراستہ کرتی رہتی ہے۔ پھل صرف مادہ کھجور کو لگتا ہے، لیکن وہ جو بخود پھل نہیں دے سکتی، لہذا کھجوروں کے جھنڈ میں چند زرد پے بھی لگا دیئے جاتے ہیں۔ جب موسم بہار کی ابتدا ہوتی ہے تو کھجوروں کا مالک یا اس کے کارکن چند خنوں کی ذریعہ زیرہ مادہ درختوں کے پوت میں بچھا دیتے ہیں اور اس طرح

پہل لگانا شروع ہو جاتا ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے گچھے ہوتے ہیں۔ جو پکنے پر دس دس بارہ بارہ سیر کے ہو جاتے ہیں۔ اگست میں کھجوریں ملائم، شیریں اور عدد درجہ نرم ہو جاتی ہیں، لیکن اگر اسی حالت میں انہیں باہر بھیج دیا جائے تو ستر جائیں گی۔ لہذا صرف وہی کھجوریں اگست میں اتاری جاتی ہیں جو مقامی استعمال کے لیے ضروری ہوں۔ باقی خوشے ستمبر تک درختوں ہی پر رہتے ہیں۔ اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں پوری کچی ہوئی کھجوروں میں انٹاؤن تی عدد شکستہ ہوتی ہے اور وہ آسانی سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ عرب میں کھجوروں کی ستر سے بھی زیادہ قسمیں ہیں۔ بعض صرف مقامی طور پر کھائی جاتی ہیں اور بعض باہر کے ملکوں میں بھی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں کھجور کے لیے پانسو سے بھی زیادہ الفاظ ہیں۔ مہفوف کی بہترین قسم وہ ہے، جسے ”خلص“ کہا جاتا ہے۔

کھجور سے اور کام بھی لیے جاتے ہیں۔ مثلاً اس کی گٹھلیاں میس کر جانوروں کو کھلائی جاتی ہیں۔ پتوں سے چٹائیاں بنتی ہیں۔ ریشوں سے رے بنتے ہیں۔ تنے مکان بناتے وقت قہنتیر کا کام دیتے ہیں۔ اور اس امر پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ خمس تناؤں میں رہنے والے لوگوں کو ”اہل عروا“ یا کھجوروں والے“ کہتے ہیں :



اس اجارے میں ایران کے پانچ شمالی صوبے مستثنیٰ رکھے گئے۔ سات سال تک کمپنی کے آدمی تلاش میں لگے رہے۔ آخر ۱۹۰۱ء میں مسجد سلیمان کے نزدیک ایک چشمہ مل گیا۔ اس کے بعد اینگلو پرسیان ائل کمپنی بن گئی۔ اور برطانوی کارکنوں نے ایران کے معظم اٹلان چشموں میں کام شروع کر دیا۔

چونکہ تیل کی ایک بہت بڑی مقدار تھی۔ اس لیے خلیج فارس کے علاقوں میں تیل کی تلاش کے لیے کشمکش زیادہ تیز ہو گئی۔ امریکہ کے ایک امیر البحر نے ترکی مقبوضات میں محمودی دیر کے لیے اجارہ لے لیا تھا۔ جرمنی اور برطانیہ کی فرموں نے عراق میں مراعات حاصل کیں۔ پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جرمن ان علاقوں سے نکالے گئے۔ فرانسیسی اور امریکی فرمیں اس کمپنی میں شامل ہو گئیں۔ جو عراق پٹرولیم کمپنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس میں بیشتر حصے اہل برطانیہ کے تھے۔ ایران و عراق کے چشمے بڑے وسیع ثابت ہوئے۔ اب تیل کا کاروبار کرنے والی فرمیں خلیج کے مغربی ساحل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایک فوجی افسر نے جو زمیندار بھی تھا اور تاجر بھی، خلیج بحرین اور ابن سعود سے اجاروں کے وعدے حاصل کر لیے۔ اس کا نام محمد فرینک ہو کر رہا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابن سعود کے تازہ تازہ الحصار فتح کیا تھا اور اجارہ اینگلو ایرانی ائل کمپنی کے حوالے کر دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ ابریل ۱۹۲۶ء تک کمپنی کے ماہرین اراضیات نے دیکھ بھال کے لیے Anglo Persian Oil Company بنو میں ملک کا نام ایران تجویز کیا۔ تو کمپنی کا نام اینگلو ایرانی ائل کمپنی ہو گیا۔

بعد فیصلہ کیا کہ بحرن یا مشرقی عرب میں تیل کے ایسے ذخیرے نہیں مل سکتے جن کی بنا پر دہاں کا روبا رو شرور ع کیا جاسکے۔ یہ مشورہ کوتر اندیشی پر مبنی تھا یہ سمجھو جو حرنے کیلئے نورینا کی ٹینڈر ڈاکل کمپنی سے بات چیت کی۔ چنانچہ اس کمپنی کے کارکنوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء کو بحرن میں ایک چشمہ دریافت کر لیا، جہاں سے کاروباری سامانے پر تیل حاصل کیا جاسکتا تھا اور عربی امریکی آئل کمپنی قائم ہو گئی۔ فریڈ ایس ڈیوڈ اس کمپنی کے بورڈ کا صدر تھا اس کی رہنمائی میں یہ کام انجام پایا۔ پھر دوسرے چشمے دریافت ہوئے تو واضح ہو گیا کہ بحرن کی زمین میں تیل کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ میکاس کمپنی کو بھی اس میں برابر کا حصے دار بنالیا گیا، اس لیے کہ وہ کمپنی تیل کی فروخت میں بہت سہولتیں پیدا کر سکتی تھی و بحرن میں کام آسان نہ تھا، کیونکہ گرمی حد سے زیادہ مٹی بیٹھان کیا جاتا ہے کہ کارکن بعض اوقات جوڑیے کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھ جاتے تاکہ سمندر کی حدود ہی بہت ہوا سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس دوران میں دو دہان لگا کر عرب کے ریلے ساحل کا بھی معائنہ کرتے رہتے تھے، جہاں چھوٹی چھوٹی بہاؤوں کا ایک سلسلہ واقع تھا۔ ایک خاص بہاؤ کی حدود نام گاؤں کے پیچھے واقع تھی ہمیشہ ان کی نظریں اپنی طرف پھینچتا، اس لیے کہ اس کی وضع قطع بحرن کی بہاؤوں ہی سی تھی۔

چنانچہ کمپنیوں نے پہلے بحرن سے کہا بعد ازاں عربیات کے مشہد ماہر سینٹ جان ملیس کی وساطت سے فائدہ اٹھا کر شاہ ابن سعود سے اجارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں شہزادہ کی انجینئرنگ کل لٹل

مجھے اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔ اسے شاہ ابن سعود نے پانی کے ذخیرے اور سونے کی کانیں دریافت کرنے کے کام پر لگایا تھا۔ اور بادشاہ سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ فروری ۱۹۳۳ء میں ٹیڈ میل تیل کے ایک بہت بڑے امریکی تاجروں لائوٹھ ملٹن کو لے کر حیدرہ پتیا تو حراتی پٹرولیم کمپنی کے مانیٹرنگ سائی عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے، جہاں ان لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ شاہ ابن سعود نے تمام حقائق کا اندازہ کرتے ہوئے امریکیوں کی شرکت کو ترجیح دی اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ملک کی اقتصادیات کو اس ملک سے وابستہ کیا جائے جو طاقتور بھی ہے اور دور واقع ہے۔ نیز اسے سامراج سے کوئی علاقہ نہیں اور وہاں تیل کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔

ہمارے کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا کہ یہاں متحدہ امریکہ نے معیار رطلان ختم کر دیا۔ اور ملک سے سونے کی برآمد روک دی گئی۔ ستائیسویں صدی میں ہوا گیا کہ شاہ ابن سعود کو سرنی ٹیل پر چار سو سو ٹنٹنگ یا ان کے برابر ڈالر یا پاؤنڈ دیئے جائیں گے۔ ابتدا میں اجاڑے کا دائرہ دو لاکھ اسی ہزار مربع میل تک محدود رکھا گیا تھا۔ بعد میں اسے بڑھا دیا گیا۔ اور مشرقی ساحل سے ہلالی شکل میں وہ پورا خطہ شامل کر لیا گیا۔ جو جنوبی سمت میں ریح الخالی سے گزرتا ہوا مغرب میں سرحدات یمن تک جاتا ہے۔ شاہ ابن سعود نے ۱۴۰۱ھ جولائی ۱۹۳۳ء کو اجاڑے کی تصدیق کر دی۔ ۱۹۳۹ء میں زمیندارہ رقبہ چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل تک پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں بعض اور کمپنیاں حصے دار بنائی گئیں تاکہ

برہمنی مزدین عرب میں سے گزرنے والی بائبل مان سچانے کے لیے سرلیہ فراہم ہو چلے۔ اس طرح خلیج فارس سے تیل براہ راست بحیرہ روم تک پہنچا دیا گیا۔
 انکشافی جماعتیں مرتب کرنے میں کچھ وقت لگا، اس لیے کہ دولت سعودیہ کے حالات بہت کم معلوم تھے۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں ابھرن کی پہلی جماعت دولت سعودیہ میں مجلس کے مقام پر لشکرِ اعزاز ہوئی، جو ظہران سے کوئے میل شمال میں ہے۔ ایک کچا مکان کرایے پر لے لیا گیا۔ فوجی یگان مہینے کے لیے تھے۔ ایک چھوٹی سی سفری ہیز ساتھ تھی۔ چند عسکروں کو ملازم رکھ کر اس کمپنی کا کام شروع کر دیا گیا۔

سب سے پہلے دوام کا جائزہ لیا گیا۔ پھر مخلصت، پارٹیاں لڑکوں میں یا اونٹوں پر مدار ہو کر اندرون ملک کی طرف بڑھیں۔ باریک نکتہ دیکھنے والے میدان یا پتھر سے علاقے میں تو موٹریں آسانی سے چلتی رہتی ہیں۔ لیکن جب متحرک ریت سے سافٹ ریڈیا تو پہلے ریت میں دھنس کر رک گئے۔ آخر خاص وضع کے ٹائرس حاصل کیے گئے۔ ان کی موٹائی اونٹ کے نقش پا اور اس کے بوجھ کی مناسبت سے تجویز ہوئی۔ تجربات کے بعد "اراکو" یعنی عربی امریکی کمپنی نے خاص ٹائرس تیار کر لیے اور اب موٹریں اپنے مکلف ہر طرف دوڑتی پھرتی ہیں۔

۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے موسم سرما میں تحقیقات اور دریافت کا کام

لے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ "اراکو" Arabian American Oil Company

کا مخفف ہے AR Arabia AM American سے

اور Company سے Co لے کر لفظ بنایا گیا ہے ARAMCO

جاری رہا۔ دو دو آدمیوں کی تین پارٹیاں مہفوف تک پھرنکلیں۔ کچھ رول، بکری کے گوشت اور آڈنٹ کے دو دھکے سوا ضرورت کی ہر چیز چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بحرین سے منگائی جاتی تھی۔ پینے کے پانی کا مسئلہ بڑا اہم تھا جب تک پانی کے لیے ایک تل کنواں تیار نہ کر لیا گیا، ضرورت کے مطابق پانی باہر سے بڑے بڑے کنستروں میں بھر کر لایا جاتا تھا۔

ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گودی بنانے کے لیے بہترین جگہ کونسی ہوگی۔ پہلے یہ خیال تھا کہ گودی دھام میں بنائی جائے پھر ایک چھوٹے سے گاؤں الخور کو اس غرض سے منتخب کیا گیا جو چند میل جنوب میں واقع تھا۔ چنانچہ وہاں گودی بنادی گئی۔ اب دولت سعودیہ کے مشرقی ساحل پر چار گودیاں ہیں۔ ایک دھام میں جو سات میل لمبی ہے، دوسری راس تنورہ میں جہاں سے تیل لادا جاتا ہے دو چھوٹی گودیاں اور ہیں۔ ایک الخور میں اور دوسری راس المسقب میں۔

۲۶۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ایک اور پارٹی الخور میں اتری اور سات میل اندر کا کہ خیمہ زن ہوئی، جہاں آج کل نظر آن کے ہوئی اڈے کو جانے والی سڑک الخور والی شاہراہ میں ملتی ہے۔ یہ مقام صرف پانی کے قرب کے باعث مناسب سمجھا گیا تھا۔ پارٹی کے پاس کل چار خیمے تھے۔ ایک میں مینی باورچی کھانا پکاتا اور سوتا تھا، دوسرے میں پارٹی کے لوگ کھانا کھاتے تھے۔ تیسرے میں سوتے تھے۔ اور چوتھا دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جس میں ضرورت کی چیزیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ وہ لوگ بحرین سے دو پیر پہلے وہیں اپنے ساتھ لائے تھے

Turkey جیجے قبل رٹ ایروپتے ہیں۔

تاکہ نوروز کی دعوت میں مستحال کریں۔ عرب ان پرندوں کو بیسے شوق کئی نکاحوں سے دیکھتے تھے۔ ۳۰ دسمبر کو دونوں بیروغائب ہو گئے اور شبہ یہ ہوا کہ عرب خرمد اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تلاش کی گئی تو پتا چلا کہ دونوں بیروگتے نے کھالیئے اور واقفان سے ایک کنویں میں گر کر مر گیا۔ کنوئیں سے نکالا گیا تو واقعہ درست ثابت ہوا اور کنیوں کے کانٹوں کو نوروز پرورد کے بغیر ہی گزارنا پڑا۔

پہلے پہل الخویر سے ایک معمولی سڑک اس چٹھے تک تیار کر لی گئی جہاں تیل دیانت ہوا تھا۔ یہ مقام آج کل ظہران مشہور ہے۔ یہ سڑک چار میل لمبی تھی۔ پھر کارکنوں کے لینے دفتر اور رہنے پہنے کے لینے مکان الخویر میں بنائے گئے۔ ساتھ ساتھ نفقش اور دیانت کا کام جاری رہا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پہلا چشمہ برابا گیا۔ اگست میں تیل نمودار ہوا۔ دسمبر میں برانے کا سلسلہ اس سطح پر پہنچا جہاں بحرن میں تیل ملا تھا اور معلوم ہوا کہ وہاں تیل کم ہے البتہ گیس کی مقدار بڑی خاصی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ایک چٹھے سے نیل نکل کر اوپر اچھلنے لگا تو ٹوڑی دیر کے لئے خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر تک کھول ڈال خرچ ہو چکے تھے۔ اور شدید محنت و مشقت اٹھا چکنے کے باوجود یہی نظر آ رہا تھا۔ کہ مشرقی عرب میں تیل نہیں، صرف ریت کے ٹیلے ہیں۔ آخر برانے کا سلسلہ چار ہزار چھ سو فٹ کی لہریں تک پہنچا دیا گیا تب پھر کچھ نہ نکلا ہر طرف سے یا اس ہو کر براغزیر لہریں پہنچا دیا گیا اور ابھی ۱۹۳۷ء میں تیل کے وسیع ذخیرے مل گئے۔ مدت رات میں پوری صورت حال بالکل بدل گئی مولے اور آدمیوں کا بلا شروع ہو گیا۔ چشمے برائے گئے پرانے چشموں کو مزید گہرا کر دیا گیا ظہران سے الخویر تک پائپ لائن بنادی گئی۔ ساتھ ہی تیل کے ذخیرے کی ٹینکیاں تیار ہو گئیں۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں ساحل عرب کا تیل پہلی مرتبہ بحرین پہنچا۔ دولت سعودیہ کو اقرار کے مطابق

پچاس ہزار منہری پاؤں ڈرامٹی کے دیئے گئے۔

مئی ۱۹۳۹ء میں ایک تقریب ترتیب دی گئی جس کا مدعا یہ تھا کہ تیل ہند میں سے گزرنے والی پائپ لائن میں سے کیلی فورنیا کی کمپنی کے ایک ٹینکر ٹک پہنچایا جائے۔ اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے شاہ ابن سعود کو دعوت دی گئی۔ اس غرض سے خمیوں کا ایک ٹھہرا باد ہو گیا۔ مئی ۱۹۳۹ء میں شاہ ابن سعود اور ان کے رفیق چار سو موٹروں میں اس منورہ پہنچے اور یہ رسم ادا ہوئی۔ پھر ظہران کے شمال میں ایک مقام پر تیل مل گیا۔ اسی طرح عقباق میں تیل کے چشمے دریافت ہوئے جو پچالیس میل مغرب میں ریت کے ٹیلوں کے اندر واقع۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور تجارت کے علم ہاتھ رک گئے چنانچہ عرب کا تیل افریقہ کا پیکہ کاٹتے ہوئے اوقیانوس کے پار پہنچایا جاتا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں ایک مرتبہ نصف درجن اطالوی بم بارہا زول نے بحرین اور ظہران پر بم بھی برسائے تھے اور تیل کی ایک لائن بھی توڑ ڈالی تھی۔ اس سے زیادہ نہ نقصان ہوا نہ کوئی موت ہوئی۔ ظہران سے وہ ریل آٹھالی کی طرف نکل گئے جہاں سے اس امر واقع اور کربا پہنچنا چاہتے تھے۔ بعض راستے میں گر بھی گئے عاس لیے کہ بد کئی جہازوں کے گرنے کی دلدل میں پہنچا تے رہے۔

جنگ کی وجہ سے تیل کے کاروبار میں توسیع کا سلسلہ رکا رہا۔ با اس ہمہ روزانہ بارہ ہزار ٹیل میل روزانہ حیرت برہ بحرین پہنچتا تھا۔ امریکہ کے بہت سے

Barrel لے کر بیسے یا کتر کو کہتے ہیں اور عام انداز سے کے مطابق اس میں پانچ کبب ڈیل آتا ہے۔

کارکن واپس چلے گئے عذر تین اور بچے کراچی اور بمبئی بھجوا دیئے گئے۔
 اس زمانے میں "اراکو" کے اجارے کی حیثیت چندال امید افزا نہ تھی۔
 عراق میں بغاوت ہوئی جس سے واضح ہو گیا کہ عربی دنیا کے بعض حصوں میں
 بے اطمینانی موجود ہے۔ جنرل روئیل شمالی افریقہ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا،
 جہاں سے وہ کسی بھی وقت وادی نیل سے گزر کر آگے بڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ
 کمپنی کے بڑے بڑے کارکن کام کاج چھوڑ کر چلے گئے۔ ۱۹۲۶ء کے اخیر میں
 ساحل نفل کی امریکی آبادی باقوے افراد سے زیادہ نہ تھی جب روئیل کی پیش
 قدمی رک گئی اور امریکہ کی جنگل مشینری کا پورا پورا تیل کا محتاج ہوا۔ تو پھر دولت
 سعودیہ پر توجہ مبذول ہوئی۔ یہ بھی مانا گیا کہ اراکو کا سارا کاروبار حکومت خرید لینا
 چاہتے ہیں۔ کم از کم وہ اس بات کے حق میں ضرور تھی کہ ظہران سے بحیرہ روم تک
 اپنے خرچ پر پائپ لائن بچھا دے۔ چنانچہ پھر بڑی سرگرمی سے کام شروع
 ہو گیا۔

۱۹۳۹ء میں تیل صاف کرنے کی ایک مشین مکمل ہو چکی تھی جس میں ہزار
 بیرل تیل روزانہ صاف ہو سکتا تھا لیکن دولت سعودیہ میں اس سے بڑی مشین
 کی ضرورت تھی، چنانچہ نو مہینے کی کوشش سے اس طورہ میں ایک ایسا کاخانہ
 مکمل کر دیا گیا جس میں روزانہ سچاس ہزار بیرل تیل صاف ہو سکتا تھا۔ اس
 کاخانے نے ستمبر ۱۹۴۵ء میں کام شروع کیا اور سبکل یہ ایک لاکھ تیس ہزار بیرل
 تیل صاف کرتا ہے۔

ساحل کے ساتھ ساتھ نئے قصبے آباد ہو گئے ہیں۔ خصوصاً ظہران اس

تتو رہ اور عقالت۔ ان میں ہر ملک پر جابجا نشان لگے ہوئے ہیں، ان میں دو
 زبانیں استعمال کی گئی ہیں، یعنی انگریزی اور عربی۔ کمپنی کے مکانوں میں کمروں
 کو ٹھنڈا رکھنے کا انتظام ہے۔ وہاں ڈاسٹنگ ہال بھی ہیں، تھینڈر بھی، کھیلوں
 کے کمرے بھی، اور تفریحی مرکز بھی ہر قصبے کے ساتھ نہانے کے ٹینک ہیں۔
 ٹینس اور کرکٹ کھیلنے کے میدان ہیں۔ سیکڑوں آرام دہ نیگلول میں بحلی
 لگی ہوئی ہے اور دورِ حاضر کے تمدن کی تمام آرائشیں اور مہولتیں موجود
 ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ کے باشندے معتدل آب و ہوا میں کام کرتے ہیں۔
 اسی آب و ہوا میں کھلتے پھرتے ہیں۔ اسی میں سوتے ہیں۔ حالانکہ عرب کے موسم
 گرم ہیں درجہ حرارت ۱۲۰ سے کم نہیں ہوتا اور سردیوں میں درجہ انجماد
 کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ بارش کا اور سڑے تین انچ ہے۔ ظہران میں
 بڑی گہرائی سے پینے کا پانی حاصل کیا گیا ہے، جو پوری آبادی کے لیے
 کفایت کرتا ہے۔ ہر گرم لوگوں نے اپنے نیگلول میں پھدلول اور سبزے کا
 انتظام کر لیا ہے۔ جن کارکنوں کی تنخواہیں کم ہیں، ان کے لیے ٹھنڈے
 کمروں کا انتظام ہے اور یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے بالی بچوں کو اس وقت تک
 نہیں لاتے جب تک چوبیس مہینے کی مدت ملازمت پوری نہ کر لیں۔ اس دوران
 میں کمپنی نے مکان تیار کرتی جاتی ہے چنانچہ سوڈین سے ایسے مکان
 منگوائے گئے ہیں جن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔
 مقامی پتھروں سے بھی کچھ مکان بنادئیے گئے ہیں۔ تاکہ ضرورت پوری ہو سکے۔
 ۱۹۵۷ء میں تین ہزار سات سو امریکی ملازم دولت سعودیہ میں موجود تھے۔

پانسو سے زائد بیویاں اور چار سو کے قریب بچے تھے۔ عورتیں ایسے منجکوں میں رہتی ہیں جنہیں ٹھنڈا رکھنے کا خاص انتظام کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنے بھرنی بھرنی یعنی یا منہ دستانی ملازموں کی مدد سے گھر کا کام کاج پورا کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے کلیوں اور پارٹیوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ دقتاً وقتاً گانے کی مجلس منعقد ہوتی ہیں۔ پھولوں کی نمائش ہوتی ہے۔ کبھی کبھار مختلف ضرورتوں کے لیے مادی کام شروع کر دیتی ہیں۔

ظہران اور راس تنورہ میں دسے دسے سینا بن گئے ہیں۔ ٹیکیاں اور بیس چلتی ہیں۔ ٹیلیفون کا نظام موجود ہے۔ چار انجنوں والے ہوائی جہاز امریکہ آتے جاتے ہیں۔ دھام اور انخویر میں ضرورت کی چیزیں بے تکلف خریدی جاسکتی ہیں۔ ظہران کی پرواز گاہ میں حکومت نے ایک درمیانے درجے کا ہوٹل بھی بنادیا ہے جس میں آنے جانے والے لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ امریکی لوگ فرصت کے اوقات میں ہفتوں پہلے جاتے ہیں۔ تاکہ عربوں کے طریق بود و ماند کے متعلق اطلاعات حاصل کریں۔ کبھی شتیوں میں بیٹھ کر بحرین پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے مورتی، ایرانی قالین یا دوسری چیزیں خرید لاتے ہیں۔ باتانج سے بیشتر کے قبرستانوں اور پرانے پرتگیزی کھنڈے کو دیکھتے ہیں۔ دھام کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مل جل کر آبادی کا ایک ایسا مرکز بن جائے جہاں تعلیم یافتہ عرب قیام پذیر ہو سکیں۔ وہ اب نہ تو امریکیوں میں رہنا اپنے لیے موزوں سمجھتے ہیں اور نہ غیر تعلیم یافتہ مقامی آبادی میں گزارا کر سکتے ہیں۔

تمام امریکینڈی کو جو میں مہینے کی ملازمت پوری کرنے پر چودہ روز کی رخصت
پر تنخواہ کے ساتھ ملتی ہے۔ اور یہ تنخواہ وہ قاہرہ، بیروت، تہران، اسمرا یا
مشرق قریب کے کسی دوسرے شہر میں لے سکتے ہیں۔ نیز ہر دو سال کے
کے بعد پوری تنخواہ پر انہیں دو مہینے کے لیے امریکہ جانے کی رخصت
مل سکتی ہے۔ تنخواہیں اڑھائی سو ڈالر ماہوار سے آٹھ سو ڈالر ماہوار
تک جاتی ہیں۔ ان میں سے خاصی بڑی رقمیں بچائی جاسکتی ہیں، اس
لیے کہ دولت سعودیہ میں زیادہ خرچ کا کوئی امکان نہیں۔

اکثر امریکیوں نے دو سال سے زیادہ کے اقرار نامے کر رکھے ہیں اور
بعض مستقل طور پر وہاں مقیم ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ تنخواہ اچھی ملتی ہے
اور دولت سعودیہ کے اس حصے میں آب و ہوا دمیسی ہی ہے جیسی میکساس
اور اوکلاہوما کے مشرقی حصوں میں ہے۔ اراکوں نے ۱۹۴۶ء میں نیویارک
کے نزدیک ایک درسگاہ قائم کی تھی جس میں کارکنوں کو تربیت دی جاتی تھی۔
۱۹۵۱ء میں یہ درسگاہ صید منتقل کر دی گئی ہے۔ وہاں کارکنوں کو عربی
بولی سکھائی جاتی ہے۔ اور کام کے متعلق بھی ضروری باتیں بتائی جاتی ہیں

۱۵ Oklahoma جہودی امریکہ کی ایک ریاست جو میکساس کے شمال اور

کنساس کے جنوب اور ارکنساس کے مغرب میں ہے۔ ۱۵ Sidon یو ایک

زلفیں تمام کا مشہور بندرگاہ تھی۔ صود (Fyre) کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے۔

آج کل یہ لبنان کی بندرگاہ ہے۔ بیروت سے حزب کی طرف چلیں۔ تو پہلے صیدا لے

گیا پھر صود۔

ساتھ ساتھ دولتِ سعودیہ کی تاریخ، جغرافیہ، عادات، رسوم اور قانون کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

تیل کی کمپنی بننے سے پیشتر الحسا ایک صحرائی علاقہ تھا۔ ایک زمانے میں خلیج فارس کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ کریت سے مسقط تک کھجوروں کے بڑے بڑے باغ تھے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ صرف چند آثار رہ گئے مثلاً قطیف میں۔ وہ بھی ریت کے بڑھتے ہوئے سیل کے باعث خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس علاقے کے چھوٹے چھوٹے دیہات کے باشندوں کے لیے کھجوروں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ کمپنی نے دوسرے ذرائع سے لوگوں کی شکم پری کا انتظام کر دیا۔ جنگ کے زمانے میں جہازوں کی آمد و رفت کم تھی اس لیے کمپنی نے ہنزول کی کاشت کا انتظام کیا۔ مرغیاں پالیں اور دودھ کے لیے گایوں کے بڑے بڑے زلیہ ڈ رکھے۔ حیب جہازوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تو ان چیزوں کی ضرورت نہ رہی۔ اب آٹا مکو اس پیمانے پر رسد کی بھرمارانی کا انتظام کر رہی ہے۔ کہ چھوٹے درجے کی یورپی ریاست اپنی فوج کے لیے ویسا انتظام کرتی ہو گی جھوٹا گوشت اور دوسرا سامان جہازوں میں پہنچ رہا ہے۔ تمام افسر اور دوسرے بہت سے لوگ اپنے شیکوں میں تیار شدہ کھانا کھاتے ہیں جن کے ہاں کھانا پکانے کا انتظام نہیں، انھیں ڈائننگ ہال میں بڑی صار سفری چیزیں مل جاتی ہیں۔

ان کمپنیوں کے علاوہ کمپنی میں بارہ صحرا علاقہ کی بھی ہیں، جن میں سے زیادہ تر اب تو بامیہ آئے تھے سال میں سے بعض بڑھتی تھیں۔ بعض مہاجر شاہ ابن

فیہ شرط لگا رکھی تھی کہ امریکیوں کے بعد سب سے بہتر سلوک میری رعایا کے ساتھ ہوتا
 چاہیے۔ اطالوی اس سلسلے میں کہیں نہ آئے تھے۔ ان کے لیے ایک مشکل یہ
 پیش آئی کہ دولت سعودیہ کے مقررہ قاعدے کے مطابق وہ اپنے بال بچے نہ منگا سکتے
 تھے۔ چنانچہ کمپنی کو ان کے لیے ظہران، عیدقائن اور اس تنورہ میں نئے مکانوں
 کا بندوبست کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ آٹھ سو فلسطینی پناہ گزینوں کو بھی ملازم
 رکھا گیا، جو مختلف نمون میں ابھر تھے۔ امریکیوں اور اطالویوں کے علاوہ کمپنی کے
 پاس چودہ ہزار عرب ملازم ہیں۔ جن میں سے بہت بڑی تعداد دولت سعودیہ
 کے باشندوں کی ہے۔ کچھ لوگ عراق، بحرین، عدنان اور دوسرے علاقوں سے
 بھی آئے ہوئے ہیں۔ کارکنوں کی اتنی بڑی تعداد جم کر لیتا بجائے خود بہت اہم
 تھا۔ پھر وہ لوگ تیل نکالنے، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور صاف
 کرنے کے کاموں سے واقف نہ تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے مختلف
 کام سیکھ لیے۔ بعض ٹرک، بسیں، بل ڈوزر، سڑکیں ہوار کرنے والے ٹریکٹر
 چلاتے ہیں۔ بعض گیس کے مشینوں اور مرمت کی دکانوں پر کام کرتے ہیں۔
 تیل نکالنے میں جو عرب ملازم ہیں، ان میں سے بہتیرے دس سال سے کام کر رہے
 ہیں اور انہوں نے ماہر امریکیوں کی نگرانی میں خاصا کام سیکھ لیا ہے بعض مختلف
 مشینوں میں بھی کام کرنے لگے ہیں۔ ایسی ملازمت کرنے والوں کو کمپنی نئے ہی
 ہے۔ مثلاً جو دس سال یا پندرہ سال تک کام کر چکے ہوں۔ احمد رشید جو عمر ۲۳ سالہ
 سے ملازم چلا آتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا
 ہے۔ ایک بھتیجا فلسطینی (امریکی) کی یونیورسٹی میں علم حاصل کر رہا ہے۔

جب کمپنی کا کام شروع ہوا تھا، عام مزدوروں کو نصف ریال روزانہ مزدوری ملتی تھی۔ اب مزدوری کی شرح آغاز میں تین ریال پورمبیہ ہے اور بعض نذرہ ریال پورمبیہ پاتے ہیں۔ ہمارے تنخواہیں آٹھ سے ڈیڑھ ہزار ریال تک جاتی ہیں۔ جو کارکن غیر شادی شدہ ہیں۔ انھیں کھانے کی چیزیں بڑی ارزاں مل جاتی ہیں۔ رہنے کے لیے مکان ہیں، جن کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔ ایندھن اور روشنی مفت دیا جاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں کمپنی نے ایک فلاحی منصوبہ بنایا تھا جس کا مفاد یہ تھا۔ کہ جو ملازم اپنی پانچ یا دس فی صد تنخواہ کمپنی کے پاس جمع کرائے گا۔ اسے پنشن ملے گا۔ غرض جو ملازم پندرہ سال یا زیادہ مدت کی ملازمت کے بعد الگ ہوتا ہے، وہ اپنی بچت پر سو فی صد بونس پاتا ہے۔

کمپنی نے تمام امریکیوں اور دوسرے ملازموں کے لیے طبی اور کھانا نظام بہت عمدہ کر رکھا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے اختتام پر ممکنہ طبابت میں ایک سو زیادہ امریکی کام کر رہے تھے۔ ان میں ڈاکٹر بھی تھے، معوان ساز بھی اور نرسیں بھی ایسے لوگ بھی جو آنکھ، کان، ناک اور گلے کی بیماریوں کے دہرتے۔ ان کے علاوہ ہندوستانی اولیٰ طاعون ڈاکٹر بھی ہیں۔ ایک جینے کے معالجات کا تجربہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ پچیس ہزار نو سو اڑتیس آدمی ایسے تھے جنہوں نے دوائیں لیں اور سات سو ستانوے آدمی ہسپتال میں رہے کمپنی کے قسطہ نگاہ سے موسمی بخار خاص وجہ کا محتاج ہے، اس لیے کہ تعلیف کے نخلستانوں میں انھانہ سے فی صد لوگ موسمی بخار میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کمپنی کے ملازموں میں موسمی بخار

قریب قریب مفقود ہو چکا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بمقام ظہران ایک ہسپتال قائم کیا گیا تھا، جس میں دور حاضر کی تمام ضروری سہولتیں مہیا تھیں۔ یہ صرف عربوں کے لیے تھا۔ اس میں فلیٹس بستر تھے۔ اب یہ بہت پھیل گیا ہے۔

تیل کے سلسلے میں کمپنی نے امریکی وضع کے تین مستقل گارڈل تعمیر کئے اور بہت سے کیمپ بنائے۔ بارہ ہزار عربوں کو تربیت دے کر وہ ملازمت میں لے چکی ہے۔ ایک ضروری امر یہ ہے کہ عرب کارکنوں کو خواہ وہ کوئی کام کر رہے ہوں اور ان میں پانچ مرتبہ نماز کے لیے اجازت ملنی چاہیے اور حج کے دن ضروری ہے کہ وہ مسجد میں پہنچیں اور وہاں نماز ادا کریں۔ مشکلات میں سے نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ نیچھی جاسکتی ہے اور نہ انھیں بھم پہنچائی جاسکتی ہے۔ لازمی ہے کہ ان کے لیے تعلیم کا جو بھی انتظام ہو، قرآنی اصول پر ہو۔ البتہ ثانوی زبان کے طور پر وہ انگریزی پڑھ سکتے ہیں اور مختلف فنون سیکھ سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے لیے زکوٰۃ اور حج کی ترغیب کا سلسلہ جاری رہے۔

آج کل (۱۹۵۳ء تک) ساڑھے آٹھ لاکھ بیرل تیل یومیہ نکالا جا رہا ہے اور دس لاکھ بیرل یومیہ تک ترقی کی امید ہے۔ ۱۹۵۵ء کے آخر تک شاہ ابن سعود کو چار سنہری شنگ نیٹن رائٹنگ ملٹی ملٹی تھی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں نیامعاہہ ہوا، جسے ”معاہدہ عہدہ“ کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق حکومت کمپنی کو وصول ہونے والے منافع کا نصف حصہ لیتی ہے۔ گویا فی الحال تیل سے بادشاہ کی آمدنی میں کوڑو ڈالر سالانہ ہے۔ یہ رقم دولت سعودیہ کی آمدنی کا نوے فی صد حصہ ہے۔

کمپنی کی وجہ سے جس نئی زندگی کا انتظام ہوا ہے وہ آہستہ آہستہ بروڈل
 رائر کر رہی ہے۔ بعض لوگ ملازمت کے لیے آجاتے ہیں پھر واپس چلے جاتے
 ہیں، لیکن حیب ضرور تیس مجبور کرتی ہیں تو دوبارہ آجاتے ہیں۔ جن لوگوں کی شادیوں
 نہیں ہوئیں وہ پختہ بارکول میں رہتے ہیں، جہاں بجلی کا انتظام ہے۔ پانی کے پائپ
 لگے ہوئے ہیں۔ کھانا پکانے کی سہولتیں ہیں۔ جو لوگ شادی شدہ ہیں اور
 پاس کے کسی گاؤں میں رہتے ہیں وہ وقتاً فوقتاً کمپنی کے ہسپتال میں آتے
 ہیں۔ ان کے بچے کمپنی کے جاری کردہ سکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ بیٹا انگریزی
 پڑھتا ہے اور باپ امید ہے کہ محنت کر کے ایک روز کمپنی کے دفتر میں محاسب
 بن جائے گا۔

وہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ریت کے سوا کچھ نہ تھا، وہاں سینہ زار اور
 پھول مہیا ہو گئے ہیں۔ عمدہ عمارتیں بن گئی ہیں۔ ہسپتال اتنا بڑا ہے کہ اس
 کی تعمیر پر دس لاکھ ریال خرچ ہوئے جو سڑک ہوائی اڈے کو جاتی ہے وہاں
 سے آگے ایک سڑک جبل ظہران کی طرف بھی جاتی ہے جو شیخ فارس
 کی ایک راس ہے۔ لیکن اس پاس کے دوسرے خطوں میں غسانی
 اجناس کم ہیں۔ باقاعدہ تنخواہوں کا کوئی نظام نہیں۔ طبی امداد کا بھی
 کوئی بندوبست نہیں۔ در سگا ہیں بھی نہیں اور ضرورت کی چیزیں شاذ ہی
 ملتی ہیں۔ اس مقابلے سے بڑوں اور بچوں میں یقیناً یہ احساس پیدا ہو رہا
 ہے کہ وہ ایک نئے دور کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں۔



نواں باب:

ساحل نطف کا عام نقشہ

دولتِ سعودیہ کا مشرقی ساحل منبرے سے قریباً محروم ہے۔ البتہ سفوف میں ایک بہت بڑا نخلستان ہے اور تظیف کے ارگرد کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ یہاں رہنے والے لوگ خانہ بدوش تھے یا ماہی گیر۔ کھجوروں کی کاشت کرتے یا چھوٹے دوکاندار صدیوں سے بہت ہی معمولی حیثیت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں لایک روال آہستہ آہستہ قابل کاشت زمینوں کو اپنی آغوش میں لیتی چلی آ رہی تھی۔ اس تباہی خیز چکنہ کو ختم کرنے کے لیے گزشتہ بیس سال میں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ پہلے پریشان حالی دیہات اور اس پاس کی ندیوں کے درمیان وقفہ وقفہً معمولی تجارت کا سلسلہ جاری تھا اور ان دیہات کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ اب کاروبار کا سلسلہ پوری خلیج فارس میں پھیل گیا ہے اور یہ سلسلہ روز افزوں ہے۔ ایک طرف امریکی گاہک ہیں اور دوسری طرف بھی

تنخواہیں پانے والے عملوں اور متوسط درجے کے تاجروں کا روز افزوں گروہ ہے۔ ساحل پر جو قصبے کسی زمانے میں بالکل خاموش اور ساکن نظر آتے تھے، اب ان میں رونق اور جہل پہل ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ریت کے ٹیلوں اور بائیک کنکر والے میدانوں سے ذرا اگے چند سال پیشتر یا تو کبھی کبھار جانے آئے والے قافلوں کے نقش پاتے تھے یا دروڑوں کی خیمہ گاہوں کے نشان نظر آتے تھے۔ اب وہاں موٹریں بھرتی ہیں۔ ریل کی سڑک بنی ہوئی ہے۔ ٹیلی فون کے تار لگے ہوئے ہیں۔ پائپ لائنیں بھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ راستوں کے دونوں کناروں پر تیل کے کنسترو رکھ دیئے گئے ہیں اور میلوں کے نشان لگ گئے ہیں، جن پر انگریزی اور عربی حروف اور ہند سے کندہ ہیں۔ ان چیزوں نے پورے منظر میں نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ رات کے وقت گیس کی بڑی بڑی روشنیوں سے زمین دور دور تک بقیعہ نور بن جاتی ہے۔ ظہران، اس تنورہ عیقات کے شہروں میں کسی عمارت میں نظر آتی ہیں۔ یہی کیفیت سرحدی استیوں کی ہے، مثلاً عین دار عثمانیہ۔

سویز سے راس تنورہ کا فاصلہ تین ہزار میل سے زائد ہے، لہذا جو مسافر دولت سعودیہ سے مشرقی حصے میں آنا چاہتے ہیں، ان میں سے زیادہ تر لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے سے آتے ہیں۔ ظہران، قاہرہ اور کراچی کے قریب وسط میں ہے۔

دونوں طرف کا فاصلہ تیرہ تیرہ سو میل کا ہوگا۔ اس لحاظ سے ظہران ایک طبعی ہوائی مرکز ہے، جہاں ہینے میں ایک ایک ہزار تک ہوائی جہاز اترتے ہیں

ان میں سعودی عربی ہوائی جہاز بھی شامل ہیں جن کے لیے ظہران مشرقی سمت کا آخری ہوائی اڈا ہے۔ دوسری کمپنیوں کے جہاز بھی یہاں آتے ہیں خود اراکو کے ہوائی جہاز بھی اسی مرکز کو استعمال کرتے ہیں۔ اراکو کے ہوائی بیڑے میں دو ایسے ہوائی جہاز بھی شامل ہیں جن میں راحت و سائش کے اعلیٰ سامان موجود ہیں۔ ان میں کمپنی کے ملازمین نیو یارک آتے جاتے رہتے ہیں۔

ظہران کے ہوائی اڈے کی تعمیر دوسری جنگ عظیم کے دوران میں شروع ہوئی تھی تاکہ جو امریکی جہاز ہندوستان اور جنوبی و مشرقی ایشیا کی فوجوں کو رسد اور دوسرا سامان بہم پہنچاتے تھے، وہ راستے میں مٹھ سکیں۔ جنگ اڈے کے مکمل ہونے سے پہلے ختم ہو گئی، لیکن امریکہ نے اڈا مکمل کر دیا اس میں جو پرواز گاہیں ہیں، جو سات سات ہزار فٹ لمبی ہیں۔ اڈے کے علاوہ ہوائی جہازوں کی مرمت کا انتظام بھی موجود ہے۔ خلیج فارس کے حلقے میں یہ بہترین ہوائی اڈا ہے۔

اس کے متعلق مرحوم شاہ ابن سعود کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا تو ایک شرط یہ رکھی گئی تھی کہ دولت سعودیہ کے عربوں کو ہوائی اڈے کے انتظامات کی تربیت دی جائے گی پھر ان کے لیے اس فوجی اسکول کا ایک گروہ بھیج دیا گیا، جو منتخب عربوں کو مختلف کام سکھاتا ہے۔ مثلاً اڈے کا انتظام کیوں کر کرنا چاہیے؟ موسمی حالات جانچنے کا طریقہ کیا ہے؟ کنٹرول کے برج سے کیوں کر کام لیا جاتا ہے؟ جو لوگ یہاں تعلیم و تربیت مکمل کر لیتے ہیں، ان میں سے بہترین آدمیوں کو مزید تربیت کے لیے امریکہ بھیج دیا جاتا ہے۔

نہران کے ہوائی اڈے ہی سے ۱۹۴۷ء میں امیر سعود ولی عہد دولت سعودیہ (موجودہ شاہ) امریکہ روانہ ہوا تھا۔ اور دولت سعودیہ کے بہت سے اکابر اسے خدا حافظ کہنے کے لیے نہران پہنچے تھے۔ اسی سال ۱۹۵۹ء میں کہیں ٹھہرے بغیر ہوائی جہاز دنیا بھر کا چکر لگانے کے لیے پہلی مرتبہ پرواز عمل میں آئی تھی۔ اس ہوائی جہاز میں پٹرول نہران ہی کے ہوائی اڈے سے لیا گیا تھا۔ پرواز کو اس درجہ مخفی رکھا گیا تھا کہ شاہ ابن سعود کے سوا کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ اگرچہ یہاں آنے والی آتی رہتی ہیں اور اکثر باریک کنکروں والی پرواز گاہوں پر اتارنا پڑتا ہے۔ یا اس ہمدام کی ہوائی اڈوں نے اس اڈے پر حفاظت کا بڑا ہی حیرت انگیز ریکارڈ پیش کیا ہے۔ مسافروں کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں سعودی عربی لائن نے چار چار انجن والے پانچ نئے جہاز خریدے۔ حج کے موسم میں سعودی عربی جہازوں کی سرگرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس زمانے میں قاہرہ، بیروت، دمشق اور بغداد تک بارہ خاص پروازیں کی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں دولت سعودیہ نے وہ ٹیکس راڑا دیا جو حاصیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اور عازمین حج کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ کئی ہزار افراد بیروت کے ہوائی اڈے پر رہ گئے۔ جو عام حالات میں حج کے موقع پر مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکے تھے۔ ممتاز مسلمانوں کا ایک وفد لبنان کے ایک امریکی سفیر سے ملا۔ اس نے اپنی حکومت کو اطلاع دی تو وہاں سے طرہیں وسیعہ کے امریکی ہوائی مرکز کو ہدایت کر دی گئی کہ مازبین حج کو بیروت سے جدہ پہنچا دیا جائے۔ پچاسچہ ان امریکی جہازوں نے بیروت و جدہ کے

درمیان چوتھریں وائیں کہیں اوتھیں ہزار سات سو سے زیادہ عازمین حج کو بروقت جہاز پہنچا دیا۔

۱۹۵۹ء تک عرب کے مشرقی حصے میں اتنے فاصلے طے نہ کر لے پڑتے تھے، جن کے لیے ہوائی جہاز ضروری ہوتے اور صحرائی ریت بڑی پریشانی پیدا کرتی تھی۔ اب اس تنورہ میں ایسا مسئلہ تیار ہونے لگا ہے جو مشرق کی بختہ بنادینے کے کام آتا ہے چنانچہ حاصل نفع کے بڑے بڑے مرکزوں کے درمیان بختہ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ ایک سڑک ہوائی اڈے سے چلتی ہے جو امریکی توفل بھریل اور اس کے محلے کے وسیع احاطے سے گزر کر ظہران جاتی ہے۔ وہاں سے جنوبی و مغربی سمت میں بمبائلی چلی جاتی ہے، جہاں تیل کے ایسے چشمے ہیں جو دنیا کے سب سے بڑے چشموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ جنگلوں کی قطاریں ہیں۔ جن کی سڑکیں نہایت بختہ ہیں اور ان پر تارکول بچھا ہوا ہے۔ جنگلوں کے درمیان چھلکے لگے ہوئے ہیں۔ یا چھوٹی چھوٹی دیواریں بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ ساتھ سبزہ زار ہیں جو سیلاب رہتے ہیں۔ بمبائلی میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے یقیناً موجود ہیں، لیکن وہاں روشنی کے سب سے بڑے مینا بھی ہیں۔ یہاں سے وژانہ بارہ ہزار بیرل تیل نکلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں امریکی تیل کی مقدار ایک درجن بیرل سے بھی کم ہے۔ اراکو کے تیل کی مقدار ۱۹۵۱ء میں تین کروڑ ساٹھ لاکھ ٹن اور ۱۹۵۳ء میں چار کروڑ ٹن سے بھی زیادہ تھی۔ ابھی ظہران کے جنوب میں قیش و دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ عین دارا درالو صدر یہ میں اٹھارہ چھٹے ۱۹۵۱ء میں تیل ہو چکے تھے۔ تیل کا ایک اور مرکز الحرض میں دریافت ہوا ہے جو عین دار کے

جذبہ میں واقع ہے۔ اور فاصلہ ایک سو میل سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح جھول کا سلسلہ ریح النحالی کی طرف چلا گیا ہے۔

دولت سعودیہ کا کچھ تیل پائپ لائن کے ذریعے سے بحرین پہنچایا جاتا ہے۔ سمندر میں سے جانے والی یہ پائپ لائن سب سے زیادہ لمبی ہے۔ بحرین میں یہ تیل صاف ہو کر جہازوں میں لادوا جاتا ہے۔ اس تنورہ میں پیساجس ہزار ہیرل لڈا صاف کرنے والی مشینیں جلدی میں لگائی گئی تھیں، اب وہ گنتا تیل صاف کر رہی ہے۔ باقی تیل اس تنورہ کے ٹینکوں میں جمع رہتا ہے۔ اور بعض اوقات وہاں سے تیل ٹینکوں میں بھر کر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس تنورہ کی گودی میں اگرچہ ایک ایک وقت چار چار ٹینک تیل لیتے ہیں، لیکن چونکہ ہر ٹینک کو بھرنے میں آٹھ گھنٹے لگتے ہیں اس لیے بعض اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بارہ بارہ ٹینک کمارے سے ہٹ کر ٹھہرے ہوئے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ اس تنورہ کی ہیئت بھی بہت بدلتی رہی ہے اور بدل رہی ہے۔ وہاں تیل صاف کرنے کی مشین کے علاوہ مشینوں کی ایک نہایت عمدہ دکان ہے۔ اور نہایت اچھے ٹینکوں کی قطاریں بھی موجود ہیں۔ پیلے ٹینکوں کے ملاح کتارے پر اترنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اب کمپنی نے گودی سے قریب ایک کلب کھول دیا ہے۔ جو اتنا بڑا ہے کہ ایک سولاح اس میں ٹھہر کر آرام و راحت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس تنورہ، ظہران کے مقابلے میں قدرے مطلوب ہے، لیکن وہاں آنسو یا بہت کم آتی ہیں، صبح سے خوش گمار ہمارے بڑے چٹھی رہتی ہیں۔ اور سمندر میں نہانے کی جگہ بھی اچھی ہے۔ امریکی اسے کمپنی کے تمام شہروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

راس تنورہ میں آج کل ٹیکروں کی قطاریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پانچ سال
 پیشتر وہاں صرف معمولی کشتیاں ٹھہر سکتی تھیں۔ دولت سعودیہ کے اس حصے
 میں مسلمان لائے جانے والے جہازوں کے لیے بھی ایک عمدہ گودی کی ضرورت
 تھی۔ اس کا انتظام قائم میں کیا گیا، جو اسی گودیوں کا معمولی سا گاؤں تھا۔ اب
 اس کے مینار اور عمارتیں راس تنورہ سے قطر آتی ہیں۔ یہ گودی خاصی لمبی ہے۔
 ۱۹۵۸ء میں یہاں کام شروع ہوا تھا۔ سمندر کے کنارے ملنے والے
 کمر پانچ میل لمبا ایک سنگ بست راستہ تیار کیا گیا جو سمندر کے اندر جاتا ہے
 اس کے آگے کوئی پونے میل تک قینچی دار پالوں کا پل ہے۔ پھر سڑھے سات
 سو فٹ لمبی آہنی گودی آتی ہے۔ گویا گودی خلعے گہرے پانی میں بنائی گئی
 ہے۔ جہاں سمندر حالت جزر میں بھی ہو تو جہاز ٹھہر سکتے ہیں۔ اس گودی کی
 درجہ سے قائم میں بھی خوب چل چل پہل شروع ہو گئی۔ دولت مند سعودی عرب
 یہاں اپنے مکانات و فراڈر کارخانے بنا رہے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کی ایک مشین
 لگا دی گئی ہے جس میں جون سلاٹھ سے بجلی پیدا ہونے لگی تھی۔ اندازہ ہے
 کہ دس سال میں دوام کی آبادی پچیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔

دوام کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مقام
 دولت سعودیہ کی ریل کا آخری مشرقی سٹیشن ہے۔ ترکوں نے دمشق سے مدینہ
 منورہ تک جماریلے بنائی تھی۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ماہرین حج کو آدو
 رفت میں سہولت ہو۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ عرب میں اپنا اقتدار زیادہ سے
 مستحکم رکھیں۔ یہ ریلوے پہلی جنگ عظیم میں لارنس اور شریفیوں نے برباد

کہ دی۔ فروری ۱۹۵۵ء میں مرحوم شاہ ابن سعود نے امریکہ کے پریذیڈنٹ ڈیوئیڈ سے کوئینسی نام کے روز پر ملاقات کی تھی۔ تو پریذیڈنٹ نے یہ بھی پوچھا کہ دولت سعودیہ میں ریل کی کتنی لمبی لائن ہے۔ شاہ ابن سعود نے جواب دیا کہ لائن نہ کئی سو میل تک چلی جا رہی ہے لیکن فی الحال اس سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اسی وقت سے بادشاہ کی توجہ ریل کی طرف منطقت ہو گئی۔ ۱۹۵۶ء میں شاہ ابن سعود مصر گیا اور وہاں ریل میں سفر کیا تو فیصلہ کر لیا کہ اپنے ہاں بھی ریل ضرور بنوائے گا۔

۱۹۵۷ء میں شاہ ابن سعود نے اپنے امریکی سفیر کو ہدایت فرمائی کہ وہ کام سے ریاض تک ریل بنانے کے لیے جمہوریہ امریکہ سے قرضے کے امکانات دریافت کیے جائیں۔ وہ کام سے طہران اور بمبائے تک اور وہاں سے مہنوت تک ریل کی ضرورت بھی واضح تھی اور اس سے نفع کی بھی امید تھی البتہ مہنوت سے ریاض تک ریل کا آمد ضرور معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس سے نفع کی کوئی امید نہ تھی۔ اس حصے میں ریل بنانا سیاسی لحاظ سے کتنا ہی مفید ہونا اگر مفید ہی لحاظ سے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جمہوریہ امریکہ کی حکومت نے شاہ ابن سعود کو مطلع کیا کہ بندرگاہوں، سڑکوں، رہائش گاہوں کے کاموں، ہسپتالوں وغیرہ کے لیے تو قرضے دیے جاسکتے ہیں۔ مگر ریل کی جڑی پھانے کے لیے سبھی طور پر قرضے کا انتظام مناسب

Quincy یہ ملاقات امریکی بڑی جمیل میں اس وقت ہوئی تھی جب

مصر روز ریٹیلیا کا کانفرنس سے واپس ہونے تھے۔

ہوگا۔ بہر حال تعمیر شروع ہو گئی تاہم دوام سے ریاض تکسٹن ہوسٹالوں میں ٹپٹری
 کچھ گئی۔ اب دواغ بور رہا ہے کہ بادشاہ کا یہ نظریہ بڑی دانشمندی پر مبنی تھا۔
 یعنی اس ریلوے پر توقع سے بہت زیادہ مسافر اور بہت زیادہ سامان آتا جاتا
 ہے۔ ایک مسافر گاڑی اور دو مال گاڑیاں روزانہ آتی جاتی ہیں۔ تیسرے
 درجے کے مسافر کھلی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور ان کے لیے لکڑی کی نشستیں
 بنی ہوئی ہیں۔ گاڑی صحرائی علاقے میں سے گزرتی ہے۔ تو عربوں کی دھیلی
 ڈھالی عبا میں ہوا میں پھر پھڑاتی ہوئی عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ ابتدا
 میں دوسرے مسافروں کے لیے کھلی گاڑیوں پر سائبان سے لگا دیے جاتے
 تھے۔ ۱۹۵۱ء میں امریکہ سے مسافر گاڑیاں آگئیں تو ریل کا سفر درجہ
 زیادہ آرام دہ ہو گیا۔

ابتداء میں ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ عرب اپنی عادت کے مطابق
 کر لیے کے بارے میں بھاڑتا ڈھڑکاؤ شروع کرتے تھے۔ لیکن اب یہ مصیبت
 ختم ہو چکی ہے۔ البتہ ریت کا مسئلہ بدستور باقی ہے کہیں ریت کو روکنے
 کے لیے ٹپٹری کے دونوں طرف لکڑی کے تختے لگا دیے گئے ہیں۔ جیسے
 کہ ریت کو روکنے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ بمقابلہ کے علاقے میں
 ٹپٹری بچانے کا وقت آیا تو بڑی مشکلات پیش آئیں۔ وہاں ریت کے
 ٹیلے پچاس فٹ سے بھی زیادہ بلند تھے۔ اور وہ ہر وقت جنوبی سمت میں
 بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سوچ بچار کے بعد ریل کی ٹپٹری بلند تو وہ اسے
 ریگ پر بچھائی گئی۔ خالی جگہیں خوب بھری گئیں اور ریت کی سطح پر تیل

چھڑک دیا گیا۔ اس میں یہ نتیجہ یہ نکلا کہ ریت اڑتی ہے تو پٹری کے اوپر سے گزر جاتی ہے اور پٹری پر نہیں چھڑتی۔ پٹری کے بیشتر حصے میں ریت کو مٹانا پڑتا ہے۔ اس غرض سے ہر راجن کے ساتھ بڑے بڑے ٹکڑے لگا دیئے گئے جو ریت اڑنے جاتے ہیں۔ ایک اور غیر معمولی مسئلہ یہ تھا کہ آدورفت آندھیلوں میں بھی ملتوی نہ ہونے پائے۔ ریلوے کے سلسلے میں ایک وسیع پروگرام پیش نظر ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ دولت سعودیہ کے عرب جلد سے جلد مختلف کاموں میں مہارت پیدا کر لیں تاکہ ریلوے کے زیادہ سے زیادہ عہدے امریکیوں کے بجائے ان کے حوالے ہو جائیں۔ مغربی سمت میں اس لائن کو بحیرہ عمان تک پہنچا دینے کا مسئلہ بھی زیرِ غور ہے۔

اس ریلوے کو دیکھ کر امریکیوں کے دل میں اپنے مال کے دو ٹیکسٹ مشین کے حالات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب مغربی امریکہ کے بنجر علاقوں کی آبادی شروع ہوئی تھی اور ریل مشینیں سمت سے مغربی سمت جانے لگی تھیں۔ تیل کے کارخانے ہیں کام کرنے والے ایک امریکی نے کہا: میں نے وہ زمانہ نہیں دیکھا جب ریل پہلے پہل امریکہ کے بھرا نکالنے والے ساحل کی طرف جانے لگی تھی۔ لیکن دولت سعودیہ کی ریل دیکھ کر میرے ذہن میں اپنے مال کی ریل کے ابتدائی دور کا تصور پیدا ہو گیا۔

دولت سعودیہ میں تیل مل جانے کے ساتھ ہی ایک مسئلہ یہ سامنے آگیا۔ کہ بعض ازال فرخ پر بحیرہ روم میں پہنچانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اگر سمندر کے راستے پر اکتفا کرتے تو صرف عرب کے ارد گرد زمین خراشیں کا پتہ

لگانا پڑتا۔ ہنر سونہ ہیں بے گزرنے کے لئے ہائیں سنٹ فی بیرل محصول ادا کرنا لازم تھا۔ یہ مصارف برداشت کر چکنے کے بعد تیل کو دوسری کمپنیوں کی مینوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مناسب قیمت پر فروخت کرنا مشکل تھا۔ اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ خلیج فارس سے بحیرہ روم تک پائپ لائن بچھا دی جائے۔ یہ سچ کے علاقے بڑی حد تک غیر آباد بھی تھے اور سموا بھی، اس لیے پائپ لائن بچانے میں کوئی خاص وقت نہ تھی۔ اس لائن کی خاطر ایک نئی کمپنی ۱۹۶۵ء میں قائم ہوئی، جس کا نام ٹرانس اریبین پائپ لائن کمپنی تھا۔ اس وقت دنیا کے کسی حصے میں روپے کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں تھا، جو ضرورت کے مطابق تیس انچ کی پائپ لائن تیار کر سکتا اور لاکھوں کے لئے لازم ہو گیا کہ کنسلٹنٹسٹیل کارپوریشن ٹیکساس کے سلسلے میں امریکان کے لئے امداد دے۔ واضح رہے کہ اس سے پیشتر جو بڑی سے بڑی پائپ لائن تیار ہوئی تھی، وہ چھبیس انچ تھی۔ گیارہ سو میل لمبی پائپ لائن تیار ہو گئی تو اسے بارہ ہزار میل کا بحری سفر طے کر کے خلیج فارس میں پہنچانے کا خرچ لے مطلب یہ ہے کہ اس خورہ سے مسقط و لاس انجلس ہوتے ہوئے عرب کے جنوبی و

عربی گوشے یعنی یرم کے پاس سے بحیرہ قازم میں داخل ہو کر سونہ ہینین تین ہزار میل سے کم نہ ہو گا لے سنٹ ایک امریکی مکتہ ہے۔ ایک ڈالریں ایک سو سنٹ جتے ہیں ڈالر

کی قیمت آج کل پانچ روپے کے قریب ہے لے Trans - Arabian Pipe

Tapline

Line Company اس کا نام اختصاراً

Consolidated Steel Corporation شہرہ ہائے

اتنا زیادہ تھا کہ کفایت اور بچت کی مختلف تدبیریں سوچنی پڑیں۔ ایک من چلی کمپنی نے
 اعلان کیا کہ ہم پائپ کے دو دو سو فٹ لمبے ٹکڑے دل کہ باہم بانڈ کر سٹول پڑا ل
 دیں گے۔ دیکھتے ہوئے کمپنی اسے خلیج فارس لے جائے گی۔ ایک سچو نیزہ پیش ہوئی کہ
 فولادی چادریں مشرق قریب پہنچا دی جائیں اور وہیں انھیں موڑ کر پائپ
 بنالیے جائیں۔ ارزاں ترین طریقہ یہ ہو گا کہ جمہوریہ امریکہ نے جو بحری جہاز
 محفوظ رکھ چھوڑے ہیں، ان میں سے ایک تیار رہ بڑا درجہ خرید کر اس پر
 پائپ لائن بنانے کی مشین لگالی جائے اور جہاز کی زبردست قوت سے
 کام لے کر مشینوں کو استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک فائدہ یہ بتایا جاتا
 تھا کہ نصف پائپ بحیرہ روم میں تیار کیا جائے گا اور باقی خلیج فارس میں
 انجام کار بھی فیصلہ ہوا کہ پائپ بنا کر بار بار جہازوں کے ذریعے سے
 خلیج فارس پہنچایا جائے۔ نصف پائپ آنتیس انچ قطر کا ہو اور نصف
 تیس انچ قطر کا۔ تیس انچ والے کو آنتیس انچ والے کے اندر رکھ دیا جائے
 با ایں مہم جہاز والوں کے ساتھ پائپ خلیج فارس میں پہنچانے کا جو معاہدہ
 ہوا، اتنا بڑا معاہدہ حالت امن میں کہیں نہیں ہوا۔ ہر مہینے ایک جہاز
 پائپوں سے بھری ہو کر بھیجا جاتا تھا۔ اور یہ سلسلہ دو سال برابر جاری رہا۔ مرنے
 والے مطلب یہ ہے کہ نصف پائپ بحیرہ روم کے کنارے سے ملک کے اندر بچتا شروع ہو گا۔
 بحیرہ روم میں بنا کر کنارے پہنچا دینا مناسب ہو گا اور حمل و نقل کا خرچ بہت کم رہ جائے گا۔ ظاہر
 کہ خلیج فارس سے بحیرہ روم تک خشکی میں پائپ پہنچانا سخت مشکل تھا۔ باقی نصف خلیج فارس
 میں بنا کر کنارے پہنچا دیا جائے گا۔ تاکہ مشرقی جانب سے کام شروع ہو جائے۔

کی پوری دیکھ بھال کے بعد ماہرین نے بتایا کہ صیدا پر پائپ لائن کا مغربی منتہا رکھا جائے۔ چنانچہ کچھ دور تک پائپ لائن مغربی سمت سے بھی بچھائی گئی۔ لیکن زیادہ کام مشرقی جانب ہی سے ہوا۔

ایک وقت یہ پیش آئی کہ جس گودی سے ایسا بجاری سامان اتارا جاسکتا تھا، وہ صرف راسن منورہ میں تھی اور وہ گودی ٹینکروں کی وجہ سے راست دن رکی رہتی تھی۔ چنانچہ دولت سعودیہ کے ساحل پر کوئی اور موزوں مقام تلاش کرنا پڑا۔ شمال میں ایک راس علی، جسے ماس المشعب کہتے ہیں۔ یہ کویت کے غیر جانبدار حلقے کے عین جنوب میں واقع ہے۔ یہاں جہاز ساحل سے دو میل کے فاصلے تک آسکتے تھے۔ انجنیئروں نے یہاں ایک چھوٹا سا جزییرہ بنا لیا اور وہاں سے پائپ ساحل پر پہنچانے کے لیے وہ سلسلہ قائم کیا گیا، جسے اصطلاح میں تقناتی کانٹا کہتے ہیں، یعنی انٹی انٹی فٹ لمبے فولادی ستون انگریزی کے حرف 'A' کی شکل میں کھڑے کر دیئے گئے۔ ان پر موٹے اور بھاری تاروں کا ایک جوڑا لٹکا دیا گیا۔ ان میں کانٹے لگے ہوئے تختے جو پائپ کے خاصے وزنی ٹکڑوں کو اٹھا کر دمنٹ میں جہاز سے ساحل پر پہنچا دیتے تھے۔ وہاں سے پائپ چھکڑے پر ڈال کر جوڑنے والی مشین پر پہنچا دیئے جاتے تھے۔ دو آدمی ایک دمنٹ میں دو پائپ جوڑ لیتے تھے تب تین ٹکڑے جوڑ کر اور بڑے بڑے ٹکڑوں میں لاد کر اس مقام پر بھیجے جاتے تھے، جہاں ان کی ضرورت تھی۔ ایک ٹرک ہر نوے نوے فٹ کے پانچ پائپ لادے جاسکتے

تھے۔ جو ٹرک اس غرض سے استعمال کئے گئے، وہ بہت بڑے تھے اور خاص
اسی لیے بنائے گئے تھے۔ ایک ایک پر تیس تیس ہزار ڈالر خرچ ہوتے۔ ان
کی بڑائی کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کا سر ان کے ریڈیو کے وسط تک
پہنچتا تھا۔ ان ٹرکوں کے لیے ٹائر بھی بہت چوڑے اور موٹے بنوائے گئے تھے
اور وہ ریت کے ان خطوں میں سے بنے کلفت گزر جاتے تھے، جن میں عام موٹر
چلتی تو اس کے پیٹے دھری تک ریت میں دھنس جاتے۔ اس الشعب میں
ایک ریڈیو سٹیشن بھی بنایا گیا جس کے ذریعے سے صحرا کے ان دیہیکوں کے
ساتھ سلسلہٴ محاورت قائم رکھا جاتا تھا۔

جو لوگ اس الشعب چاہتے ہیں، انہوں نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ پائپ لائن کا جو
کارخانہ بنا چکا ہے، اس میں زیادہ تر کام دولت سعودیہ کے عرب ہی انجام دیتے
ہیں۔ مثلاً فضائی کانٹے سے سامان اتارنا، اسے لاد کر موٹر کے لیے بھیجنا، پھر
ازمرو اسے بڑے ٹرکوں میں سوار کر کے موقع پر پہنچانا۔ اس الشعب کی کایا پلٹنے
میں عربوں کا حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جولائی ۱۹۵۷ء تک وہاں کیا تھا؟
یا تو وہ پرزور تھے جو مرطوب ریت میں رہتے ہیں، یا اس خنجر رنگ زراہیں کہیں کہیں عرب
ماہی گیر یا کھد بان نظر آ جاتے تھے۔ ایک سال گزر جانے کے بعد اس الشعب میں
ایک خاصہ بڑی آبادی مستقل طور پر مقیم تھی۔ ایک ہسپتال بھی بن گیا، جس میں
دو دواخانے کے تمام سامان موجود تھے اور ایک تفریحی مرکز بھی قائم ہو گیا۔
پائپ لائن بھی جانے کے سلسلے میں بھی بہت سے غیر معمولی مسائل سے سابقہ پڑا۔

لے ان پرندوں کو انگریزی میں Sandpipers کہتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی ندی کے سوا راستے میں میلون تک پانی کا کوئی مستقل ذخیرہ موجود نہ تھا۔ نہ اس جیسے کا کوئی نقشہ تھا جس میں لائن بچھانی جا رہی تھی اور نہ وہاں مقامات متعین کرنے کے لیے کوئی نشانات موجود تھے۔ جو پارٹیاں جا بجا کام کر رہی تھیں، ان کے مقامات متعین کرنے کے لیے اکثر زادیہ پیا آئے استعمال کرنے پڑتے تھے۔

پائپ لائن بچھانے کے سلسلے میں تعمیر کا بہت سا سامان ہتیا کرنا پڑا۔ مثلاً خنجریں گھوڑوں والی مشینیں، سپاس ڈیڑھ ڈیڑھ سوٹن کے ٹرک، ٹریکٹر، پائسوٹریلر، چار بیس، جن میں سے ہر ایک میں ساٹھ سواریاں بیٹھ سکتی تھیں، دس ٹریلر جن میں سے ہر ایک میں ساٹھ آدمی سوار ہو سکتے تھے، انٹی ریفریجریٹر ٹرک، پائسو سے اوپر دوسری سواریاں۔ یہ تمام چیزیں صحرائی سفر کے سامان سے آراستہ تھیں۔

زمانہ حال تک اراکوئیل کی تقشیش کے سلسلے میں مغرب کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی، یعنی اندرون ملک میں بڑھی جا رہی تھی، لیکن جب دولت سعودیہ کی حکومت خلیج فارس کے تمام عربی علاقوں کو اجارے میں شامل کر لینے پر راضی ہو گئی تو پھر مغربی جانب قدم بڑھانے کے بجائے، ساحل کے ساتھ ساتھ کاروباری حلقے کی توجہ مشرق ہو گئی۔ مدت سے ماہرین ارضیات کی رائے تھی کہ ساحل خلیج فارس کے ساتھ ساتھ تیل کے وسیع ذخیرے موجود ہیں جو سمندر کے اندر تک چلے گئے ہیں۔ کچھ مدت سے پانی کے نیچے برائے کافن خاصی ترقی کر گیا تھا۔ مثلاً خلیج میکسیکو میں زمین کے اندر ایک ایک سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ

لے واضح ہے کہ یہ کتاب ۱۹۵۲ء کے اواخر میں مرتب ہوئی تھی۔ لہذا اس کا حال

۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء سمجھنا چاہیے۔

سوفٹ کی گہرائی سے تیل نکالا جا رہا ہے اور خیال ہے کہ یہ گہرائی انجام کار
 دگنی ہو جائے گی۔ خلیج فارس کو دیکھیں تو مشرقی ساحل کے قریب گہرائی کی ایک
 پٹی چلی جا رہی ہے، باقی خلیج فارس کے بڑے حصے کی گہرائی تین سو فٹ سے
 بھی کم ہے، بلکہ اکثر مقامات پر ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مغربی ساحل کے
 ساتھ ساتھ جابجا جزیرے اور چٹانیں ہیں۔ بعض حصے اقلے اور پایاب بھی ہیں۔
 لہذا اس حصے میں فوراً برانے کا کام شروع کیا جاسکتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ہمارے
 براعظم کا جو حصہ آگے بڑھا ہوا ہے اس میں چھ سو فٹ تک سمندر کی سطح کے نیچے
 جتنے طبعی ذخیرے موجود ہیں، ان سب پر ہمیں مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ خلیج فارس
 خاصی اہم ہے۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے کنارے کی ریاستوں کی زمین
 کے کچھ حصے آگے بڑھے ہوئے ہیں یا نہیں۔ پوری خلیج فارس کے متعلق یہ سمجھنا
 چاہیے کہ وہ ایک نشیب ہے، جو براعظم کی سطح میں پیدا ہو گیا۔ لہذا یہ طے کرنا مشکل
 ہو گیا کہ سمندر کے اندر تیل کے جو ذخیرے ہیں، ان پر اگر کسی کو مالکانہ حقوق حاصل
 ہیں تو وہ کون ہے؟ ۱۹۴۵ء میں دولت سعودیہ نے اس بارے میں حکومت
 امریکہ سے رائے لی۔ جواب میں پریزیڈنٹ ٹرومین کے اعلان ۱۹۴۵ء کا حوالہ
 دے دیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اس دستاویز میں جو اصول بیان ہوئے ہیں، ان
 کا اطلاق خلیج فارس پر کرنے کی صورت کیا ہے۔ چنانچہ ۳۱ مئی ۱۹۴۹ء کو دولت
 سعودیہ کی حکومت نے عربی اور انگریزی میں ایک اعلان شائع کر دیا، جس کا مفاد
 یہ تھا کہ خلیج فارس ولے ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر کی تہ میں جتنے طبعی ذخیرے

ہیں، ان کی مالک دولت سعودیہ ہے۔ آئندہ ہفتے شیخ کویت اور شیخ قطر نے شیخ بحرین سے ملاقات کی اور برطانیہ کے پولیٹیکل ریزڈنٹ کی رہنمائی میں ان تینوں نے ویسے ہی اعلان کر دیئے، جیسا دولت سعودیہ نے کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان یا مستوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ جن کے ساتھ برطانیہ کے خاص معاہدے ہیں۔

ان اعلانات میں اصول تو واضح کر دیئے گئے۔ لیکن ان سے زیر آب حدود کا مستقل تعین نہ ہوا۔ اس معاملہ کو شاید دانستہ نظر انداز کر دیا گیا۔ تاکہ آئندہ کسی مناسب موقع پر تمام متعلقہ حکومتیں مل کر مشورے کے بعد حدیں متعین کر لیں۔ تاہم اعلانات کے ساتھ ہی مختلف اقلے اور پاپا ب حصول میں مختلف حکومتوں نے اپنے نشانات نصب کر دیئے۔ ساحل سے بہت کم نیلج فارس میں سب سے پہلا نیل کچشمہ اراکونے ۱۹۵۱ء کے اوائل میں نکالا۔ اس سے عرب ملاحوں، ماہی گیروں اور برمنیوں کی فواصی کرنے والوں کے بیٹے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ وہ پہلے لامتناہی مدت سے خلیج کے ساکن پانیوں کی سطح پر جہاں چاہتے تھے اچھرتے تھے اور جہاں چاہتے تھے مچھیاں پکڑتے یا غوطے مارتے تھے۔ اقلب ہے بہت جلد عربوں کی دیہی کشتیوں کے کونے بابائوں کی جگہ نیل لگانے والی بھاری مشینوں کے مستقل کھمبے لے لیں۔ نیل کے سلسلے میں حد بندی کے مسائل صرف سمندر کی تنگ سہمی محدود نہیں۔ گزشتہ

چھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک حلقہ ہے، جو قدوسی آٹھ میں اور تقسیم کے جنوبی وسط عمان کے شمال تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے قطر، امارت طحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اصطلاح میں اس پورے علاقہ کو ٹریشیل عمان Trucial Oman کہتے ہیں۔ یعنی وہ شمالی ریاستیں جن کے ساتھ برطانیہ کے معاہدے ہیں۔

چند سال سے دولت سعودیہ اور خلیج فارس کے بعض دوسرے شیوخ کے درمیان
بھی جھگڑے پیدا ہو چکے ہیں۔ ابو ظہبی اور بریج کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے باشندوں
کا مسئلہ پیش نظر لائیے۔ انہیں کچھ مدت پیشتر تک حدود کا تعین قطعاً معقول معلوم
نہ ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر اس قسم کی باتیں کہنے کے عادی تھے۔ کہ جب بادشہ ہرجائی
ہے تو ہم "ولای الف" سے آگے نہیں بڑھتے اور جب خشک سالی سے سابقہ پڑتا
ہے تو ہم "وادی ب" تک چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی قیاسی مدندیوں
کی بنا پر تیل کے چٹوں کی ملکیت کا مسئلہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری ہے کہ دولت
سعودیہ کے تمام اطراف میں حدیں باقاعدہ نقشے پر متعین کر لی جائیں محض اس پر
قناعت نہ کی جائے کہ خانہ بدوش قبائل پھرتے پھرتے ریوڑ پرانے کے لیے آ جاتے
ہیں۔ تو وہ ٹیکس شاہ ابن سعود کی حکومت کو دیتے ہیں۔ اگر حدیں متعین نہ کملی جائیں
گی، تو اندیشہ ہے کہ جھگڑے اٹھتے رہیں گے اور جو علاقے گمراہی کے دور میں زندگی
بسر کر رہے تھے، ان کے یکایک تیل کے دور میں داخل ہو جانے کی تکالیف بڑھتی
جائیں گی۔

ابو مطلب یہ ہے کہ کوئی مدعی نہیں ایک دیست کے گمراہان کو ہم کی منگی کے پیش نظر حدود و محل
بنا دینے کا یہاں ان سے ٹیکس اٹھا سکتا تھا۔ دے دیے جاتے ہیں مگر یہ درست ہے کہ اس طرح حدود
کا یہ مسئلہ مشکل ہے لیکن یہاں پہلے حدود متعین نہ تھے۔ حال اب ان کی حدیں کے لیے مختلف اصول
پیش نظر کیے جائیں گے، ان میں ایک اصل یہ بھی ہوگی کہ گمراہان ٹیکس کسے دیتے رہے۔ اصل میں یہ
جھگڑا برطانیہ نے کھڑا کیا جو اپنے زیر اثر علاقوں کی حدیں بڑھا کر تیل کے زیادہ وسیع ذخیروں پر قبضہ جانے کے
غرض سے دنیا کی بریج کے مسئلے میں راضی ہو گیا۔

اگر تیل نہ نکلتا تو بدوئل کے سوا کوئی جزیرہ نمائے قطر میں رہنے پر آمادہ ہوتا؟
 اس جزیرہ نمائے قطر پر چار ہزار مربع میل زمین خود عرب کے معیار کے مطابق بھی
 حدود درجہ بنجر ہے۔ بارش چار انچ سالانہ سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ گرمی کے
 موسم میں ایک طرف خلیج فارس کی مریطوبیت اور اس، دوسری طرف صحرائے عرب کی
 دھوپ جمع ہو کر زندگی ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں۔ مٹی بھر قطر یوں کی زندگی
 یوں بسر ہوتی ہے کہ کچھ لوگ پایاب اندر برآب چٹانوں والے پانیوں میں تھوہیوں کی
 خاطر غوطے لگاتے رہتے ہیں یا مچھلیاں پکڑتے ہیں، کچھ لوگ جانوروں کے ریلوے
 لے کر ان چٹیل اور ناخوشگوار سطحوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں کچھ چارہ مل سکتا
 ہے۔ آج کل اس ریاست کی آبادی بیس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن جا بجا
 اجڑی ہوئی بستیوں کے آثار موجو ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ایک زمانے میں
 یہاں زیادہ آبادی ہوگی۔ قطر کے مشرقی ساحل پر اس کا دارالحکومت واقع ہے
 جس کا نام دوحہ ہے۔ یہ ایک معمولی اور سادہ ساعرب قصبہ ہے۔ اس کی تفصیل جگہ
 جگہ سے ٹوٹ رہی ہے اور یہاں متعدد پرانے قلعے ہیں آذھیوں اور بدوئل کے
 پھاپل سے بچاؤ کے بھی دودریے سمجھے جاتے ہیں۔ اس جگہ شیخ قطر رہتا ہے۔ اس کے
 آباداء بدوئلے صلح نامے پر دستخط کر کے خلیج فارس میں بحری تفراتی ختم کی گئی۔
 اپنے ہمسایوں یعنی معاصرمانی ریاستوں اندر شیخ بحرین کی طرح قطر نے بھی اپنے خارجہ
 معاملات انگریزوں کے حوالے کر رکھے ہیں۔ مسکار اس کا خاص مشغلہ ہے اور
 وہ اس انتظار میں بیٹھا ہے کہ تیل میں اس کی راہیٹی بڑھ جائے۔ دولت سعودیہ
 یا بحرین کے ساتھ حدود کے جھگڑوں سے اسے گہری دلچسپی ہے اور اس کا سبب

بالکل ظاہر ہے۔

قطر کے مغربی ساحل پر، دوحہ کے بالکل مقابل دھان واقع ہے۔ جہاں تیل کا چشمہ نکلا ہے۔ وہیں پٹرولیم ڈیولپمنٹ قطر کا کمپ ہے۔ یہ کمپنی عراق پر پٹرولیم کارپوریشن کی ایک ماتحت شاخ ہے جس میں نیرائیٹ ڈیولپمنٹ کمپنی کے ۲۳،۵۰ حصے ہیں۔ نیوجرسی کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی اور سکونی۔ ویکو ام آئل کمپنی نیرائیٹ ڈیولپمنٹ کی مشترکہ مالک ہیں، شیخ قطر نے بحرین میں تیل دریافت ہونے کے بعد، مئی ۱۹۳۵ء کو اجارہ منظور کیا تھا۔ چار سال بعد دھان میں تیل کا پہلا چشمہ نکلا۔ لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے اسے بند کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں پھر کام شروع ہوا۔ اب اندازہ یہ ہے کہ اس حقے میں دس کھرب بیرل تیل موجود ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کی کہ اہل قطر اور بدوؤں کی امداد سے تیل نکال رہے ہیں۔ پاس ہی تیل ذخیرہ کرنے کے لیے بڑے ٹینک نصب کر دیئے گئے ہیں اور تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ بھی قائم ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۱ء سے تیل جہازوں میں لاکھ باہر جانا شروع ہوا۔

تیل کی دریافت نے قطر کے امن میں تحلیل پیدا کر دی ہے جولائی ۱۹۴۹ء میں شیخ عبداللہ ابن قاسم کو رائٹس کی رقم ملی سو ۱۹۱۳ء میں اپنے والد کا جانشین ہوا تھا جس نے ایک سو چار سال کی عمر میں انتقال کیا۔ شیخ عبداللہ نے اس رقم میں اپنے رشتہ داروں کو شریک نہ کیا اور حکمران خاندان میں امتلاذات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اگست ۱۹۵۹ء میں پہلے شیخ اور اس کے حامیوں کے خلاف ایک

Petroleum Development Qatar (ii) Near East
Development Company (iii) Socony Vacuum Oil
Company

مظاہر ہوا۔ بعد میں زود خود کی بھی نسبت آئی۔ برطانیہ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے جو قطر کے معاملات کا مختار تھا، مداخلت کی۔ شیخ عبداللہ ۲۰۔ اگست ۱۹۲۹ء کو اپنے بیٹے علی کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ اس طرح جزیرہ منائے عرب میں تیل کی وجہ سے جو پہلا انقلاب رونما ہوا تھا، وہ فرو ہوا۔

ضمیمہ باب

دولت سعودیہ کے متعلق مصنف کا بیان ختم ہو گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اس سلسلے میں مزید معلومات دلچ کو دی جائیں، جن کی طرف یا تو مصنف کی توجہ منطقت نہیں ہوئی یا وہ ۱۹۵۳ء کے بعد کی ہیں۔

بڑے شہر

اس وقت جدہ دولت سعودیہ کا سب سے بڑا شہر ہے، محلات تک پہلے اسی کے آبادی بہت کم تھی۔ دولت سعودیہ کے بڑے شہروں کی آبادی کا نقشہ ذیل میں درج ہے:-

جدہ	۱۸ لاکھ
مکہ مکرمہ	دو لاکھ
ریاض	ایک لاکھ بیس ہزار
مدینہ منورہ	پچاس ہزار
یہ ۱۹۵۶ء کے اعداد ہیں بعد کے اعداد ابھی تک مل نہیں سکے۔ یقین ہے کہ	

اب تک اس آبادی میں مزید اضافہ ہو گیا ہو گا۔ ریاض اگرچہ مرکز حکومت ہے اور اب مشرقی ساحل کی بندرگاہ دمام سے ریاض تک ریل بھی بن گئی ہے، جس کی وجہ سے آمد و رفت میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے تاہم یہ ظاہر اس کی آبادی میں زیادہ اضافے کا امکان کم ہے اس لیے کہ وہ اندرون ملک میں واقع ہے۔ تجارت یا کاروبار کا خاص مرکز نہیں۔ اس کی دو ہی خصوصیتیں ہیں، اول یہ مرکز سلطنت ہے و دوم سو سو سال سے دہائیت کا مرکز چلا آتا ہے۔

لکھنؤ کے آبادی مدت سے دو لاکھ کے لگ بھگ چلی آتی ہے۔ یہ حرم پاک کی وجہ سے عظیم ترین اور مقدس ترین اسلامی مرکز ہے ماسی عظمت و تقدس کے باعث اس مقام کی آبادی اتنی ہو گئی اور حجاج و زائرین کی متواتر آمد کے باعث کاروبار کے مواقع بھی خاصے پیدا ہیں۔ ہزاروں آدمی صرف حجاج و زائرین کی خدمت و رہنمائی کے سلسلے میں رہاں مقیم ہیں۔ تاہم آب و ہوا یا موقع اور محل کے لحاظ سے اس مقام میں کوئی جاویدیت نہیں۔ مدینہ منورہ آب و ہوا کے لحاظ سے جاریہ درجہ خوشگوار ہے۔ خصوصاً گراماں کے عین زرخا کا پانی مختلف اعتبارات سے ایک نادر شے ہے۔ تاہم وہ بھی اندرون ملک میں واقع ہے اور کاروبار کے مواقع وہاں بھی زیادہ نہیں۔ اس لیے وہاں کی آبادی بھی غالباً زیادہ نہ بڑھے۔ ترکوں کے عہد میں ایک مرتبہ آبادی انسی ہزار پر پہنچ گئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے اواخر میں بہت گھٹ گئی۔ اب پھر آہستہ آہستہ چالیس ہزار پہنچ رہا ہے۔

جدید بندر گاہ ہے۔ وہاں اکثر محکمہ متولی کے فوفصل خانے اور سفارت خانے ہیں۔ مصنف کے قول کے مطابق وہ باب الحج اور سفارتی مرکز ہے۔ غیر مسلم تاجر یا فن کار یا معش یا اجارہ دار یا نشرو اتقاہیں امداد دینے والے لوگ کہ کوہ یا مدینہ منورہ جا نہیں سکتے۔ جدید ہی میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اس عمومیت کے لحاظ سے جدیدہ کی اہمیت بڑھ گئی اور اس کی آبادی غیر معمولی ترقی کر گئی۔ اغلب یہ ہے کہ آئندہ یہ آبادی اور بڑھ جائے۔ جس طرح ساحل خلیج فارس کی نئی بندرگاہوں کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ مثلاً راس تنورہ، عقیر، اذہام، راس المشعب وغیرہ۔

زراعت

عربی ممالک میں سے دولت سعودیہ اس لحاظ سے سب پر مقدم ہے کہ وہاں زراعت کی ترقی پر ابتدا ہی سے توجہ مبذول رہی تاکہ اہل ملک کی ضرورت کے مطابق مطلوب جنس میں پیدا کرنے لگیں۔ مرحوم شاہ ابن سعود کے ابتدا ہی سے اس کا خاص خیال تھا اور انہوں نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے ملک کے آبی وسائل کا اندازہ کر لیا تھا۔ دریا اور ندیاں تو بہت کم ہیں۔ زیر زمین آبی وسائل سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ اس طرح کے زراعتی فارموں کا ذکر مصنف نے پوری تفصیل سے خود کر دیا ہے۔

۱۹۵۷ء میں زراعتی ترقی کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کے لیے دس لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم خود وزارت نے منظور کی تھی۔ یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ مسابکات کے چھ حلقوں میں زراعتی مرکز قائم کر دیے جائیں۔ ان مرکوزوں کا وظیفہ

انتظامی حلقے

انتظامی لحاظ سے نجد یا نجد حلقوں یا صوبوں میں منقسم ہے اور ہر صوبے کے ماتحت متعدد حلقے ہیں جن کی کیفیت ذیل میں درج ہے:-

۱۔ نجد جس کا مرکز حکومت ریاض ہے۔ اس میں مختلف حلقے یا ضلع شامل ہیں۔ مثلاً:-

۱۔ ریاض کا حلقہ جس میں دادی الدواسر، الافلاج، الحارثی، الحرج العارض، الوشم، السدیر شامل ہیں۔

۲۔ تبصیم کا حلقہ جس میں قنیزہ، بزیذہ، الرس، المدنب وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ شمالی حلقہ یعنی الحائل جس میں شمر، غزوہ، مسیطر، تیار وغیرہ شامل ہیں

۴۔ حجاز:- اس کے مختلف حلقے یا ضلعے ہیں مثلاً تبوک، دجہ، یمبوغ، مدینہ منورہ، جدہ، لیث، قنذہ، طائف وغیرہ۔ اس کا مرکز حکومت مکہ مکرّم ہے۔

۵۔ عسیر:- اس کے بھی متعدد ضلعے ہیں دارالحکومت البہا ہے۔

۶۔ نجران:- جس میں اس کے متعلقات شامل ہیں۔

۷۔ الحما:- دولت سعودیہ کا مشرقی صوبہ ہے جو خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہے۔ اس میں ہفوف، قلیف، ظہران، قرینہ، الجبیل شامل ہیں۔ مرکز حکومت

ہفوف ہے۔

نظام حکومت

تمام اختیارات کا مرکز و مرجع بادشاہ ہے یعنی جلالۃ الملک سعود بن عبد العزیز

بن عبد الرحمن جو ۹ ذیہجہ ۱۹۵۳ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کا بھائی امیر فیصل بن عبد العزیز دلی عہد ہے۔ اگرچہ بادشاہ ہی مختار کل ہے۔ تاہم اس نے وزیروں کی ایک مجلس بنا رکھی ہے جن میں سے ہر ایک مختلف حکموں کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے۔ ۱۹۵۶ء میں وزارت کی کیفیت یہ تھی۔

امیر فیصل بن عبد العزیز (دلی عہد)	وزیر اعظم و وزیر خارجہ
امیر سلطان بن عبد العزیز	وزیر مواصلات
امیر فہد بن عبد العزیز	وزیر تعلیمات
امیر فہد بن سعود	وزیر دفاع
امیر عبد اللہ بن فیصل	وزیر داخلہ
شیخ خالد السدیری	وزیر زراعت
شیخ محمد بن عبد اللہ علی رضا	وزیر زراعت
شیخ محمد سرور الصبان	وزیر مالیات و اقتصاد
ڈاکٹر ارشاد فاران	وزیر صحت

ان کے علاوہ چھ ریاستیں ہیں۔ جن کے سپر وکٹی حکمہ نہیں مگر ان کا منصب وزیروں کا سا ہے۔

عدالتی نظام

دولت سعودیہ میں تین درجوں کی عدالتیں ہیں :-

۱۔ محکمت امور مستعجلہ جن میں معمولی مقدمات پیش ہوتے ہیں۔

۲۔ محکمت الشریعۃ الکبریٰ :- ان میں عام مقدمات پیش ہوتے ہیں۔

۳۔ عدالت ہائے مراۃ :- ان میں مقدمات کی ایلیس پیش ہوتی ہیں ۔
 ان کے علاوہ ایک مجلس عدالتی امور کی نگرانی کے لیے مقرر ہے جس کے تین
 ارکان ہیں۔ انھیں بادشاہ مقرر کرتا ہے۔ یہ مختلف عدالتوں کے کاروبار کی نگرانی
 کا فرض انجام دیتی ہے۔ حجاز میں دو قاضی القضاۃ ہیں، ایک مکہ مکرمہ کے لیے
 اور دوسرا مدینہ منورہ کے لیے۔

اخبار بینک اور بیمہ کمپنیاں

دولت سعودیہ میں کم و بیش نو اخبار اور رسالے شائع رہے ہیں۔ ان میں ایک اخبار
 "تافۃ الزیت" ظہران سے تیل کی امریکی کمپنی نکال رہی ہے۔ "ہم القری" مشہور و زمانہ
 اخبار ہے جو مکہ معظمہ سے نکلتا ہے۔ ایک ماہوار رسالہ الحج عربی میں نکلتا ہے جس میں
 حایوں کے لیے بھی مضامین و معلومات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ معلومات ازد
 فارسی وغیرہ میں بھی شائع کی جاتی ہیں۔

دولت سعودیہ میں کم و بیش نو بینک اور زمین بیمہ (انشورنس) کمپنیاں
 قائم ہیں۔

ریلوے اور بندرگاہیں

ترکوں نے سلطان عبدالحمید کے عہد میں حجاز ریلوے بنائی تھی جو مدینہ
 منورہ تک پہنچ سکی۔ آگے اس لیے نہ بڑھائی جاسکی کہ وقت کے شریف نے
 بددلوں کو ابھار دیا اور کہا کہ تمہارے آؤٹ بیکار ہو جائیں گے اور تم لوگ کھانے
 پینے کے وسائل سے محروم ہو جاؤ گے، ورنہ اسی زمانے میں ریل مکہ مراد و حیدر پہنچ
 جاتی جس سے حج و زیارت میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی۔ پہلی جنگ عظیم میں

شریعت حسین نے بغاوت کی تو حجاز ریلوے پر سب سے بڑھ کر تباہی آئی اس لیے کہ کرنیل لارنس کی رائے تھی حبیب ناک یہ ریلوے تباہ نہ ہوگی۔ ترکی فوجوں کی آمد کا سلسلہ رک نہ سکے گا۔

چند سال ہوئے اس ریلوے کو از سر نو بنیادی کرنے کے لیے دولت سعودیہ حکومت اردن اور حکومت شام کے درمیان گفتگو ہوئی تھی اور بعض اصول طے بھی ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ اب تک کس قدر اصلاحی کام ہو سکا۔

اس اثنا میں شاہ ابن سعود مرحوم نے اپنی سلطنت کے مشرقی حصے میں دوام سے ریاض تک ریلوے لائن بنوائی جس کا ذکر مصنف خود کر چکا ہے۔ یہ ریلوے لائن مین سو باؤن میل ہے۔ تجویز یہ تھی کہ اس ریلوے کو بحیرہ قلزم تک پہنچا دیا جائے چنانچہ راستے کا معائنہ ہو چکا ہے۔ کل نو سو اٹھ تتر میل لائن مزید بنائی پڑے گی۔ بحیرہ قلزم پر علاقہ حجاز میں جدہ کے علاوہ ينبوع، مؤبیلج، دجہ اور رابیع مشہور بندر گاہیں ہیں۔ عسیر میں لیت اور فنقدہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام بندر گاہیں مغربی ساحل پر بحیرہ قلزم میں ہیں۔ مشرق خلیج فارس کی بجانب کے ساحل پر معیر اور قطیف پہلے سے مشہور بندر گاہ تھیں نیل کی کپنی نے اس تنورہ، دوام اور راس الشعب کے مقامات پر خاصی عمدہ بندر گاہیں بنا دی ہیں۔

میزانہ اور اسکے

۱۹۵۵ء کے بجٹ میں خرچ ایک ملین پینس کروڑ، پچاس لاکھ سعودی ریال تھا اور اتنی ہی آمدنی تھی جس کا قریب فی صد حصہ نیل کی رائیٹی پر مشتمل

تھا۔ اس میں خاص بات کی کیفیت مصارف یہ تھی۔

دفاع و پرواز سیمٹالیں کروڑوں لاکھ ریال

امور عامہ سولہ کروڑ ریال

مواصلات نو کروڑ ستر لاکھ ریال

تعلیمات چار کروڑ چھپن لاکھ ریال

حفظان صحت تین کروڑ نوے لاکھ ریال

۱۹۵۷ء میں دولت سعودیہ نے بین الاقوامی مالی سرپائے اور نشروارتقا کے بین الاقوامی بنک کی رکنیت قبول کر لی اور اس میں ایک کروڑ ڈالر کے حصے خرید لیے۔

واضح رہے کہ سعودی ریال کے بائیس قرش ہوتے ہیں۔ تین ریال اور سترہ قرش ایک ڈالر کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ سعودی اشرفی چالیس ریال یا چار پونڈ کے برابر ہوتی ہے۔

تعلیمات

۱۹۵۶-۵۷ء میں ملک کے انڈر پاسٹوپرائمری مدارس تھے، جن میں ہائسڈ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مدارس اور تعداد طلبہ میں خاصے اضافے کی امید تھی، مگر صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں ثانوی مدارس قائم ہیں۔ مابینا فنی مدارس کا افتتاح بھی ہو گیا ہے۔ مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ

International Monetary Fund

International Bank for Development and Reconstruction

اور ریاض میں معلمین کی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔ طلبہ کو بیرونی ممالک میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

علاوہ بریں ریاض میں عربی کالج ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حدیث اور دینیات کی درسگاہیں ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک سعودی کالج بھی ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض اور جدہ میں کتب خانے بھی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ مختلف امریکہ کے ذاتی کتب خانے ان کے علاوہ ہیں۔ تیل کی کمپنی نے بھی اپنے دائرہ کار میں ملازمین کے بچوں کے لیے بڑے اچھے سکول قائم کر رکھے ہیں۔

مہلذہب

آخر میں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ مہلذہب "میں کان کنی کا کام ۱۹۵۲ء سے روک دیا گیا۔ یہ کام صرف سترہ سال جاری رہا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جو مٹی نکالی جا رہی تھی، اس میں سے سونے کا تناسب روز بروز کم ہو رہا تھا اور اس پاس کوئی نیا ذخیرہ ملا نہیں تھا جس کے سلسلے میں کام جاری رکھا جاسکتا۔ ایک اور کان بھی دریافت ہوئی تھی، لیکن اس میں سے امید کے مطابق سونا نہ نکلا اور جس کان کنی میں خرچ آمدنی سے بڑھ جائے، اسے کون جاری رکھ سکتا ہے؟

تیل کی کیفیت

یہاں دولت سعودیہ اور دوسرے عرب ممالک کے تیل کے باب میں چند اعداد و شمار پیش کر دیے ضروری ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے، سمرز میں عرب کی قدر و قیمت اس اعتبار سے کتنی بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں مختلف ملکوں کے پٹرول

ہے جو تیل بکلا، اس کی کیفیت یہ ہے:-

کویت پانچ کروڑ چالیس لاکھ ٹن۔

دولت سعودیہ چار کروڑ اسی لاکھ ٹن

عراق تین کروڑ دس لاکھ ٹن

بحرین بیس لاکھ ٹن

قطر اٹھاون لاکھ ٹن

جو ذخیرے دریافت ہو چکے ہیں، ان کی کیفیت بھی ملاحظہ فرمائیے:-

کویت پانچ ارب چالیس کروڑ ٹن

دولت سعودیہ چار ارب ستاسی کروڑ ٹن

عراق دو ارب پینسٹھ کروڑ ٹن

اگر ان میں ایران کے تیل کے تین ارب ساٹھ کروڑ ٹن جمع کر لیے جائیں

تو پوری مقدار ساڑھے سولہ ارب ٹن سے کسی قدر زیادہ ہو جاتی ہے عرب

کے دوسرے حصول مثلاً قطر عمان وغیرہ کے ذخائر اس میں شامل نہیں۔

فلیج فارس کے پانیوں میں جو ذخیرے اب دستیاب ہو رہے ہیں، وہ بھی

مستثنیٰ ہیں۔ اس کے مقابلے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ ذخیرہ بلا (جنوبی امریکہ)

روس اور مشرقی یورپ کے تمام ذخیرے صرف سات ارب چھتر کروڑ ٹن کے

قریب ہیں، یعنی تنہا دولت سعودیہ، کویت، عراق اور دوسرے عربی خطوں

کے ذخیرے ہی ریاستہائے متحدہ، وینزویلا روس وغیرہ سے دگنے ہیں۔ دولت

سعودیہ کی رائٹلی پمپ سنٹ فی بیرل ہے۔

1. The first part of the paper is devoted to a general discussion of the problem of the existence of a solution of the system of equations (1) for arbitrary values of the parameters α and β .

2. The second part of the paper is devoted to a detailed analysis of the case of the existence of a solution of the system of equations (1) for arbitrary values of the parameters α and β .

1. General Discussion

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are continuous and have continuous partial derivatives of the first order with respect to x, y, z . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are bounded in the domain D of the variables x, y, z .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

Let us assume that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D . Let us assume also that the functions $f(x, y, z)$ and $g(x, y, z)$ are not identically equal to zero in the domain D .

دوسواں باب :

ربیع الخالی میں اکتشافی مہمیں

جزیرۃ العرب کی کوئی داستان اس وقت تک مکمل نہیں بھی جاسکتی جب تک نہیں برطانوی مکتشفوں کے شاندار مگر مدد درجہ خطرناک سفروں کا ذکر اس میں شامل نہ کر دیا جائے۔ ۱۹۳۱ء میں برٹرام ٹامس نے ربیع الخالی کو عبور کیا۔ اس سے دوسرے سال ٹمبی نے اس وسیع ریگ نارا کے شمالی مغربی حصوں میں چکر لگائے۔ ۱۹۲۶-۲۷ء میں تھیسگر کے سفروں نے عرب میں تفتیش و اکتشاف کے عظیم الشان کارناموں کو آخری منزل پر پہنچا دیا۔ ٹی۔ ای۔ لارنس نے ٹامس کی ہدایت عمدہ کتاب، ”عرب آباد آؤں“ کے پیش نظر لکھا۔

(i) Bertram thomas (ii) Thesiger (iii) Arabia Felix

کتاب انگریزی نام۔ زلہ قدیم کے مصری جزائر و ان عرب کوئین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ عرب بادان یا العرب البیضاء عرب حیات یا عرب الال (Arabia Deserta) عرب سنگستان یا عرب الحجر (Arabia Petra)

بہت محفوظے آدمی اس قابل ہوتے ہیں کہ کسی بڑے تاریخی دور کو اتمام پر پہنچا دیں۔ ہم نہیں جان سکتے کہ پہلا شخص کون تھا، جو نئے حالات اور نئی معلومات کی خاطر زمین کے ان حصوں میں چلا پھرا جہاں پیشتر کسی کا قدم نہیں پہنچا تھا، لیکن یہ جانتے ہیں کہ ٹامس اس تلافی کا آخری فرد ہے اور اس نے سفر بھی پرانے طریق پر کیا۔ اپنے اونٹ کی ٹانگوں کو رحمت دی، اپنے بل پر اپنا وقت اور روپیہ خرچ کر کے کیلیدہ پہاڑی جہاز میں پرواز کر سکتا تھا۔ موٹر کار میں بیٹھ سکتا تھا۔ ٹرک میں سوار ہو کر چھڑ سکتا تھا، لیکن اس نے آخری وقت پر گامزنی کی آخری فتح حاصل کی اور ہمارے ذمے جو فرض ماند تھا۔ اس سے ہمیں سبکدوش کر دیا.....
دندہ داؤٹامس لے۔

برٹرام ٹامس خلیج فارس کے علاقے کا ایک برطانوی افسر تھا، جو مستط کی ریاستی مجلس میں وزیر کی خدمات بھی انجام دے چکا تھا۔ وہیں موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں ٹامس پر اس غیر معلوم ریگ زار کا جادو چل گیا، جو عرب کے جنوبی حصے میں شمالاً جنوباً چار سو میل اور شرقاً غرباً آٹھ سو میل کی مسافت میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ موسم گرما میں رخصت لے کر سندھوستان کے خشک پہاڑی علاقوں میں راحت کی زندگی بسر کر سکتا تھا، مگر اس نے گرمیاں مستط ہی میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور سردیوں کے موسم میں رخصت لے کر وہ جنوبی عرب میں سفر کرتا، اسی موسم میں صحرائی علاقے کا چکر لگایا جا سکتا تھا۔

دردن وہاں کی بے پناہ حدت میں نقل و حرکت کا کون سا امکان تھا؟ ۲۸-۱۹۲۷ء کے سرزمینِ ماس نے اونٹ کی سواری پر عمان اور ظفار کے جنوبی ساحل کا چکر لگایا۔ دو سو دیاں گزر گئیں تو ظفار کے شمال میں ربیع الخالی کے بیرونی کنارے تک کا علاقہ دیکھا۔ اس سے پیشتر وہاں کسی فرنگی کا قدم نہ پہنچا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں وہ آخری عزم لے کر ظفار پہنچا تو تجربات کی دولت سے حصہ وافر اس کے پاس فراہم ہو چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر اپنے شناسا بیروئل کو تیز رفتار اونٹوں کے قافلے کی تیاری پر خفیہ خفیہ آمادہ کر لینے میں مہلت گزار دیئے۔ خاصے انتظار کے بعد حیب یہ نظر آنے لگا کہ شاید ماس کو کشتی میں سوار ہو کر مسقط واپس جانا پڑے گا۔ تو اچانک بیروئل کا ایک گروہ شمالی جانب سے سواری کے اونٹ لے کر پہنچ گیا۔ وہ لوگ ماس کو صحرا میں سے لے جانے کے لیے بالکل آمادہ تھے۔ کھالے کے لیے صرف آٹا، کھجوریں، چاول، مکھن یا بہت مقوڑی دوسری چیزیں لے لی تھیں۔ کوئی خیمہ بھی ساتھ نہ لیا۔ تاکہ بوجھ زیادہ نہ ہو جائے۔

ظفار سے شمالی جانب روانہ ہوئے۔ پہلے ساحلی میدان میں سے گزرے پھر پہاڑ کا دامن آگیا جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ راستے میں عجیب و غریب غار اور پانی کے جوہر ملتے تھے۔ وادیل میں آدمی اور جان جمع کر رہے تھے، تاکہ مشرق کے مندروں کے لیے باہر بھیجا جاسکے۔ یہ کام وہ مین ہزار سال سے انجام دے رہے تھے۔ یہاں جگہ جگہ زمانہ قدیم کی تحریرات مقبروں کی تختیوں پر کندہ دیکھیں۔ ماس کا خیال ہے کہ وہ قبروں کی لڑھکیں تھیں۔ یا ممکن ہے

یہ تحریریں قدیم بابائیوں کی ہوں۔ جو ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔
 قافلے کی زقار سست تھی۔ جہاں اچھی چراگاہ نظر آتی، بدواؤ نہ پڑتے تاکہ
 جانوروں کو خوب چارہ کھالیں۔ آگے آنے والے خطے سراسر خشک اور بے آب
 تھے۔ رفتہ رفتہ خشک وادیاں آنے لگیں، پہاڑیاں ختم ہو گئیں اور سامنے دور
 دور تک میدان ہی میدان نظر آتا تھا۔ بدو کھلنے کی چیزیں تول جلا کر اور بانٹ
 کر کھا لیتے تھے۔ مگر اونٹوں کو ہر شخص بہتر سے بہتر جگہ پر آنے کی کوشش کرتا
 تھا۔ اب ایک سو میل تک ایسے علاقے ہیں سے گزرا پڑا جو کسی حکومت کے زیر اثر
 نہ تھا۔ چونکہ یہاں ہر وقت پھالے کا خطرہ تھا۔ اس لیے بدوؤں نے ظہر و عصر
 اور مغرب و مشاکی نمازیں جمع کر کے پٹھنی شروع کیں۔ داد کا حقان سے آگے
 بڑھے تو بدوؤں نے ایک جگہ اونٹوں کے پاؤں کے نشان بتائے، ماتم ہی کہا
 کہ یہ بہت پرانے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ اور مقام کی خشکی و بے آبی
 کے باعث محفوظ رہے ہیں۔ بدوؤں نے بتایا کہ یہ ادیار کا راستہ تھا، جو ایک
 زمانے میں مشرقی عرب کا بڑا شہر تھا۔ اور شمال سے جنوب کی طرف آنے والے
 قافلوں کے راستے میں پڑتا تھا۔ اب وہ ریت کے ٹیلوں میں دب گیا ہے۔ ایک
 نے فکر کیا کہ میں لڑا کپن میں عرب کا یہ حصہ خوب دیکھ چکا ہوں۔ عجیب و
 غریب پتھر دیکھے، جن کے کنارے دفنہ آنے دار تھے۔ نیز جگہ جگہ ظروف گلی
 کے لال اور پیلے ٹکڑے اور دوسری کئی چیزیں ملیں، جن سے صاف ظاہر
 ہوتا تھا کہ ایک زمانے میں یہ حصہ خوب آباد تھا۔
 ٹامس کے لیے چھان بین اور تحقیقات کا کوئی موقع نہ تھا۔ البتہ اس کے

دل میں یہ خیال مزبور پیدا ہوا کہ ممکن ہے پاؤں کے نشان کسی ایسے قافلے کے ہوں جو وہاں لے کر خلیج فارس کی جانب نکل گیا ہو۔ یمن کے شہر راب کو عرب کے آثار قدیمہ کا سب سے بڑا تحفہ سمجھا جاتا ہے گم شدہ آوار کے معے کا حل ایک بہت بڑے راز کا انکشاف ہوگا۔

آگے علاقہ خشک سے خشک تر ہوتا گیا۔ پہلے معلوم ہوتا تھا کہ جیسیم کے مہوار میدان ہیں۔ پھر کنکروالی زمین آگئی۔ بعد ازاں کوہ نما قودہ ہلے رنگ شروع ہو گئے۔ وہاں ٹامس نے پہلی مرتبہ ایک آواز سنی جو موسیقی کے بھاری ٹمر کی سی تھی، جیسے درمیانے درجے کے دفانی جہاز کی سیٹی ہوتی ہے۔ یہ ریت کے سنسنے کی آواز تھی جسے عموماً ”گانے“ یا ”گنگنانے“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بہت سے سیاح اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

بڑا دل آویز ٹامس نے تپتے سوپ کے ساتھ ابلے ہوئے دیریا کا ایک ڈبر کھولا جو خاص تقریبات کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ اب وہ اونٹ بالکل تھک چکے تھے جو قطار سے ٹامس کو لے کر چلے تھے۔ لہذا انہیں گراہیہ سے کڑا پس کر دیا گیا اور مرہ قبیلے کے سردار شیخ محمد ابن ہادی کے ذریعے سے نئی سواریوں کا انتظام کر لیا گیا۔ چنانچہ ٹامس بیس آدمیوں کی ایک جماعت کے ساتھ یمنستان دکا کا کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ سفر کر چکنے کے بعد وہ شتانا نام کنوئیں پر پہنچ گیا جو اغازہ کے مطابق منزل مقصود یعنی دوحہ (دار الحکومت قطر) سے یمن سویس میل کے فاصلے پر تھا۔ شتانا پہنچ کر جماعت میں تیرہ آدمی جن نے گئے تیرہ لپچے اونٹ لے لیے تھے، پانچ اونٹ ہار برداری کے لیے

رکھے جن پتیس دن کے کھانے پینے کا سامان لا دیا گیا۔ پورے تانے میں قطر کے مرہ قبیلے کا صرف ایک آدمی تھا جو اس سال اس ریگ نامہ میں سے گزرا تھا۔

تیسرے روز وہ آخری آبادی سے گزر گئے۔ یہ آبادی کیا تھی؟ مرہ قبیلے کے ایک آدمی نے دو چھوٹے چھوٹے خیمے لگا رکھے تھے۔ اس قبیلے کا گزرا صرف کھجوروں اور شیر شتر پر ہے۔ ان کے نزدیک بہترین غذا یہ ہے کہ اونٹ کی کبھی نمک لگا کر تازہ کھا جائیں۔ صحرا میں ہرن بھی مل جاتے ہیں۔ کوئی مل جائے تو اس کے کباب کھاتے ہیں۔ ان کی عورتیں لت و دوغ صحرا میں بھی برقع پہنتی ہیں۔ وہ مسلسل گشت کرتے رہتے ہیں۔ جہاں چارہ پاتے ہیں، چند روز کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی صحرا کی سنسان خلوت سے اچانک باہر نکل کر تانوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ جب لوٹ کا مال مل جائے تو پھر ریگ نار میں اتنی دور نکل جاتے ہیں، جہاں کوئی ان کا تعاقب نہیں کر سکتا۔

انہیں کھوج اور دہری میں کہاں حاصل ہے۔ پاؤں کا نشان دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اونٹ کھلے رنگ کا ہے یا سفید رنگ کا، عورت دو شیرہ ہے یا منگھوہ، آدمی بوڑھا، تجربہ کار اور جنگجو ہے یا نا تجربہ کار، نوجوان عروں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ مرہ قبیلے کے کسی آدمی کی آنکھوں پر ٹپی باندھ دے کہ تین روز صحرا میں لٹے پھرو۔ رات کی تاریکی میں اسے حکم دے کہ کسی جگہ پر روپیہ دباندے۔ پھر اسی حالت میں اسے لے کر کسی دوسری طرف نکل جاؤ وہ دس برس کے بعد بھی لوٹے گا۔ تو جگہ تلاش کر کے دبا یا ہرا دیا۔ یہ نکل لے گا۔

اس مقام سے آگے پانی خراب ہونے لگا۔ ٹامس نے پانی کے بجائے انٹ کا دھوکا
 پینا شروع کر دیا۔ چھاپوں کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ مگر یوسم کی حدت بڑھ رہی تھی۔ جس
 سے ٹامس کی جسمانی قوت پر خاصا اثر پڑا۔ وہ شام کے وقت یروڈل کے حلقے میں
 بیٹھ جاتا اور ان کی باتیں سنتا۔ ایک بڑے تباہکار چار سال پیشتر میں اس حصے میں
 پہلے پہر اچکا ہوں۔ راستے میں چوہے اور جنگلی پلے اور چھوٹے بھیرے بھی نظر آئے۔
 ایک جگہ لومڑی بھی دیکھی۔ عقاب کا ایک بہت بڑا گھونسلہ ملا جس میں انڈے بھی
 تھے۔ مگر بدعقاب کے انڈوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔

مزید روز کے سفر کے بعد تاملہ سفید ریت کے خطے میں پہنچ گیا۔ جسے ٹامس کہتے ہیں۔
 یہاں میٹھا پانی ملا، مگر بعض کتھنوں نے توڑے ٹکڑے گھرے تھے۔ دوسرے دن رمضان
 شروع ہو رہا تھا۔ اگرچہ عربوں کو سفر میں روزہ تھکا کر لینے کی اجازت تھی مگر کوئی
 بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ سفر کی مشکلات سے بالکل بے پروا ہو کر سب نے روزے
 رکھے۔ اس سے ان کے مذہبی عقائد کی پختگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آگے سردی بہت بڑھ گئی۔ پھر آندھی آگئی جس سے درجہ حرارت چالیس
 سے گر کر تیس پر آ گیا۔ ٹامس کے متحرک کیمبرے میں ریت گھس گئی۔ سردی کی شدت
 کے باعث ہاتھوں میں لکھنے کی مکت نہ رہی۔ غرض اٹھارہ روز مسلسل تیز سفر کرتے

تھے یہ نام مستام ہے۔ اس دن ۱۱ م جون کے مئی کو ان کے ہیں۔ ٹامس نے اپنی کتاب میں
 درج ہے کہ یہ نام نہیں موجود کتاب کے مصنف سے یہ غلطی کس وجہ سے ہو گئی
 (در خطمرد Afabia Felix) "مرب آبادان ۱۹۱۰ء"۔ یہ خطمرد
 کا رمضان تھا۔ جونہر جنوری ۱۹۱۰ء سے شروع ہوا۔

کرتے اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں ریت ختم ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر راس کیا۔
 رہبر نے ٹامس کو بتایا کہ اونٹوں کی سب سے بڑی تعداد مصر، مناصیر اور
 منشل قبیلوں کے پاس ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک ان لوگوں میں بہت لڑائیاں ہوتی
 رہتی تھیں۔ پھر ابن سعود کی ہیبت اور خوف کے گو در عبداللہ ابن جلوی کے
 کے خوف سے روائیوں کا سلسلہ بہت محدود ہو گیا۔ آگے بڑھے تو دہائی سلطنت
 کی حد شروع ہو گئی۔ اس حصے میں جو رہبر ملا، وہ عموماً پانی لینے کی جگہوں کو چھپاتا
 مڑا چلا گیا، خیال غالباً یہ تھا کہ جرعات اس کے قبیلے کے لیے ضروری ہیں ان
 کا راز کسی پرافتاء نہ ہونے پائے۔

غرض اسی طرح چلتے چلتے ایک جھیل پر پہنچ گئے، جو کم دیش سات میل لمبی
 تھی۔ یہاں سے نظر کا علاقہ شروع ہو گیا۔ نظر ایک زمانے میں جزیرہ نما نہیں
 بلکہ جزیرہ تھا، پھر آہستہ آہستہ سمندر خشک ہو گیا۔ جھیل اس کے باقیات
 میں سے ہے۔ اس کے کنارے نمک کی ٹٹی بنی ہوئی تھی۔ اب اونٹ اور ریوڑ
 نظر آنے لگے۔ سوجھ بوجھ ہو گئے۔ دودھ کے قلعے کی برہنہ دیواریں نمودار ہوئیں
 ٹامس اپنی ہم میں کامیاب ہو گیا۔ ایک فرنگی نے پہلی مرتبہ ریت کے اس بے پناہ
 سمندر کو عبور کر لیا، جسے راجہ الخالی کہتے ہیں۔

اس جھیل کو سمندر العمرا کہتے ہیں۔ نظر کے جنوب مشرق میں جو خلیج
 حیدر ہے، قریب ہی یہ جھیل واقع ہے۔ اس کے پاس سے راستہ میاں
 نظر کے دارالحکومت دوحہ کو جاتا ہے۔ بورجہ الخالی کے سفر کے بعد ٹامس کی منزل
 مقصود تھا۔

یہ امر تعجب انگیز ہے کہ اکثر بڑے کارنامے متوازی انداز میں انجام پاتے ہیں۔ ایک سائنس دان زندگی کا نصف حصہ ایک منصوبے کی تکمیل میں بسر کر دیتا ہے۔ اچانک دوسرا آدمی اٹھ کر چند مہینے پہلے اسے دریافت کر لیتا ہے۔ کپتان سکاٹ قطب جنوبی پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ شیکلٹن اس سے چند مہینے پہلے پہنچ چکا تھا۔ برٹرام ٹامس نے ربح الخالی کو عبور کر کے وہم پور دی کر دی، جس کے لئے اس کا ہم وطن سینٹ جان فلیس سا لہا سال سے جدوجہد کر رہا تھا۔ فلیس اپنی کتاب "ربح الخالی" میں لکھتا ہے کہ میرے پندرہ سال اسی تنہا میں گزر گئے اور میں دیے پاؤں اس شکار کے قاقب میں لگا رہا، جس کا جوڑ بوڑا لگ کر کے اب میں نے خواندہ کتاب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ میں اپنے منصوبے کے تمام حصے پورے نہ کر سکا۔ لیکن اتنا کہ چکا ہوں کہ دل مطمئن ہے۔ یہ بھی نہیں کہ میں اس میدان میں سب سے پہلے اترا۔ تقدم و بوقت کا اعزاز میرے ایک دوسرے ہم وطن کو حاصل ہے۔ یہ مہر ابرٹرام ٹامس کے سر بندھنا ہے۔

برٹرام ٹامس نے ربح الخالی کو جنوباً شمالاً عبور کیا تھا۔ اس سے قریباً گیارہ مہینے

۱۷ Robert Scot ۱۸ مئی ۱۹۱۲ء کو ایک پارٹی کے ہمراہ قطب

جنوبی پر پہنچا۔ واپسی کے سفر میں ۱۷ مارچ کو وہ اور اس کے ساتھی بروی کی شدت اور ہوا کی تیزی کے باعث مر گئے۔ Ernest Shackleton، سکاٹ ہے جو جنوبی

دن پہلے قطب جنوبی پہنچا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں تحقیقات کے لیے قطب جنوبی گیا ہوا تھا۔ وہیں

فات پائی گئی Empty Quarter جو ربح الخالی کا لفظی ترجمہ ہے۔ یعنی عرب کا وہ پتلا

حصہ جو آبادی سے بالکل خالی ہے۔

بعد میں ۱۱ جنوری ۱۹۳۷ء کو اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ اسے شمالاً جنوباً عبور کرنے
 اس کی جماعت نظر سے چلی۔ اور نخلستان بیرجن میں پہنچ گئی جو قطر سے جنوب مغرب
 میں واقع ہے۔ جماعت میں کل انیس آدمی تھے۔ بروہہ، مناصیر اور عمان میں سے
 تھے۔ نہیں نے اپنے تین تین خاص خادم بھی لے لیے تھے۔ ایک کے ذمے اونٹوں کا
 انتظام تھا، ایک تھوچی تھا اور ایک باورچی تھا۔ ساتھ بندیس سانڈیاں بھیجن
 میں سے ایک کے سوا تمام کی تمام مانی نسل سے تھیں زمین میں گمارا ب ساتھ رکھا
 تھا، زیادہ تر کھجوریں اور پچا دل۔ قطر اور بیرجن کے وسط میں یہ قافلہ وادی صہبا
 میں سے گزرا جو زمانہ قدیم میں عرب کا بہت بڑا دریا تھا، اب وہاں سے بالکل خشک
 ہے۔ یہ دریا نجد کی سطح مرتفع میں سے نکل قطر کے قریب خلیج فارس میں گرتا تھا۔
 پانسر میل تک اس کے پاؤں کا پتا لگایا جا چکا ہے۔

بیرجن میں قافلے نے تین روز قیام کیا۔ ربیع الثانی کی شمالی سمت میں یہ تہذیب
 کی آخری چوکی تھی۔ عربوں کے گیتوں اور داستانوں سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ
 بیرجن ایک زمانے میں بڑا بارونق شہر تھا۔ یہ یقین کرنے کے وجہ موجود ہیں
 کہ ایک ہزار سال پیشتر خلیج فارس کی ایک کھاڑی اس کے قریب تک پہنچی ہوئی
 ہوگی اس لیے کہ بیرجن میں تار کے درخت اب تک موجود ہیں، ہاں بہت سے مکاؤں، چھوٹے چھوٹے
 قلعوں اور قنائیں یعنی زمین دوڑائی نالیوں کے باقیات اب تک موجود ہیں۔ بروہہ شاہ ابن سعود
 نے وہاں افغان کو آباد کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ان میں سے اکثر بخاریں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے
 ۱۹۱۱ء میں اگر کو نے وہاں ڈی۔ ڈی ٹی پھر کے کا انتظام کیا تھا تا کہ خلافت سکوت کے قابل ہو جائے
 قلبی کی پہلی منزل مقصود مقصد تھی جس کے متعلق افواہ تھی کہ وہاں ایک

خاصی بڑی آبادی کے گنڈ رہیں۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ محض ایک کنواں ہے جو ایک سو تترت گہرا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کنواں عام برووں سے بہتر بخیر و دل کے تیار کیا ہو گا۔ عام دستور یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق پانی لے چکنے کے بعد صحرائی لوگ کنوئیں پر لکڑیاں رکھ کر کھالوں سے ڈھانپ دیتے ہیں تاکہ متحرک ریت کے توڑے اسے بند کر دیں۔ یہاں نہیں کو متحرک پتھر دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ یہ اپنے اندر کی خاص قوت کے بل پر چلتے ہیں۔ مگر اغلب ہے وہ اس لیے حرکت میں آتے ہوں کہ ان کے نیچے کی ریت اڑنے لگتی تھی۔

بروؤں کے نزدیک وسیع صحرائی حیثیت گھر کے آگن سے زیادہ نہیں۔ مرد قبیلے کا ایک برو نکلا نام کنوئیں پر پہنچا۔ قریب لاکھ بیس بیس میں یہاں آیا تھا۔ اندازے کھلنے ریت میں چھپا دیئے تھے۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ جا کر کھودی اور بیس کے قریب مٹی کے گول اور صاف کھلنے نکال لیا۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک سوراخ تھا۔ عرب بچے اس کی کھیل کھیلتے ہیں جس کا نام ”دراج“ (پہیے) ہے۔

بروؤں نامس کی طرح نہیں ہے مگر شہر وں کے بہت سے افانے سن رکھے تھے۔ اس کا سب سے بڑا رہبر علی بن جبر تھا جس کا تعلق مرو قبیلے سے تھا۔ انہیں نے اس سے یہ ذکر کیا تو اس نے ایک گیت سنا دیا جس کے ایک سچے کامفوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

قرہ سے سورج کی شامیں شہر پر پڑ رہی ہیں
 اگر تیرا ہیرا اب اسے (شہر کو) بے سود تلاش کر رہا ہے تو اسے الزام دے
 اس لیے کہ ہلاک کرنے والی تو نے شہر کو زمین بوس کر دیا۔

نہ سوتی عباد قبا پہننے والے باقی رہے اور نہ ریشمی پیراں تنوں والے۔
 فلیبی کو ہر سال میں ادب آریا دوبار نام کے پراسرار شہر کی تلاش تھی۔ جب علی سے
 معلوم ہوا کہ وہ شہر کے کھنڈروں سے آگاہ ہے، تو فلیبی کو بہت خوشی ہوئی۔ چلتے
 چلتے وہ ایک چڑھائی پر پہنچے، جہاں سے کھنڈر قریب تھے۔ فلیبی لکھتا ہے:-

جب میں اس اونچے مقام کے بلند ترین حصے میں پہنچا تو ایک لمحے میں دوبار کے
 افسانے کی حقیقت منکشف ہو گئی۔ جس مقام پر قدیم شہر کے کھنڈر بتائے جاتے
 تھے میں نے اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ آتش فشاں پہاڑ کے دودھانے
 پہلو پہلو کھڑے ہیں۔ ایک زمانے میں زمین کے جوت سے لادے اور کھنگروں
 کا جو طوفان ابل کر ان دہانوں کے راستے بہہ نکلتا تھا، وہ آس پاس پھیلا ہوا
 تھا اور دامنے نصبت حصے تک ریت سے اگلے پڑے تھے۔ بہر حال اس
 وقت میرے دل کا تاثر یہی تھا۔..... میں نے سوچا یہ تھا دوبار، ریگنہ اور
 میں ایک آتش فشاں..... عظیم الشان ریگزار کے معے کا اس درجہ
 سنسنی پیدا کرنے والا محل کسی کے خراب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے ریت سے اٹے ہوئے ان دہانوں کو دیکھ کر جن کے ارد گرد کھنگروں
 کی بلند دیواریں کھڑی تھیں، بدوؤں نے رعب اٹھالی ہیں گم شدہ شہر کا افسانہ تیار کر
 لیا اور اسے دیکھا جائے۔ تو جس مقام کو دوبار کہا جاتا ہے، وہ واقعی انسان کے بنائے
 ہوئے قلعے معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ادبیات عرب میں گم شدہ شہروں کی بورداستانی شہر
 ہو گئیں، وہ محض آتش فشاں دہانوں پر مبنی ہوں گی، بلکہ ان کی کچھ حقیقت بھی ہونی
 چاہیے۔ ادب بدوؤں کا نامس نے ادب آریا جانے والے جس راستے کا ذکر کیا ہے، وہ ان

داروں کے جنوب مشرق میں کم دیش دو سو میل پر ہوگا۔ سال ۱۹۴۷ء میں اراکو کی ایک جماعت نقیش کے لیے نکلی تھی اس نے بھی ایک تباہ شدہ شہر کے کھنڈر دیکھے تھے۔ گویا ایک نیکو ذہن داروں کا ذکر آچکا ہے۔ اور ربح الخالی کا یہ محما بھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا۔

دہار سے فلپی تھوڑی دودا ایک طرف کھنکھ گیا اور اس رات کو بھی قطع کیا جس سے برٹرام ٹامس شیرازہ کے جنوب میں سے گزر چکا تھا۔ مرہ نیلے کے رہبروں نے گزرنے کے نشان بتائے۔ اگرچہ اس سفر پر ایک برس گزر چکا تھا مگر رہبروں نے بتایا کہ یہ نشان ہر شبہ سے بالا ہیں۔ جنوبی سمت میں مزید چند منزل طے کر چکنے کے بعد فلپی کا قافلہ بحر قیفا پر پہنچا جس کے ارد گرد ریت کے بڑے بڑے ٹیلے کھڑے تھے اور اس مقام کی حیثیت ایک "اضعی تھینڈر کی سی ہو گئی تھی۔ یکا ایک اس میں سے بھاری آواز آنے لگی، جو جہاز کی میٹھی یا موتی جہاز کے انجن سے چنداں مختلف نہ تھی، لیکن اس آواز میں موسیقی تھی۔ وہ مسرت انگیز تھی اور اس میں حیرت انگیز انداز کا نمبہ تھا یہ ریت کے ٹنگٹانے کی صدا تھی جو ایک سال پیشتر ٹامس بھی سن چکا تھا۔ فلپی نے اس کے متعلق مختلف تجربے کیے۔ وہ ٹیلوں پر چڑھ گیا۔ اور نرم دلائم ریت

لے برٹرام ٹامس اور سینٹ جان فلپی دونوں نے اپنی کتابوں کے آخر میں ہر لڑی ریتاں سفر کے مفصل نقشے دیے ہیں۔ انھیں دیکھنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ٹامس کو جہاں دہار یا اوبار کا نشان بتایا

گیا تھا، وہ فلپی کے دریافت کردہ دہار سے خاصا دور ہے بلکہ Amphitheater یعنی رومہ گا

وہ دور یا مضمون کھانا جس میں ارد گرد ہر جہت میں زہریلی غباریں اٹھاتی بیٹھا کرتے تھے

یہج کے میدان میں کھیل یا خوشوار جانوروں سے لڑا جانے والے کشتیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔

کو نیچے کی طرف دھکیلتا تو آواز دو تین منٹ تک آتی رہتی، لیکن دوسرے روز صبح کے وقت یہ تجربہ دہرایا تو قطعاً کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ اس طرح واضح ہو گیا کہ اس عجیب و غریب آواز کو درجہ حرارت، ریت کی نمی اور ہوا کے رخ سے خاص تعلق ہے۔ ممکن ہے ٹیلوں کی وضع قطع بھی اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کرتی ہو بہر حال یہ امر مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

جنوبی ممت میں غلبی کی آخری منزل ٹھہرنا تھی۔ یہ کنواں اس کے رہبر علی بن جہان نے ۱۹۲۹ء میں کھدوایا تھا۔ حبیب اس کے بہت سے ساختی خیمے اور اونٹ لے کر جمع ہو گئے تھے۔ مرہ قبیلے کے لوگ سرایہ جموؤں شمال کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس زمانے میں ابن سعود اور اسوان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ اور مرہ قبیلے کے ایک حصے نے اس سے الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شیخ علی نے پانی کے لیے ایک نشیب تجویز کیا۔ پچن فٹ زمین کھود دی تو پانی نکل آیا۔ اس حصے میں بدوؤں کے تعلقات سخت بگڑے ہوئے ہیں۔ اور ایسے کنوئیں پر کسی کا چومیں گھسنے سے زیادہ مظہر ناپہنہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ غلبی نے وہاں دو روز آرام کیا۔ اس لیے کہ وہاں سے وہ مغربی جانب روانہ ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ ربیع الخالی کے وسطی حصے کو قطع کرنا اور یاض کے جنوب میں جبل طریق پر پہنچ جائے۔ ٹامس بھی ٹھہرنا تھا۔ اور وہاں اس نے اپنے ساتھیوں کے بچے ایک اونٹ ذبح کر لیا تھا۔ یہیں سے اس نے نظر تک تین سو تیس میل کا سفر شروع کیا تھا۔ گویا ٹھہرنا دلوں سیماؤں کے لیے بے آب و گیاہ ربیع الخالی کے جنوبی و مغربی گوشے میں آخری خیمہ گاہ تھا۔ وہیں سے وہ اس سرزمین میں داخل ہوئے جس کی پچان بین اور

تفتیش پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ نلیبی مزید جنوبی سمت میں اس مقام کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں برٹرام ٹامس کو گم شدہ وہاں کا پتہ بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھی راضی نہ ہوئے۔ اور حصول نے کہا کہ ایک گروہ کو دیکھا گیا ہے۔ جو ممکن ہے حملہ آوروں کا گروہ ہو اور اس مقام پر جانا یقیناً خطرناک ہوگا۔ بدوؤں کی رضا مندی حاصل نہ ہو سکی۔ تو اسے جنوب کی طرف مزید سفر کا خیال ترک کرنا پڑا۔

قبلی کا آخری نصب العین یہ تھا۔ کہ راج النحالی کے جنوبی و مغربی حصے کی چھان بین کرے، جہاں نہ پانی کا کسی کو پتا ہے اور نہ چراگاہوں کا۔ بدو وہاں فرماؤ ہی جاتے ہیں۔ البتہ شکاری لوگ غیر متناہی بھی تھوڑی دور اندر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور وادی دواسر کی طرف سے بھی آجاتے ہیں، جو حیل طریق کا جنوبی سرا ہے۔ اس سفر کے لیے تینتیس مشائیرے پانی سے بھر لیے گئے۔ اور غذائی جنسیں ایسی رکھیں جنہیں پکانے کے لیے پانی کی ضرورت نہ پڑے۔ پھر اونٹوں کو آخری مرتبہ پانی پلا لیا گیا۔ مغربی جانب راستہ متوازی ٹیلوں میں سے گزرتا تھا۔ ایک خشک دریا کا بہاؤ بھی ملا جس میں مٹی پانی کے گھونگے تھے یہ دریا عسیر و مین کی پہاڑیوں سے نکلنا ہوگا۔ پھر وہ لوگ اس علاقے میں داخل ہو گئے، یہاں سرخ زیت کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ ان میں سے بعض لائنو فٹ بلند ہوں گے۔ پھر وہاں بند ہو گئی اور گرمی اتنی بڑھ گئی کہ معلوم ہوتا تھا، بھٹی میں سے گزر رہے ہیں۔ قدم قدم پر سراب نظر آنے لگے بارش خوب ہو جائے تو جفاکش بدو خشکار کی تلاش میں یہاں پہنچ جاتے ہیں، لیکن سات آٹھ سال سے بارش بالکل نہیں ہوئی تھی اور پورا خطہ سبزی سے ملسر خالی تھا۔

ایک سو چالیس میل کا سفر طے کر چکنے کے بعد بدوؤں نے اگے جانے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ آبلوئیل تک دو تہائی سفر بھی باقی تھا اور اونٹ پیاس سے مرے جا رہے تھے۔ بعض بے دم ہو کر زمین پر لیٹ گئے تھے۔ ان میں زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کے لیے پانی کی ضرورت تھی اور جو پانی ساتھ تھا، وہ آدمیوں کو منزل مقصود پر پہنچانے ہی کے لیے کافی تھا۔ لہذا پھر ٹمبریفا کا رخ کر لیا گیا۔ واپسی کے سفر میں بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔ رنٹا بھی سست تھی۔ آخری پتالیس میل بھاک دوڑ کر طے کیے اور ٹمبریفا پر پہنچ کر خود فلیس نے تین پیالے پانی پیا۔ وہ کہتا ہے۔ زندگی میں ایسا خوشگوار مشروب کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ پی چکنے کے بعد اسے یاد آیا کہ ٹمبریفا کا پانی خراب تھا۔ وہ سفر میں زیادہ تر چائے اور اونٹ کے دودھ ہی پر گزارا کرتا رہا۔

چند روز آرام کر کے سب تازہ دم ہو گئے تو جماعت کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ سامان کے اونٹ اس راستے سے ریاض بھیج دیئے گئے جس میں کوئیں ملتے تھے۔ فلیس نے آٹھ سو الہمت مرب تیار کر لیے کہ پھر ایک مرتبہ ربح الحالی کو عبور کرتے ہوئے آبلوئیل پہنچیں۔ روانگی سے پیشتر خوب مینہ برس گیا جس کا سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ فلیس لکھتا ہے :-

ہمارے ارد گرد ریت کے چوٹیلے تھے، ان پر ہوا کے جھکڑ بچتے تھے تو ریت کے بہاؤ بدل ان کے آگے اس طرح دوڑتے تھے جس طرح والکیئرز کے پیش

۱۰ Valkyries والکیئر ناروے کے دیو بالائی تھر شہد کی دیویاں ہیں، جو مہیا

زیر گھوڑوں پر فرائض سوتے ہوئے میدان جنگ کی طرف جاتی ہیں تاکہ بن جن کو جنگ میں قتل ہونا ہے انھیں منتخب کریں مقصود یہ ہے کہ ریت کی تیز رفتار کا فائدہ سامنے آجائے۔

اڑے چلے جا رہے ہوں جن ٹیلوں کی چوٹیاں بہت بلند تھیں، وہ ایسے نظر
آ رہے تھے جیسے ہوا میں سیاہ پرچم کھڑے ہوں اور صحرائے قریش پر برت
اڑی جا رہی ہو۔ سفید ریت کی چادریں یکے بعد دیگرے چلتی ہوئی ایسی
معلوم ہوتی تھیں گویا سواروں کے پر سے پے در پے حملے کر رہے ہیں، طوفان
کی حالت میں صحرائے نظارہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ دور سے گرج کی صدا
گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ اس پر بھلی کی خیر و کن چپک مستتر تھی
خیال ہوتا تھا۔ بھلی جھپکے ہوئے بادلوں کے میلے پیر ڈالنے پر تلی کھڑکی ہے
پانی پھرش کیڑوں میں بھریا گیا اور از سر نو سفر شروع ہوا۔ اب کئے نثار
تیز رکھی گئی اور پہلے پانچ دنوں میں ایک سو ستر میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ خیمہ
ساتھ نہ تھا، فلیسی اور بہت سے ساتھیوں نے حلف اٹھالیا تھا کہ اس سفر میں وہ
نہ پئیں گے تاہم ابھی دو سو میل طے کرنا باقی تھے۔ فلیسی لکھتا ہے کہ رات کے
وقت سفر کرنے میں روشنی کا ایک نہایت عجیب تجربہ ہوا۔ اونٹنوں کے سیاہ سائے
ریت پر پڑتے تھے تو ان کے ارد گرد دھند روشنی کے ہالے بن جاتے تھے، جن میں
ٹیلوں کے حاشیے کی جھاڑیاں صاف نظر آتی تھیں۔ اس روشنی کا ذکر عرب کے
دوسرے مسافروں نے بھی کیا ہے۔ ممکن ہے یہ ہوا کی غیر معمولی صفائی کا نتیجہ ہو
جب ریت سے یہ بالکل پاک ہوتی ہے۔ رات کے وقت جس علاقے سے
گزرے وہ بالکل مہوار تھا۔

سفر کا جو حصہ اب شروع ہوا، وہ سب سے زیادہ خطرناک تھا اس لیے
کہ ایک سو نو میل تک کسی طرف بھی پانی کا نشان نہ تھا۔ اگر کسی کی ٹانگ ٹوٹ جاتے

یا کوئی بیمار ہو جاتا تو یقیناً ایسا ہر حادثہ مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس جگہ ایک اونٹنی اور اس کے بچے کے پاؤں کے نشان ملے۔ بروڈل کا قیاس یہ تھا کہ کسی گروہ نے چھاپا مارا، اونٹ پکڑ لیے اور اونٹنی بچے کو نکل آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قیاس درست تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ ایک گلے اور اس کا بچھڑا پورے صحرا کو مبعودہ کے اصل مالک کے گھوڑے پہنچ گئے تھے۔

گرمی روز بہ روز بڑھ رہی تھی اور مریضوں کے آدمی کہتے تھے کہ یہاں غالباً بیس برس سے بارش نہیں ہوئی۔ ایک جگہ شتر مرغ کے انڈے کے ٹکڑے نظر آئے۔ گویا اس میں سے بچہ نکل چکا تھا۔ سامعیوں نے بتایا کہ یہ انڈے پچاس سال پیشتر کا ہوگا۔ اس لیے کہ ہمارے بروڈل نے پچاس سال پیشتر یہاں نزد شتر مرغ دیکھے تھے۔ سفر کی پتھرین منزل وہ سنگریلوں کا میدان تھا جسے اب تو بھرتے تھے۔ دعوپ بہت تیز ہو گئی تھی۔ اکیس گھنٹے میں بیس میل کی مسافت طے کی۔ میدان ختم ہوتا نظر نہ آیا تو ٹھہر گئے۔ غلی نے کمبوریں کھائیں۔ ناشپاتیوں کا ڈبا کھول کر نوش کیا، پانی پیا اور سواد ہو گیا۔

ابو بھر سے گزر کر یہ جواں بہت لوگ و ہٹا کی جنوبی پٹی کے انہوی سرے پہ پہنچ گئے۔ وہاں سے وادی دوا سر کے خشک پہاڑ میں داخل ہوئے۔ انہوی پہاڑوں کی چوٹیوں پر کامیاد خطہ نمودار ہوا اور بروڈل نے خوش ہو کر کہا کہ انشا اللہ کل ہمیں پھر آدمیوں کے چہرے نظر آئیں گے۔ دوسرے روز ایک گول برج لاسہ میرین سے روانگی کے بعد یہ پہلی عمارت تھی جو انہویں نے دیکھی۔ اگلے روز شہیل کی عورتیں لڑ چاتی ہوئی ملیں۔ اس طرح غلی نے پورے چھ سو میل کا سفر برج انہوی میں سے کیا

لیکن کسی کو یقین نہ آتا تھا۔

دور حاضر کے مکتشفوں اور سیاحوں میں سے آخری شخص ولفرڈ تھیسی گریس جس نے ربیع النحالی کی پچان بین اور تحقیق و اکتشاف میں حصہ لیا۔ اس اکتشاف و سیاحی کا آغاز افریقہ کے صحرائے وائل اور حبالی بستی میں کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں ابی سینیا (حبشہ) کے ائمہ اور اس پاس خاص کارنامے انجام دیے کہ نام پیدا کر لیا۔ جنگ ختم ہوئی تو عرب میں ٹڈیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک جماعت بھیجی گئی تھی۔ تھیسے گراس میں ملازم ہو گیا۔ اس زمانے میں اس نے بہت سے دور افتادہ علاقوں کے چکر لگائے۔ یہی زمانہ ہے جب عرب کے بڑے جنوبی صحرا ربیع النحالی نے اسے سمجھ کر لیا۔ چنانچہ اس نے ملازمت ترک کر دی۔ اور ۱۹۴۰ء کے موسم سرما میں اس علاقے کی جنوبی حد کے ساتھ ساتھ سفر کیا، جہاں کے صحرا معلوم نہ تھے۔ اگلے سال موسم سرما میں اس کا قافلہ نظارہ سے شمالی جانب تھا۔ کی طرف روانہ ہوا۔ تو ابوالکلیس کے جنوب مغرب میں باول بستیوں کا ایک مجموعہ ہے جو عمان کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نزدیک واقع ہے۔ جنہوں نے انگریزوں سے خاص عہد و پیمان کر رکھے ہیں۔ وہاں سے وہ عمان کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف گیا، پھر جنوب کا رخ کر کے بحر عرب کے کنارے پہنچ گیا۔ اس کے وسیع سفر کا پورا دور میانی حصہ اس صحرائی علاقے میں سے

Wiltred Theiser نے یہ صحرائیں حبشہ اور یمن کے درمیان ہے کہ

پہاڑی علاقے جن میں صحرائے عظیم کے اردو واقع ہے کہ صحرائے حبشہ کی حدود درگاہ ہے اور اور صحرائے حبشہ کی حدود درگاہ ہے۔

ہوا۔ جیسے پہلے کسی نے مذکور کیا تھا اور نہ اس کے حالات معلوم تھے۔ غالباً اس کی بڑھتی
 مہول میں سب سے بڑی اور اہم ہم وہ تھی جو اس نے ~~۱۹۴۸ء~~ ۱۹۴۸ء کے موسم سرما میں
 حضرت سے تختستان میں تک کی جو جہل طوفان کے مجولی سرے پر واقع ہے۔ اس
 میں رابع الخالی کا مغربی حصہ عبور کیا۔

بلاشبہ برطرام ٹاس اور سینٹ جان نلیسی بھی بھاری ساز و سامان لے کر نہ چلے
 تھے، تاہم تھیں گے کہ پاس سب سے کم سامان تھا۔ وہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء
 کو مندرجہ سے شمال کی طرف روانہ ہوا جو اس کے راستے کا آخری کنواں تھا۔ پہلے
 کنکرہ پلا میدان آیا، پھر ریت کے ٹیلے شروع ہو گئے۔ ہوا بڑی تیز اور سرد تھی، لیکن
 تھیں گے کی جماعت نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس لیے کہ وہ جہاں سے گزرتے
 تھے، ہوا گزر کے نشان مٹا دیتی تھی۔ اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ کوئی مخالف
 گروہ ان کا تائب کرتا ہوا جا پکڑے گا۔ اس حصے میں چھاپے پڑتے ہی رہتے
 تھے اور تھیں گے کے رہبروں نے چھاپوں کی لمبی لمبی کہانیاں سنائی تھیں۔

صبح اٹھتے ہی وہ مٹھی مٹھی بھر کھجوریں کھا کر ایک ایک پیالی سیاہ تہوے
 کی پی لیتے جس میں الائچی ڈال کر خوشبو پیدا کر لی جاتی۔ اونٹوں کی دو قطاریں
 بنا لیتے۔ ایک قطار میں تین اور دوسری میں چار ہر پچھلے اونٹ کی نکیل اگلے اونٹ
 کی دم سے باندھ دیتے۔ آدمی تختہ می دیر تک پیدل چلتے تاکہ ذرا اگر ما جائیں۔
 جب مروج خاصہ لاد پر چڑھ آتا تو ساتوں کے ساتوں سوار ہو جاتے۔ نکلیں سول
 لی باتیں اور شام تک برابر سفر جاری رہتا۔ جب گرمی بڑھ جاتی تو عرب گیت
 گا کر دل خوش کرتے یا کبھی کبھار آپس میں باتیں شروع کر دیتے۔ پانی کے لیے

بوش کیزے مکلا سے خریدے گئے تھے، ان میں سے پانی ٹپکتا تھا۔ اس لیے روزانہ ایک پائینٹ پانی ہر آدمی کے لئے مقرر کر لیا گیا تھا۔ اندھیل ہو جانے تک سفر جاری رہتا۔ پھر اتنے کہ لکڑی فراہم کی جاتی اور ایک ایک اونچے موٹی روٹیاں پکائی جاتیں۔ جنہیں کھانے سے پہلے گھی سے چھڑ لیا جاتا۔ شاید ہی کسی فرنگی نے اتنی لمبی مدت تک ایسی غذا پر زندگی بسر کی ہو، جس پر تھیں گے نہ بسر کی۔

جب سٹیل دو تہائی قافلے پر رہ گیا تو یہ جماعت رملات بنگھڑ میں پہنچی۔ وہاں انہیں چار چار سو فٹ اونچے ریت کے ٹیلے نظر آئے۔ نیز انہوں نے میٹرے کے پاؤں کے نشان دیکھے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کراؤنٹوں کے گزرنے کے تازہ نشان نظر آئے۔ اس سے بڑی تشویش بھیلی چنانچہ دو ساعتوں نے ادھر اُدھر بھر کر خوب دیکھ بھال کی۔ رات کو دو آدمی پہرے پر رہتے، جو لوگ سوتے ان کی نیند و قی بھی بھری ہوئی پاس رہیں اور گہری نیند کا موقع کسی کو ملتا۔ ۱۸ جزیری انہیں نے ایک خشک پہاڑ میں پڑاؤ کیا، جہاں سے تیس میل پر ایک شہر کے کنڈر آتے۔

اسی مقام پر پھر آصفی تھا، جس کے متعلق عجیب افسانے بدوئل میں مشہور تھے۔ مگر تھیں گے کے ساعتوں کو وہ مقام معلوم نہ تھا۔ ان کے دوروزان کا سفر عارض میں رہا۔ جو سٹیل کے جذب میں جبل طوق ہی کا ایک بڑھا ہوا حصہ ہے۔ مشرقی جانب ٹیال ریت سے اوپر اٹھتی چلی آ رہی تھیں۔ مغربی جانب کوئی نو سو فٹ اونچی ایک چٹان کھڑی تھی۔ یہ چٹان سٹیل کے مغرب میں واقع ہے۔ جہاں وادی دوسرے جہاز کا سلسلہ

سہ مکلا حضرموت کی مشہور بندگاہ ہے۔ اور حضرموت کی قطعی ریاست کا صدر مقام

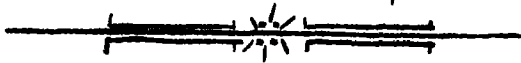
بھی یہی ہے۔

تو کہ باہر نکلی ہے۔ آخر ۲۱ جنوری کو تھیس گر اور اس کے ساتھی آٹھ مسافروں کے ایک گروہ سے دو چار ہوئے، جو سٹیل سے نجران کے جنوبی و مغربی شہر کی طرف جا رہے تھے۔ ملاقات خوشگوار نہ تھی۔ تاہم کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ پالیہ اڈنٹ پاس کے اٹھنے کنوئیں پر بیٹھ گئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ جو وسط عرب کی تہذیب کا آخری نشان سمجھنا چاہیے۔ مغربی ربع الحالی سر ہو چکا۔ عرب کے نقشے میں جو آخری براعلاقہ باقی رہ گیا تھا، وہ بھرا گیا۔

تھیس گر کے تئیل بننے کی خبر سن کر نلدی ریاض سے سوڑ میں روانہ ہوا اور اس کنوئیں پہنچ گیا جہاں تھیس گر پہنچا تھا۔ وہاں سے وہ اس شہر کے کھنڈر دیکھنے گیا۔ جنہیں تھیس گر نے نہیں دیکھا تھا، البتہ ان کا ذکر سناتا۔ اس مقام کی دریافت کا مہرہ اصل اراکوہ کی اس پارٹی کے سر رہے، جو تیل کے سلسلے میں چھان بین کے لیے نکلے تھے۔ اس پارٹی نے کچھ وقت اس حصے میں گزارا تھا۔ اسے سبانی رسم الخط کے نہایت خوبصورت کہتے تھے۔ اس نے بلے کے کھڑے ہوئے ابنا بھی دیکھے، جو برہنہ ظاہر مٹی کے تلوں کے کھنڈر تھے۔ ظروف نگہ کے کچھ ٹکڑے بھی پائے۔ اس کا اندازہ یہ تھا۔ کہ یہ آبادی دوسری صدی قبل مسیح کی ہوگی۔ کھنڈروں کا مقصد خاصا وسیع تھا۔ بعض مارتیں قلعہ بنادور مستحکم تھیں اور بعض مقبرے معلوم ہوتے تھے۔ اب ریاض سے نجران جانے کا جو کچھ گزرا تھا، گزرا سہ ہے۔ وہ ال کھنڈروں کے پاس سے گزرتا ہے۔ اسید ہے اس مقام کی چھان بین میں تاخیر نہ ہوگی۔

۱۹۵۸-۱۹۵۹ء کے موسم سرما میں تھیس گر نے جزیرہ عرب میں ایک اور سفر کیا۔ تاہم اڈنٹوں کے ذریعے سے ربع الحالی کو مہرہ کے لیے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اراکوہ کے ہوائی جہاز

مدن تاتے جاتے کسی مرتبہ اس عظیم الشان محراب کے بیچ میں سے پرواز کر چکے ہیں۔ اب ریلوے الخالی ہیں ماہرین ارضیات کی پارٹیاں چھان بین کر رہی ہیں۔ وہ موٹر گول میں سفر کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ صحرائیں جانے آنے والے ٹرک ہوتے ہیں اور وہ ایک ایک دن میں ایک ایک سو میل کا فاصلہ طے کر جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ایسے ٹریلر ہوتے ہیں جن کی فضا ضرورت کے مطابق تنگ ہوتی ہے۔ ان میں سو تے ہیں۔ انھوں نے جہاں جہاں مرکز بنا رکھے ہیں وہاں سے ہوائی جہازوں کے ذریعے تازہ پانی اور تازہ خوراک آ جاتی ہے خاص ضرورتوں کے لیے صحرائیں ہوائی جہازوں کے اترنے اور چڑھنے کے لیے جگہیں بنانے کی تجویز زیر غور ہے۔ غرض ریلوے الخالی بھی جو جزیرۃ العرب کا سب سے کم معروف اور ناقابل عبور حصہ تھا، اب منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس کے متحرک پتھر اس کی گنگناہی ریت، اس کے میدانِ نختان اور اس کے گم شدہ شہر زیادہ دیر تک پُر اسرار نہیں رہ سکتے۔



گیارہواں باب:

بحرین تیل اور موتیوں کے بزمیے

جب بادِ شمال چلتی ہے تو اڑتی ہوئی ریت کے باعث فضا کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ نظرِ آن میں بولگ تیل کی کمپنی کے ملازم ہیں۔ انھیں بازار اور گلیوں کے دوسری جانب کے مکان بھی نظر نہیں آتے۔ لیکن مطلع صاف ہو اور پاس کی پہاڑی پر چڑھ کر مشرق کی جانب دیکھیں تو الخبر کی سفید بندرگاہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس کے آگے علیحہ فارس کا پانی پھیلا ہوا ہے، جس میں قدم قدم پر بندر آبِ چٹائیں ہیں، اور کوئی بیس میل دور افق پر دھندلی دھندلی سی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہی جزیرہ بحرین اور اس کے تعلقات مثلاً محرق، بیتروہ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں، جو زیادہ آباد نہیں۔ یہ سب ریاست

لے بحرین کے علاوہ خاص طور پر قابل ذکر جزیرے یہ ہیں:۔ محرق، البکامہ و محرق کے جنوب میں ہے سمندر میں جزیرہ محرق سے اتصال ہوتا ہے، بیتروہ بحرین کے مشرق میں، الجزیرہ یا الذبی الخصال اور ام نسان غرب میں ہے۔

بحرین میں شامل ہیں۔ سب بڑا جزیرہ بحرین تیس میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے، اس کا سب سے بلند حصہ سمندر سے صرف چند سو فٹ اونچا ہے۔ منامہ اس کا سب سے بڑا شہر مرکز حکومت، بندرگاہ اور سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔ بحرین سے ایک پل الحرق تک جاتا ہے جو بلائی جزیرہ ہے۔ یہی عورتوں کی روایتی بندرگاہ ہے یہیں رائی ایلر فوس کا اڈا ہے۔ جسے برطانیہ اور امریکہ دوران جنگ میں استعمال کرتے رہے۔

آب و ہوا قدرے مرطوب ہے۔ بڑے جزیرے کے شمالی حصے کے سوا آپ رواں بہت کم ہے۔ شمالی حصے میں چشمے ہیں۔ ان کا مرکز بھی وہی ہے جس سے الحما کے چشموں کو پانی ملتا ہے اور جو سیح باغات کو سیراب رکھتے ہیں جزیروں کے شمال میں سمندر کے نیچے میٹھے پانی کے چشمے ہیں۔ ان سے گزرتی ہوئی دبیسی کشتیاں ہمیشہ پانی لیتی رہیں۔ خود بحرین کے باشندے چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ان چشموں پر پہنچ جاتے ہیں اور سمندر میں غوطہ لگا کر مشکیزے بھر لاتے ہیں۔

عرب آبادی ستر ہزار ہوگی۔ نصرت سے زیادہ سنی ہیں جو منامہ اور محرق میں رہتے ہیں، ایک چوتھائی شیعہ ہیں جو مختلف دیہات میں کبھرے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ تینے لوگ ہیں، وہ پاکستان، ہندوستان، ایران اور مشرقی افریقہ کے ہیں۔ کچھ یہودی بھی ہیں۔ روایات قدیمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدائی باشندے یمن سے آئے تھے۔

بہر حال یہ یقینی ہے کہ جزائر بحرین کو خلیج فارس کی سیاست و تجارت میں

ابتدا ہی سے اہمیت حاصل رہی۔ ایک اثری کتبے میں جو ۱۸۸۷ء ق م کا ہے ایک جزیرے کا ذکر ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بحرین ہی ہو گا۔ رومی مورخ سترابو اور رومی جغرافیہ دان پلینی نے بھی بحرین کا ذکر کیا ہے۔ حد درجہ دلچسپ تاریخی آثار میں سے کوئی پچاس ہزار کے قریب قبروں کے انبار ہیں جن میں سب سے بڑے اپنا کے متعلق پنی، جی کا راجہ مال نے بتایا ہے کہ وہ پچاس گز لمبا اور کوئی اسی فٹ اونچا ہے۔ چند قبریں کھودی گئیں۔ وہ سب ایک وضع کی نکلیں ان کے دروازے مغرب کے رخ تھے۔ ہر ایک میں ایک دوسرے کے اوپر دو کمرے تھے جو بڑے بڑے گھڑے ہوئے پتھروں سے بنائے گئے تھے اور اندر جدا سا پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ ان کی تعمیر میں لکڑیاں بھی استعمال کی گئی تھیں۔ حالانکہ لکڑی بحرین میں ناپید ہے۔ ان میں آدمیوں اور جانوروں کے پتھر پڑے تھے، ساتھ ہی دستکاری کی کچھ چیزیں تھیں۔ مثلاً سنہری تعویذ، بانوں کے نیچے برنجی زیور، اٹھتی دانت کے صندوقچے، شتر مرغ کے منقش انگوٹھ اور ٹوٹے ہوئے لگی ظروف۔ یہ ظروف سرخ مٹی سے بنائے گئے تھے، حالانکہ اس قسم کی مٹی بحرین میں ناپید ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یہاں کسی زمانے میں نیقیول کی آبادی تھی اور یہ قبریں ان کے لیڈروں کی تھیں۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ نیقیول کا اصل وطن بحرین ہی تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ دوسرے حصوں میں گئے۔ بہر حال یہ قبریں ۱۵۸۵ء ق م تا ۱۸۵۰ء ق م کے ہیں۔ گویا

۱۸۵۰ء ق م تا ۱۵۸۵ء ق م مشہور مورخ اور جغرافیہ دان سترابو میں پیدا ہوا، ۱۸۸۷ء ق م

پیدائش ۱۸۸۷ء ق م تا ۱۸۸۷ء ق م

۱۸۸۷ء ق م تا ۱۸۸۷ء ق م

P. B. Cornwall

۱۸۸۷ء ق م

ان کا تعلق آخری پرنسپل مہد سے ہے۔ اور اسی قسم کی قبریں یا مقبرے دولت سعودیہ میں بھی ملتے ہیں۔ مشرقی قریب کے ماہرین آثار قدیمہ کے جیسے اسی بارے میں مزید چھان بین مہم اور ضروری ہے جس سے تاریخ کے غیر معروف گوشے پر روشنی پڑے گی۔

سومیںوں کے عہد سے سولہویں صدی تک بحرین عربوں اور ایرانیوں کے درمیان میدان جنگ بنا رہا۔ ۱۵۰۸ء میں پرتگیزیوں کا ایک بیڑا یہاں پہنچ گیا اور وقت سے قریباً ایک صدی تک یہ جزیرہ پرتگیزی سلطنت کی ایک بیرونی چوکی رہا۔ پرتگیزیوں نے ترکی اور ہندوستان کے درمیان تجارت کے دروازے بند کرنے کے لیے خلیج فارس میں جو چوکیاں بنائی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی لیکن پرتگیزی ایرانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ۱۶۶۲ء میں بحرین کو ایرانی سپہ سالار کے وائے کر دیا۔ اس وقت سے ڈیڑھ سو سال تک بحرین پر ایرانی پرچم لہراتا رہا۔ ایرانی اس جزیرے پر جو دعویٰ کر رہے ہیں اس کی بنیاد یہی تصور ہے ۱۷۸۳ء میں جزیرہ نمائے قطر کی مغربی سمت کے ایک شہر زبارہ کے عرب اٹھے اور انہوں نے بحرین کے ایرانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ زبارہ اب سمندر کے پیچھے بھٹ جانے کی وجہ سے دلدل بن گیا ہے، لیکن قطر کے عرب اس وقت سے بحرین کے حکمران چلے آتے ہیں۔

بحرین میں آمدنی کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ موجود نہ تھا، لہذا یہاں کے حکمران بھی اپنے دوسرے مہسروں کی طرح بحری قزاقی، ناجائز اسلحہ فروشی اور عواموں کی تجارت میں سرگرم ہو گئے۔ ۸۰۰ مجبوری ۱۸۳۸ء کو برطانوی

بڑے نے بحرین کا سب سے بڑا جنگی جہاز ڈبلو دیا، اور جزیرے کے مشترک حکمرانوں شیخ سلیمان اور عبداللہ بنی احمد نے برطانیہ سے ایک عام معاہدہ کر لیا، جس کے مطابق فارس گری اور بحرین و بری قزاقی بندہ کر دی۔ اس طرح خلیج فارس میں قزاقی کا خاتمہ ہو گیا، لیکن عرب رئیسوں کی باہمی رقابتوں کا خاتمہ نہ ہوا اور برطانیہ برابر بحرین کی حفاظت کرتا رہا۔ جزیرے کی موجودہ حیثیت کے متعلق برطانیہ کے دارالعوام میں ۱۸- اپریل ۱۹۳۷ء کو ایک بیان دیا گیا تھا، جس میں بتایا گیا کہ بحرین برطانوی علاقہ نہیں، شیخ بحرین آزاد حکمران ہے، البتہ ملک معظم کی حکومت کے ماتحت اس نے خاص معاہدہ کر رکھا ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے برطانیہ اپنے پولیٹیکل ریزرٹ کے ذریعے سے خلیج فارس کے معاملات منبھالتا چلا آیا ہے۔ خلیج کی مختلف ریاستوں کے لیے برطانیہ کی حمایت پر نکتہ چینی بھی بہت کی گئی ہے، اور اس کی تعریف میں بھی کہ فی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ یہ علاقے بہت پس ماندہ ہیں اور زیادہ تر حکمرانوں کی پالیسی کہ تاہ اندیشی پر مبنی رہی ہے، اس لیے ان کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے رہے۔ برطانوی ریزرٹ جھگڑے بھی پھکاتا رہا اور خلیج فارس کی تجارت کو بھی اس نے محفوظ رکھا۔ مقامی زراعت اور حفظان صحت میں بہت اصلاح ہو گئی ہے۔ عوام کی خاصی بڑی تعداد مغربی تعلیم پا چکی ہے، جس سے بحرین کے مستقبل کے متعلق خوشگوار امید قائم کی جاتی ہے۔

۱۹۷۱ء کے موسم بہار تک پولیٹیکل ریزرٹ بوٹھر ایران میں رہتا

تھا۔ آج کل وہ بحرین میں مقیم ہے، جہاں گیارہ سال پیشتر برطانوی بحریہ نے اپنا مرکز بنالیا تھا۔ پولیٹیکل ریزرٹ کے ماتحت مختلف ریاستوں میں پولیٹیکل ایجنٹ موجود ہیں اور ان میں سے بعض افراد بڑے قابل تھے۔ وہ عربی زبان اور عربی ثقافت سے خوب واقف تھے۔ اور انہوں نے تمام ریاستوں کا انتظام ایسے انداز میں کیا۔ جو سلطنت برطانیہ اور مقامی باشندوں دونوں کے مفاد کے مطابق تھا۔ جن برطانوی انسروں کے ذریعے بحرین کے نشرو ارتقا اور بہبود کو خاص تقویت پہنچی ان میں سے ممتاز ترین سر چارلس بلگرے ہیں، جو پچیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک حکومت کا مشیر رہا اور یہی شخص سب سے پہلے بحرین میں مغربی انداز کی اصلاحات لانے کا ذریعہ بنا۔

بحرین قدیم ترین زمانے سے مشرق قریب میں موتیوں کی تجارت کا مرکز رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک زمانے میں باشندگان بحرین کی فی کس آمدنی دنیا بھر میں سب سے زیادہ تھی۔ موتی سمندر سے نکالنے کا انتظام نافذ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کی زندگی کا آغاز غوطہ خوری سے ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ موتیوں کے خلوں سے وسیع رانقیت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ خود جہاز پر موجود ہو یا نہ ہو، لیکن جتنے موتی نکلتے ہیں وہ سب اسی کے پاس جمع ہوتے ہیں۔ اگر جہاز اسی کا ہے تو موسم کے ذخیرے میں سے تمام خرچ نکال کر اچھٹا کر اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جہاز موتی نکالنے میں مصروف ہوتا ہے۔ تو وہ ایک چارپائی پر کھل اوڑھ کر رات کو سو جاتا ہے اور دن کو آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا، غوطہ خوروں پر نگاہ رکھتا ہے۔ تمام موتی اس کی بیٹی

میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔

موتی نکالنے والی زیادہ تر کشتیاں ساٹھ سے ایک سو فٹ تک لمبی ہوتی ہیں۔ اور ان میں صرف ایک بادبان لگاتے ہیں۔ کشتی کے دونوں جانب چھ چھ چتر لگے رہتے ہیں تاکہ سمندر بالکل سکون میں ہو۔ تھوڑے جھول سے کشتی کو آگے پیچھے کر سکیں چار پانچ آدمی ایک ایک چھپر پر متعین ہوتے ہیں۔

آج سے بائیس چوبیس سال پیشتر بحرین میں موتی نکالنے والی کوئی تین سو کشتیاں تھیں۔ ان کے علاوہ دو سو کشتیاں قطر اور اس پاس کی ساحل ریاستوں کی تھیں۔ ایک سو کویت کی اور پچاس دولت سعودیہ کی۔ ایک کشتی پر کوئی پینسٹھ آدمی موجود ہوتا ہے پچیس غوطہ خور پچیس سپر چلانے والے جو غوطہ خور مل کو نیچے لانے اور اُپر لانے میں مدد دیتے ہیں کچھ طلحہ اور کچھ کھانے پکانے کے لیے ایک خود ناخذ ہوتا ہے۔ دن کے وقت سب آدمی کام میں لگے رہتے ہیں رات کے وقت کشتی کے مختلف حصوں میں پہلو پہلو سو جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم طبقہ غوطہ خور مل کہے جو جہاز کا پلوہ تھوچ اور ناخذ کا حصہ نکال دینے کے بعد سچ مال آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ہر غوطہ خور دن میں کم و بیش اسی مرتبہ غوطہ لگاتا ہے۔ اور دو منٹ سے زیادہ پانی میں رہتا ہے۔ موتیوں والے صرف پچاس فٹ سے نوے فٹ کی گہرائی میں ملتے ہیں۔ مگر چھ سمندر میں شارک اور دوسری خطرناک پھلیاں بھی ہوتی ہیں اور پانی کا وہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، تاہم غوطہ خور بڑی ابھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بعض خاص لمبی عمر پاتے ہیں۔ جس زمانے میں غوطہ خور کی شروع ہو جاتی ہے وہ کھانا کم کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ پیٹ بھر جائے تو غوطہ نہیں لگایا جاتا۔

سکتا۔ ناشتا صرف چند کجوریں اور تھوڑے کی ایک پیالی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ دوپہر کے کھانے میں آبی کدوا استعمال کرتے ہیں۔ رات کا کھانا تازہ مچھلی چاول اور چائے پر مشتمل ہوتا ہے۔

مورج کل آنے سے دو گھنٹے بعد بارہ غوطہ خوروں کی پہلی پارٹی کام شروع کرتی ہے۔ جن رسول کے ذریعے غوطہ خوردہ سمندریں اترتے ہیں وہ بڑے مضبوط اور موٹے ہوتے ہیں۔ ان کے ایک طرف تیس پاؤں کا ایک پتھر بندھا ہوتا ہے ساتھ ہی غوطہ خوردہ کے پاؤں رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ ایک مضبوط رسی میں ڈوکری بندھی رہتی ہے جس میں پیالیاں رکھی جاتی ہیں۔ اسے غوطہ خور اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیتا ہے۔ بس وہ رسی میں پاؤں رکھتا ہے۔ لمبا سانس کھینچتا ہے۔ ناک پر غلاف چڑھا لیتا ہے۔ اور آٹا ٹاٹا پانی میں اتر جاتا ہے۔ اگر سطح پچاس فٹ سے زیادہ گہری نہ ہو تو غوطہ خور جہازوں سے اوچل نہیں ہوتا لیکن ان لوگوں کی فہم خاص طور پر عادی ہو جاتی ہیں اور وہ آستی آستی فٹ کی گہرائی تک سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ پانی میں اتر کر غوطہ خور ڈیڑھ منٹ تک ادھر ادھر تیرتا ہوا پیالیاں اٹھا اٹھا کر ڈوکری میں رکھتا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں پر انگشتانے چڑھے ہوتے ہیں تاکہ تیز گھونگوں کی کاٹ سے محفوظ رہیں۔ جیب سانس بھول جاتا ہے۔ فوراً اشارہ کرتا ہے۔ رسنے والے ڈوکری اوپر کھینچ لیتے ہیں۔ اور غوطہ خور ابھر کر پانی کی سطح پر آ جاتا ہے۔ جہاز سے تھوڑی دُور بھی ہر تیرتا ہوا دس پچاس قدم لیتا ہے۔ اسی اثنا میں ڈوکری کی تمام پیالیاں ایک برسی میں اٹا دی جاتی ہیں۔ تین چار منٹ کے بیچ ہم لے کر پھر غوطہ لگاتا ہے۔ اسی طرح بارہ آدمی

دس دس مرتبہ فرطے لگا کر چالیس منٹ کے لیے فارغ کر دیتے جاتے ہیں اور غوطہ
خودوں کی دوسری پارٹی کام شروع کر دیتی ہے۔ دن بھر میں جتنی سپیاں جمع کی جاتی
ہیں۔ انہیں اگلی صبح کے طلوع آفتاب کے بعد کھولا جاتا ہے۔ موم گایا رہ سپیوں میں
سے ایک میں موتی نکلتا ہے جو موم گایا چھوٹا اور بد وضع ہوتا ہے۔ اس کی قیمت
بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ تمام موتی اچھے ہوں یا بُرے نا خدا کے حوالے کر دیئے جاتے
ہیں جو انہیں صاف کر کے سرخ رنگ کے کپڑے میں باندھ لیتا ہے۔ اور پٹلی ایک
صندوق میں ڈال دیتا ہے جسے صرف اس کی گنجی کھول سکتی ہے۔ ایک گشتی دن
بھر میں موم گایا ایک یا دو اچھے موتی پاتی ہے۔

سپیاں جمع کرنے کا موسم چار مہینے اور دس دن رہتا ہے لیکن کشتیاں
بڑی ہوں یا چھوٹی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ سمندر میں رہتی ہیں
پھر واپس آ جاتی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ایک کشتی نے بیس ہزار کے موتی برآمد کیے
تھے۔ ان میں سے چار ہزار روپے نا خدا کو ملے۔ اڑھائی سو روپے ایک ایک غوطہ
خور کو۔ اور ایک سو اتنی روپے فی کس دوسرے آدمیوں کو۔ حکومت بحرین
موتیوں کی درآمد و برآمد پر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اور ہزاروں میں معنوی
موتیوں کی درآمد بالکل منع کر دی گئی ہے۔ علاوہ بریں موتی نکالنے والے بھی
باہر سے نہیں آ سکتے اور نہ ہی غوطہ خوری کے لیے مشینری وغیرہ لاسکتے ہیں
موسم کے ختم ہوتے ہی نا خدا کسی تاجر کے ہاتھ موتی فروخت کر دیتا ہے ایک
دن کے بڑے موتی موم بھر میں ہی میں چلے جاتے ہیں، لیکن ان میں سونا
کرنے اور صاف ڈالنے کا بہترین کام منہستان یا فرانس میں ہوتا ہے

پہلے موتی تیز رفتار کشتیوں یا دفاعی جہازوں کے ذریعے سے بھیجے جاتے تھے، آج کل رجسٹر کر کے ہوائی جہاز میں بھیجے جاتے ہیں۔

موتیوں کے تاجروں کو بحریں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ کسی کی فرم میں چلے جائیں اور پرکی منزل میں لے جاتے ہیں، وہاں ایک اندھیرے کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ پہلے چائے پیش کی جاتی ہے۔ پھر تاجر کے اشارے پر اس کا مددگار ایک فولادی صندوق کھولتا ہے اور اس میں سے ایک دستی گانٹا اور دھات کی چھنی نکال لیتا ہے۔ پیلے وہ موتی لینے جاتے ہیں جن کی وضع قطع اور رنگ اچھا نہ ہو۔ اوسط درجے کے موتی بھی ان کے مقابلے میں اچھے معلوم ہوں گے۔ نا تجربہ کار دوکاندار انہیں کم خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں تاجر ایک خفیہ خانہ کھلاتا ہے اور اس میں سے عمدہ موتیوں کی لڑیاں نکال کر پیش کر دیتا ہے۔

گزشتہ بیس سال میں موتیوں کی صنعت خاصی گر گئی تھی۔ سن ۱۹۳۱ء میں جتنے موتی فراہم ہوئے تھے ان کی قیمت سوا اکیس لاکھ روپے تھی۔ سن ۱۹۳۶ء میں یہ قیمت گر کر بارہ لاکھ تک پہنچ گئی اور سن ۱۹۴۱ء میں صرف پانچ لاکھ رہ گئی۔ اگرچہ قیمت گھٹتی رہتی رہی لیکن سن ۱۹۴۱ء کا درجہ پھر حاصل نہ ہوا اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سن ۱۹۳۱ء کے ابتدائی دور میں دنیا بھر کے اور کساد بازار دی شرملا ہو گئی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگوں کی قوتِ خرید میں بڑا ہمواری کی طرف سے مٹ گئی اور موٹر وول باس و وغیرہ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ جاپانیوں نے موتیوں کی پرورش کا فن

سبکدیا ہے۔ یہ موتی طبعی موتیوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے اور بڑے اور ایک وضع کے ہوتے ہیں، مگر ان کی قیمت طبعی موتیوں کے مقابلے میں صرف ایک تہائی ہوتی ہے۔ بھرن کے ایک تاجہ کا اندازہ ہے کہ جاپانی موتیوں کی وجہ سے طبعی موتیوں کی پیداوار میں پچاس فی صد کوڑے فی صد تک کمی واقع ہو گئی۔

حکومت نے غوطہ خوردی کی حالت بہتر جانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اب ان کا مستقبل قریباً محفوظ ہے۔ کوئی شخص قدرتی موتیوں کی ایک لڑی کے لیے دو ہزار ڈالر دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جبکہ ان کے مقابلے میں پروردہ موتیوں کی لڑی سات سو ڈالر میں مل سکتی ہے۔ نیز یہ موتی دیکھنے میں زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ قدرتی اور پروردہ موتیوں میں امتیاز صرف ماہر فن ہی کر سکتا ہے۔ جعلی موتیوں کی ایک لڑی صرف بیس ڈالر میں مل جاتی ہے۔ بلاشبہ بھرن کے بہترین موتی ضرور فروخت ہوتے رہیں گے لیکن وہ زمانہ گزر گیا جب جویرے کی میں پوچھتاٹی دولت صرف موتیوں سے حاصل ہوتی تھی۔

موتیوں کی تجارت کم ہوئی تو لوگوں نے آمدنی کے دوسرے ذریعوں پر توجہ کوئی۔ ان میں سے ایک ذریعہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے سفید رنگ کے مہلک مریوں کی پرورش شروع کر دی جہیں تمام عرب بہت پسند کرتے ہیں، لیکن اس قسم کے مہلک مریوں کی پرورش انصاء کے تحت تانوں میں ہی شروع ہو گئی۔ لہذا الفیجر محدود رہ گیا۔ بعض لوگوں نے پھلے، دھاتوں اور کٹھن کی کام شروع کیا، لیکن کاریگروں کی کمی کے باعث ان صنعتوں کا دائرہ بھی زیادہ

تہ پھیل سکا۔ اب پانی خامی مقدار میں فراہم ہو چکا ہے، لیکن گتے، لیموں،
خوبڑے، انجیر، کھجور کے علاوہ بعض بنریوں کی کاشت ہو سکتی ہے اور ہوتی
ہے۔ اہل بحرین نے کشتیاں بنانے، مرمت کرنے اور بادبان بنانے کی صنعت
بھی جاری کر دی ہے، اگرچہ اس سلسلے میں کویت کے ماہرین فن سے بڑا محنت
مقابلہ درپیش ہے۔

بحرین کے لوگ تجارت میں خاصے کامیاب ہیں۔ چڑے کے جوتے، ٹرائیٹ
رنالی کی ہلکی ٹوپیاں، اور صندوق ہر جگہ ملتے ہیں۔ غلیج فارس کے مختلف علاقوں
اور ایران کے بنے ہوئے قالین، عرب اور ہندوستان کے سوتی کپڑے
مرصع بنامول والے شجرہ و مع کار فرہنج، چاندی کے زیور و فیصدت بالیاں،
موتی اور سپی کے زیورات بہ کثرت پائے جاتے ہیں، مگرچہ تجارت میں بھی
دولت سعودیہ سے مقابلہ درپیش ہے۔

تیل کی دریافت نے بحرین کی معاشی حالت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی
ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ماہرین ارضیات نے تیل دریافت کیا۔ بیس سال بعد کی دنیا
کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کو اس اجارے سے منسوبی پیدا ہوئی جو ۱۹۲۵ء میں
انگریزوں کی ایک جماعت نے حاصل کیا تھا۔ اسی بنا پر بحرین پٹرولیم کمپنی ریگوا
کی بنیاد پڑی۔ جس نے ۱۹۳۲ء میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا۔ ۳۱۔ مئی
۱۹۳۳ء کو پہلے چشے سے تجارتی مقدار میں تیل نکلنے لگا۔ پھر مزید عرصے حیات
ہونے۔ تیل کے ٹینک بنادیئے گئے۔ سمندر کے نیچے پائپ بچھائیئے تاکہ ان
کے ذریعوں سے جہازوں میں تیل بھرا جا سکے۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں بحرین کا تیل اور

میں پہنچ گیا۔ اسی مہینے میں شیخ بحرین نے ایک اجارہ منظور کر لیا جو ۱۹۹۹ء میں ختم ہو گا۔ یہ اجارہ ایک لاکھ ایکڑ زمین پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جزائر بحرین کے پانی بھی اجارہ میں شامل ہو گئے۔

اس وقت بحرین میں تین چٹانوں سے تیل نکل رہا ہے۔ یہ چٹانے بحرین کے قریب وسط میں واقع ہیں، یعنی عوالی کے جنوب میں چٹانوں کی گہرائی دو ہزار آٹھ فٹ سے چار ہزار سات سو فٹ تک ہے۔ دولت سعودیہ میں تیل کی بہم رسانی قریب قریب ہوتا ہی ہے۔ بحرین سے صرف تین ہزار بیرل روزانہ نکلتے ہیں۔

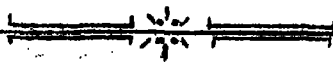
۱۹۳۶ء میں تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ لگایا گیا تھا جسے بعد میں وسیع کر دیا گیا۔ آج کل اس میں ایک لاکھ پچاس ہزار بیرل تیل روزانہ صاف ہوتا ہے۔ زیادہ تر تیل دولت سعودیہ سے بحرین لا کر صاف کیا جاتا ہے۔ ہر مہینے قریباً تین لاکھ بحرین پہنچتے ہیں۔ ”بیکو“ نے بحرین میں کل ساڑھے سات کروڑ ڈالر کا سرمایہ لگایا ہے۔ یہ سرمایہ اصل میں ٹیکساس کمپنی اور سٹینڈرڈ آئل کمپنی فورینا کمپنی کا ہے، جن کی وجہ سے ”بیکو“ معرض وجود میں آئی۔

کمپنی کی پالیسی یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو مقامی باشندوں کو ملازم رکھے۔ ۱۹۵۱ء کے شروع میں کمپنی کے کل ملازم ساڑھے ہزار سے کسی قدر زیادہ تھے۔ ان کا تناسب یہ تھا۔ اہل بحرین ۶ فی صد، سندوستانی، عراقی وغیرہ بارہ فی صد۔ باقی ساڑھے گیارہ فی صد امریکی، انگریز، اہل کینیڈا، جنوبی افریقہ نیز دوسرے یورپی تھے۔ عربوں کو زیادہ مشاہروں کے عہدوں پر مقرر کر کے

کے لیے تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کر لیا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں بحرینی ملازمین کی تعداد ۸۷۷۷ فی صد پر جا پہنچی تھی اور یہ سب لوگ کام خوب سیکھ چکے تھے۔ ”بکھڑے“ کے ناظروں نے تعلیمی اور مجلسی منصوبوں کی اہمیت بھی محسوس کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ بحرین اور برطانوی مشیروں کے تعاون سے یہ منصوبے جاری کر دیئے گئے ہیں۔ سرکاری اور پبلک بن گئے۔ دیہات میں کنوئیں کھود دیئے گئے۔ موسمی بنجارہ کا انسداد کر دیا گیا۔ مقامی کاروباری آدمیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ عرب ٹھیکیداروں نے وسیع تعمیری پروگرام پرے کیے۔ مقامی ملازمین اپنی مرضی کے مطابق مناسب کرائے دے کر کمپنی کے بنائے مکانوں میں رہ سکتے ہیں۔ کھوکھاروں کوں کے لیے الگ مکان بنے ہوئے ہیں جن میں ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہیں جو لوگ آس پاس کے دیہات میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ کمپنی اپنی بسوں میں انہیں پہنچا دیتی ہے۔ اور اپنی بسوں میں کام پر لے آتی ہے۔ اگرچہ مصارف بڑھ گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ”بکھڑے“ کے ملازموں کی تنخواہیں بھی دگنی سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ عوامی میں ایک ہسپتال بن گیا ہے جس میں ساتھ ہی سرخسوں کے رہنے کا انتظام ہے۔

شیخ بحرین سرسلمان الخلیفہ اور اس کے برطانوی مشیروں کی دانشمندی کا کرشمہ ہے کہ تیل سے جو راکش ملتی ہے وہ بڑے مناسب طریق پر خرچ کی جاتی ہے۔ اس رقم میں سے قریباً ایک تہائی شیخ اور اس کے خاندان کی ضروریات نیز حکومت و خدمات میں خرچ ہوتی ہے۔ ایک تہائی رقم ایسے کاموں میں لگا دی جاتی ہے کہ جب تیل مکلنا بند ہو جائے تو بحرین کے پاس متبادل ذریعہ موجود ہو۔ ایک

تہائی رقم جزیرے میں دور حاضر کی ضروری چیزیں مہیا کرنے کے لیے صرف کی جاتی ہے۔ گوریوں کی اصلاح ہو گئی ہے۔ سڑکیں پختہ کر دی گئی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کے اکثر بازاروں میں روشنی کا انتظام ہو گیا ہے۔ گندے پانی کے کاس کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ پانی کی بہم رسانی میں بہت امانہ ہو گیا ہے ہر جے کے مدارس جا بجا کھل گئے ہیں۔ بلدیات میں ڈسپنسریاں قائم کر دی گئیں ہیں۔ ایک ہسپتال کا انتظام حکومت نے سنبھال رکھا ہے۔ دامنی بیماروں کے لیے بھی ایک ہسپتال قائم ہو گیا ہے۔ جزیرے کے ایک اہم حصے میں ”چکو“ کی اوداسے کھیتی باڑی کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ مستعد کساروں کو موجودہ زمانے کی زراعت کے طریقے سکھائے جا رہے ہیں۔ کوئی شخص نل کنڈال لگوانا چاہے تو اسے مدد دی جاتی ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پانی کے مناسب استعمال کی کیا صورت ہے۔ اور نئے بیج بھی مہیا کیے جلتے ہیں۔ اسی طرح بحرن کے باشندوں کو امید پیدا ہو گئی کہ ان کا مستقبل خاص مصروفیت کا ہو گا اگرچہ بحرن اتنا وسیع نہیں کہ بہت بڑا کاروبار ہی اور تجارتی مرکز بن جائے۔ تاہم روپے کے دانشمندانہ صرف، تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کے صحیح استعمال اور تنخواہوں نے معیارِ معیشت اسی پہلے پر پہنچا دیا ہے جس سے بحرن کی تاریخ نا آشنا تھی اور حلیج فارس کی ریاستوں میں بحرن کو قابل رشک حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔



ضمیمہ

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ۱۹۵۶ء میں حکومت بحرین کی آمدنی پانچ کروڑ
اڑتالیس لاکھ روپے تھی۔ جزیرے میں مندرجہ ستانی سکے رائج ہے اور اس کی
قیمت ایک شلنگ چھپس مقرر ہے اس رقم میں سے ساڑھے تین کروڑ روپے
تیل کی رائٹھی میں وصول ہوئے، ایک کروڑ تیس لاکھ کسٹمز میں آئے۔ خرچ
کی بڑی مبالغہ یہ تھیں:-

حفظان صحت	پنجا لیس لاکھ
تعلیمات	پچھن لاکھ
حفاظت عامہ	پچاس لاکھ
امور عامہ	ایک کروڑ تیرہ لاکھ
بحرین کی نئی بندرگاہ	بارن لاکھ
ہمارے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے سے زیادہ کا سامان آیا اور قریباً	
بیاسی لاکھ کا سامان باہر بھیجا گیا۔ شیخ کویت نے نظم و نسق کے لیے ایک مجلس	
بنادکھی ہے، جس کی کیفیت یہ ہے:	

صدر	شیخ عبداللہ بن عیسیٰ الخلیفہ، وزیر تعلیم
رکن	شیخ عیسیٰ بن سلمان الخلیفہ
"	شیخ علی بن محمد الخلیفہ
"	شیخ خلیفہ بن محمد الخلیفہ

رکن	شیخ ذبیح بن محمد الخلیفہ
"	شیخ خالد بن محمد الخلیفہ
"	احمد العبران ناظم تعلیمات
"	سالم رحیمزاد الفت ہائے بحرین
"	جے، ڈبلیو۔ آر، ہمتھ سکریٹری
"	یوسف الشراوی اسٹنٹ سکریٹری و نائب ناظم تعلیمات

انگریزی اور عربی میں اخبار بھی نکلتے ہیں۔ بنک اور دوسری کمپنیاں بھی ہیں۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں چونکہ وزارت پچھریہ تعلیم تھے اور نقد اور بڑھ رہی تھی۔ (دیکھیں) کہ تعلیم کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ لبنان۔ مصر اور برطانیہ میں تعلیم کے لیے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

(یہ معلومات آج سے پانچ سال پہلے ہیں)

بارہ سوال باب:

کویت

خلیج فارس کے شمالی و مغربی گوشے میں ریاست کویت واقع ہے۔ شہر کویت کی آبادی کوئی ایک لاکھ کے قریب ہو گی۔ یہ بصرہ کے جنوب میں انش میل پر اور شط العرب کے دہانے سے ساڑھے میل پر ہے۔ شہر کے ارد گرد مٹی کی ایک فصیل ہے۔ کویت، غالباً کرٹ کی تصغیر ہے، کوٹ بستی قلہ۔ کوٹ اس قلہ کو کہتے تھے جو پرتگیزیوں نے سولھویں صدی عیسوی میں بنایا تھا، لیکن موجودہ کویت اٹھارہویں صدی میں آباد ہوا جب عقبی قبیلے کے لوگوں نے بنجر زمینوں میں پھرتے پھرتے یہ دیکھا کہ اس مقام کو قدرتی نیدرگاہ کی حیثیت حاصل ہے اور یہاں بھری تیل کی ترقی کے بڑے امکانات ہیں۔ کویت کی آبادی کا ایک حصہ یہ دستور خاندانوں کا ہے۔

سلاطین و تہذیبی کتاب جزیرہ العرب، میں لکھتے ہیں کہ تین قبیلوں کے رئیسوں نے آپس میں سادہ کر لیا تھا اور وہ کویت میں رہنے لگے۔ اول سیان بن احمد، باقی حاشیہ کے معنی

رہا اور اب بھی ایک چوتھائی آبادی غائب ہو چکی ہے۔ جو من سیاح کارٹن میں ہرے
 شہر میں لکھا تھا کہ اہل کویت کا خاص ذریعہ معاش موتی نکالنا، پھلپھلانا، کپڑا
 اور تجارت کرنا ہے اور وہاں آٹھ سو کے قریب جہاز مصروف کار ہیں۔ اٹھارویں
 اور انیسویں صدی میں سمندر میں سفر کرنے والے جہاز خلیج فارس سے زیادہ
 تر تجارتی سامان ہندوستان لائے جاتے رہے۔ کویت کی بندرگاہ سے
 بھیڑیل، ادن، چمرے، کھالیں، کھجوریں اور عربی گھوڑے باہر جلتے تھے۔
 (بقیہ نمبر ۲۳-۱۰) رئیس آل صباح جس کے ذمے حکومت کا کام تھا، دوم خلیفہ محمد بن آل
 خلیفہ جسے تجارتی کاروبار سونپ دیا گیا تھا سوئم جابر العتبی رئیس الجبلہ محمد بن
 جہاز رانی اور بحری فزاتی سنبھال لی تھی۔ پھر آخری دور میں زبارہ چلے آئے جو قطر
 میں ہے۔ امین ریحانی نے لکھا ہے کہ خلیفہ بن محمد کا بیٹا محمد زبارہ آیا تھا۔ جلالہ محمد اس کے
 رشتہ دار تھے۔ محمد بہت متقی اور پرہیزگار تھا۔ اہل زبارہ اس کا بڑا احترام کرتے
 تھے۔ یہ احترام اس کے بیٹے شیخ خلیفہ کو بھی حاصل رہا۔ شیخ خلیفہ کی وفات پر اس
 کا بھائی شیخ احمد رئیس قبیلہ بنا۔

یہ لوگ بحرین سے موتی خرید لاتے تھے اور انھیں فروخت کر کے روزی
 پیدا کرتے تھے۔ بحرین اس زمانے میں ایران کے زیر تصرف تھا اور وہ لوگ سینوں
 کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر جھگڑا ہوا اور آل خلیفہ کا ایک خادم مارا گیا۔
 ساتھیوں نے اس کا انتقام لیا۔ فریاد وقت کے ایرانی حاکم بحرین کے پاس پہنچی
 تو اس نے فوج جہازوں میں سوار کی اور زبارہ پر چڑھائی کر دی مگر شکست کھائی
 اور وہ لوگ بحرین میں رہنے کے بجائے ڈر کے مارے بدشہر چلے گئے شیخ احمد زبارہ
 بحرین پر قابض ہو گیا اس کے بعد اسے احمد فاتح کہتے ہیں۔ (بقیہ نمبر ۲۳-۱۰)

باہر سے کپڑا، شکر، چائے اور چاول آتے تھے۔ پھیلیاں کپڑے اور موتی نکالنے والے لوگ موسم میں خوب مصروف رہتے تھے۔ جہاز سازی کثرت میں ایک خاص صنعت بن گئی تھی۔

۸۱۷ء میں ایرانیوں نے بصرہ پر قبضہ کر لیا تو عراق کے لیے کثرت تنہا دیگر رہ گئی وہاں سے آمد و رفت جاری تھی۔ اب بھی کثرت میں ایک ہزار کے قریب ایرانی رہتے ہیں جو اس زمانے کے باقیات میں سے ہیں۔ اس زمانے میں انگریزوں نے خلیج فارس کے بالائی حصے میں تجارت کے لیے کونسیوں کا ایک سلسلہ قائم کر لیا تھا۔ جنھیں اصطلاح میں "کارخانے" کہتے تھے۔ ان میں سے ایک تجارتی مرکز بصرہ میں تھا۔ مگر جن حاکموں کو وہاں اقتدار حاصل تھا، ان کی وجہ سے کاروبار میں مشکلات پیش آئیں تو انگریزوں نے اپنا مرکز ۱۸۷۳ء میں بصرہ کو کثرت منتقل کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں جو انگریز پولیٹیکل انسپکٹر وہاں رہتا تھا، وہ بھی وہاں سے اٹھ کر جزیرہ فیلکے میں آ گیا۔ جو بندرگاہ کثرت کے دہانے میں واقع ہے۔ اگرچہ انگریزی اور خاماترقتی کر گیا تھا، مگر ۱۸۷۹ء میں کثرت نے ترکوں کی بیادوت قبول کر لی اور پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست تک یہی صورت قائم رہی۔

۱۸۵۷ء میں ایک برطانوی جو قیل نے تجویز پیش کی کہ دادی فرات میں ریلوے بنائی جائے تو اس کا آخری سٹیشن کثرت ہونا چاہئے۔ یہی تجویز بعض

(بقیہ صفحہ ۲۳۴) (الحک العرب جلد دوم صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶) Failaka

حافظ و میر نے لکھا ہے کہ جزیرہ کثرت سے کوئی بندرگاہ قائم نہ ہو سکتی تھی۔ (جزیرۃ العرب ص ۱۹۲)

دریسوں نے اپنی ماوراس کے مطابق سنہ ۱۹۰۱ء میں جو منوں نے برلین سے بغداد تک
ریلوے لائن بنانی چاہی تھی۔ اس کا بھی آخری سٹیشن کویت ہی تجویز کیا تھا۔ انگریز
ترکوں کے خلاف شیخ کویت کے حامی بن ہی چکے تھے جب خلیج فارس کے بارے میں
روس کے عزائم کی شہرت ہوئی تو شیخ مبارک والی کویت نے جنوری ۱۸۹۹ء میں
انگریزوں سے نیامادہ کر لیا جس کا مفاد یہ تھا کہ شیخ نہ اپنے ملک کا کوئی حصہ کسی
دوسری حکومت کے (انگریزوں کے سوا) حوالے کرے گا اور نہ کسی دوسری حکومت
کا نمائندہ اپنے ہاں ٹھہرائے گا۔ جیت تک برطانیہ سے اختیار نہ لے لے گا۔ طرہ
نے کویت کے لیے ایک رقم بہ طور امداد منظور کی۔ ساتھ ہی آٹا سا رو سا مان جنگ نہ چکا
دینے کا اقرار کر لیا، جو والی کویت کو آل رشید کے حملوں کی روک تھام کے قابل بنائے۔
سنہ ۱۹۰۲ء میں برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کو کویت میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔
پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فرج و ہاں جا ٹھہری تھی تاکہ ترکوں کی ناکہ بندی
کی جاسکے۔

شیخ مبارک مرحوم شاہ ابن سعود کے والد امام عبدالرحمن (کا عزیز دوست
تھا اور جب سعودی ریاض سے نکلے گئے تو شیخ کویت نے انہیں اپنے ہاں
پناہ دے دی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک مرتبہ امام عبدالرحمن اور شیخ مبارک نے
مل کر ریاض پر قابض ہونے کی ناکام کوشش کی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ابن سعود
عبدالعزیز مرحوم نے کویت میں سے اٹھ کر ریاض پر کامیاب حملہ کیا اور وہ شہر
پر قابض ہو گیا، جہاں سے اس کی ترقی اور عروج کا آغاز ہوا۔ دو گھرانوں میں
دوستانہ تعلقات کے باوجود ان کی طرف سے کویت پر حملے ہوتے رہے۔ اسی

دنانے میں اہل کویت نے شہر کے گرد بارہ فٹ اونچی فصیل بنائی تھی۔ اس کا گھیر دو میل ہے، نیز اس میں پانچ بڑے اور ستاون چھوٹے برج ہیں۔

دسمبر ۱۹۱۷ء میں یہ مقام عقیر اسم کا نفرنس ہوئی تھی تاکہ نجد، کویت، عراق اور بحرین کی سرحدوں کا فیصلہ ہو جائے۔ سر پرسی کا کس اس زمانے میں عراق کا ہائی کمشنر تھا۔ دہی یہ کا نفرنس متفقہ کرنے کا ذمہ دار تھا۔ ابن سعود کے علاوہ اس میں عراق کی طرف سے صلاحیہ، کویت کی طرف سے میجر مورڈر، برطانوی فوجی ایجنٹ، اور بحرین کی طرف سے کرنل ڈیکسن شریک ہوئے تھے۔ کئی روز تک بحثیں جاری رہیں۔ دوسرا ضرر کے اصول کے مطابق ایسی حد بندی اس سرزمین میں بہت مشکل تھی۔ جہاں خانہ بدوش قبیلے دور دور تک آزادانہ پھرتے رہتے تھے۔ باقی حدیں لڑے ہوئے تھیں، البتہ دو حلقوں کا معاملہ باقی رہا سر پرسی کا کس کی تجویز کے مطابق یہ فیصلہ ہو گیا کہ ان حلقوں کو کوئی الحال غیر جانبدار حلقے قرار دیا جائے۔ نجد، کویت اور عراق کے قبائل ان میں آزادانہ آجاسکیں اور اگر ان میں سے تیل نکل آئے تو نصف علاقے کے تیل کا ایک ابن سعود ہو اور نصف کے مالک عراقی و کویت سمجھے جائیں۔

کویت کی فیلڈ مارشال سے بہت سے من چلے مسافر دور دور کی سرزمینوں میں گئے۔ وہاں ہمسدر میں سفر کرنے والی کم و بیش ایک سو کشتیاں موجود ہیں جو لے عقیر ایک زمانے میں مجزا مشہور مقام تھا۔ یہ لہران کے جنوب میں ہے۔ اہل دسدر مقامات کی ترقی کے باعث اس کی شہرت ماضی ہو گئی۔

Moore

دیکھو

بچھڑنے سے تین سو ٹن تک وزنی ہوں گی۔ اور بندرگاہ کا کنارہ ایک وسیع گردی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مشرقی گوشے میں برطانوی رین پلینسی واقع ہے اور مغربی گوشے میں امریکی ہسپتال ہے۔ جہاز کا ناخدا یعنی کپتان ہمیشہ کویت کے کسی ممتاز گھرانے کا فرد ہوتا ہے۔ ناخدا کے بیٹے پھر سال کی عمر سے سمندر کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اور اٹھارہ سال کی عمر تک اپنی کشتی تیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ ملاح کی حیثیت میں کام کرنے کو اپنے ذمہ کے منافی تصور کرتے ہیں۔ کویت میں لکڑی نہیں ہوتی اور کشتی سازی کے لیے پوری لکڑی منقذین سے منگوائی جاتی ہے۔ مستول اور عرشے میں یلبار کا سا گوان استعمال کیا جاتا ہے پھر کشتی پچھلی کا تیل اس طرح مل دیا جاتا ہے کہ پانی اس میں سرایت نہیں کر سکتا۔ بادبان اور دوسرا سامان ملاح خود تیار کرتے ہیں۔

خلیج فارس میں جو کشتیاں اتبائی زلزلے سے استعمال ہوتی رہیں، انھیں لنڈہ کہتے ہیں۔ ان کے دوستول ہوتے ہیں۔ سامنے کے عیسے میں نہایت خوبصورت تختے دیبا جاتا ہے۔ پچھلے حصے میں پانچ کھڑکیاں رکھنے ہیں۔ یہ پتنگیروں کی مشہور کشتی۔ کنزول ایچی نقل ہتی۔ جو سولہویں صدی عیسوی میں خلیج فارس کے اندر آتی جاتی تھیں۔ چونکہ اس کشتی کی تعمیر بہت روپیہ خرچ ہوتا تھا، لہذا اس کی جگہ دو مستول والی ایک اور کشتی بننے لگی جو بزم کے نام سے مشہور ہوئی۔ موتی نکالنے کے لیے اس سے بھی چھوٹی کشتیاں استعمال ہوتی ہیں جنہیں چلیوتہ کہتے ہیں۔ Caravel یہ پڑنگال یا سپائین میں ایک قسم کی کشتی یا چھوٹا جہاز تھا جو سترہویں صدی عیسوی تک رائج رہا۔

کہتے ہیں یہ سبنوق، نام کی کشتیاں بحیرہ قلزم میں دیکھی جاتی ہیں، وہ شاید کویت میں کبھی نہیں بنیں۔

بڑے سمندروں میں جانے والے کشتیاں بنوانے میں ناخدا امرگا قرصدار ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں یہ کشتیاں کنارے پر بندھی رہتی ہیں۔ اور ان کے عرشے کو کھجور کے پتوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے، تاکہ سورج کی حدت اثر انداز نہ ہو سکے۔ ملاح اس زمانے میں موتی نکالتے رہتے ہیں۔ ستمبر میں گرمی کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور موتی نکالنے والے ملاح واپس آ جاتے ہیں۔ پھر چھڑائی ہوئی کشتیوں میں سرگرمی سے کام شروع ہو جاتا ہے۔ پچانچہ اچھیں شرط العرب لے جاتے ہیں۔ وہاں سے کھجوریں خرید لی جاتی ہیں۔ اور ملاح بھی کچھ سامان لے لیتے ہیں۔ بطور واسطہ ایک کشتی میں دو ہزار بوریاں رکھی جاتی ہیں۔ دفانی جہاز اس لیے ان کشتیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ کشتیاں سامان بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ علاوہ بریں دکانوں کا کام بھی دیتی ہیں۔

ہر کشتی پر ایک مؤذن ضرور ہوتا ہے۔ نماز کا وقت آتے ہی اذان کی صدا گونجتی ہے۔ تو تمام عرب دھنوک کے عرشے پر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ کھانا تیار ہوتا ہے تو سب مل کر کھا لیتے ہیں۔ پھر میٹھی چائے کا دور چلتا ہے۔ تو جوان ملاح بڑے ملاحوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ جو پانچ منٹ سے بھی کم میں ختم ہو جاتا ہے۔ پہرے کے لیے باریاں مقرر ہو جاتی ہیں۔ سورج چڑھ آتا ہے۔ تو ابلے ہوئے چاول اور خشک مچھلی کھانے کو ملتی ہے۔ پھر ملاح حق پیتے ہیں اور اپنا سر سامان درست کرتے رہتے ہیں۔ ظہر، عصر اور مغرب کی غازیں باقاعدہ باجماعت ادا کی جاتی ہیں۔

مغرب کے بعد چاول اگھی اور کسی قدر مچھلی دی جاتی ہے۔ پھر ہر ملاح شنبہ بخیر کہہ کر سو جاتا ہے۔ البتہ پہرے والے اور کشتی کھینے والے باری باری کام جاری رکھتے ہیں۔ بعض کشتیاں سیدھی عدن یا مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں میں پہنچ جاتی ہیں، بعض جنوبی عرب کے دو ایک ساحلی مقامات پر اس عرض سے رُک جاتی ہیں کہ مسافروں کو سوار کرالیں۔ مکلا (حضرموت) سے مشرقی افریقہ تک خوراک کے بغیر کرایہ آٹھ روپے فی کس ہے اور خوراک کے ساتھ نو روپے فی کس، عورت سے بارہ روپے کرایہ لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک ایک کشتی پر ایک سو اسی مسافر سوار کر لیتے جاتے ہیں۔ حضرموت سے کشتی عدن جاتی ہے اور وہاں سے چل کر صومالی لینڈ کے اس حصے میں ٹھہرتی ہے، جو پہلے اطالویوں کے قبضے میں تھا۔ مشرقی افریقہ کے ساحل پر پہنچ کر کشتی کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ جہاں رکتے ہیں، وہاں مرقا کی کجھوڑیں یا ایرانی قالین یا کویت اور عدن سے خریدی ہوئی چینی فروخت کرتے جلتے ہیں۔ ساتھ ساتھ موقع ملنے ہی سامان ناجائز طریق پر بھی بیچا جاتا ہے۔ مثلاً صومالی باندے چھوٹی سی ناؤ میں بیٹھ کر چپ چاپ کشتی کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور کپڑے کے تھان لے کر ان کے اوپر مچھلیاں بھرتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ناخدا کو زیادہ نفع مل جاتا ہے۔ خود عرب ملاح بھی چھپا کر سامان ساحل پر لے جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں مختلف چیزیں خرید لاتے ہیں۔ جب کوئی بڑا جہاز ہرزد ہوتا ہے، مثلاً کسی اجنبی بندرگاہ سے نمک بھر کر لے آتے ہیں اور کپڑے جلتے ہیں تو جہاز ہوتا ہے۔ اور ناخدا پھر پھر کر اپنے ہمسر ناخداؤں سے جو مانہ پورا کرنے کے لیے رقمیں فراہم کرتا ہے۔ پہلے غلاموں

کی تجارت بھی ہوتی تھی۔ کانگو کے محنت مند جوان یا ارٹریا سے تھوڑے بڑے رنگ و شیرازی
خاص قیمت پاتی تھیں۔ اس طرح ناپائز اسلحہ کامیاب بھی خاصا سود مند تھا، مگر اب
ان میں پاروں کی کمی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

یہ ہر حال صومالی لینڈ سے کشتی لائو پونچتی ہے، جو ساحل کینیا کے سامنے ایک جزیرہ
ہے۔ یہاں سے یہ لوگ ممباسا جاتے ہیں۔ اور ممباسا سے زنجبار جسے ان کی منزل
مقصود سمجھنا چاہیے۔ ممباسا میں بہت سے عرب جا رہے ہیں۔ بندرگاہ کے حصے
کی تجارت زیادہ تر انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ بیض چوکیدار بن گئے، بعض نے قبوہ
بیچنا شروع کر دیا اور بعض نے دکانیں کھول لیں۔ جب کوئی عرب منتقل دکاندار بن
جاتا ہے تو اپنے بھائی یا کسی دوسرے رشتہ دار کو بلا کر کان بنیعاں دیتا ہے اور
خود ایک سال کے لیے گھر موٹا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جس دکان کا سامان بیشکل بچیس
ڈالر کا ہو گا وہ خاندان کے تمام مردوں کو باری باری انفریقہ تک سفر کا موقع بہم پہنچا
دیتی ہے۔

عرل کے میان کے مطابق واسکو ڈی گاما زنجبار پہنچے ہیں کامیاب ہو گیا تھا، پھر
ایک عرب ماہر بحریات ابن ماجد کی رہبری میں ہندوستان پہنچا تھا۔ ابن ماجد غالب
الحاکم باشندہ تھا۔ اب عرب گہرے سمندر میں ہمارا فانی کا فن بھول گئے ہیں۔
امام احمد ابن ماجد نجدی جو قیقا نجد کے صدر الحاکم باشندہ تھا، پندرہویں صدی عیسوی
کا بہت بڑا اینر بحریات تھا خصوصاً بحر ہند کے متعلق اسے جو معلومات حاصل تھیں، وہ اس
دور میں اس سے پیشتر کسی کو حاصل نہ تھیں۔ اور اسے "اسد البحر" (سمندر کا شیر) کا خطاب
دے دیا گیا تھا۔ البتہ یہ یقینی نہیں کہ احمد ابن ماجد نے زنجبار سے (باقی صفحہ ۲۴۰)

اگرچہ مدیول تک وہ ریاض اور جہاز رانی میں دنیا بھر کے رہتا رہے اور اپنے جہاز
بے تکلف منگالور، ملایا اور چین تک لے جاتے تھے۔

زنجبار پہنچ کر کشتی کو خوب صاف کیا جاتا ہے نیز اس کی حرمت کر لی جاتی ہے
والیسی میں عموماً گاڑی کی لمبی لمبی بلیاں بھری جاتی ہیں جو زنجبار کے اندر جا کر حاصل
کی جاتی ہیں جس دریا کے راستے اندر جاتے ہیں اس میں مگر مجھ بھی بہت ہیں جنکس
بھی بے اندازہ ہیں۔ اس پاس جنگل میں پھروں کی بھی کمی نہیں۔ ساحلی مزدور ساتھ
لے لیے جاتے ہیں۔ اور بلیاں کاٹ کاٹ کر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بھر کر لے

(بقیہ صفحہ ۲۵۱) واسکو ڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔ اغلب خیال یہ ہے کہ احمد ابن جابر جوزیمین
اور زنجبار کے بیچ میں سے کسی بندرگاہ سے روانہ ہوا تھا۔ خود اس کی رہنمائی کا مقصد بھی عجیب
ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترنگیزوں نے اسے روپیہ دیا تھا۔ بعض کہتے ہیں شراب پلا کر دہوش
کر دیا اور جہاز میں بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ جب اسے ہوش آیا تو والیسی کی کوئی صورت نہ تھی
لہذا رہنمائی کی، اور واسکو ڈی گاما کو کالی کٹ پہنچا دیا۔ بعض ہوشیلے آدمیوں نے اس غریب
پر غدری کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ اس کے لیے کوئی بھی گنجائش موجود نہ تھی۔ سوچنے کی بات
ہے۔ کہ جب واسکو ڈی گاما اس امید کا چکر کاٹ کر افریقہ کے مشرقی ساحل پر پہنچا تھا تو
کیا وہ رہنمائی کے بغیر آگے نہ جاسکتا تھا؟ بیدہا نہ جاتا، تو افریقہ کے ساحل کے ساتھ غریب
کے ساحل پر پہنچ جاتا اور اسی طرح منہ درستان آ جاتا۔ نیز اس کے ساتھ صرف تین چابو جہاز تھے۔
کسے خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چھوٹا سا بیڑا آگے چل کر اہل مغرب کے لیے راستے کھول دے گا۔ اور
وہ سمندروں اور تہذیبوں کے الگ بین جائیں گے۔ یہ ہر حال احمد ابن جابر کی رہنمائی مسلم ہے
اگر یہ رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو یقیناً ترنگیزوں کو خاصی دیر تک حرید جہد و جہد باقی رہتی (صفحہ ۲۵۱)

آتے ہیں۔ اس اثنا میں ہوا کا رخ بدل جاتا ہے اور واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ سب خوش خوش گھروں کو لوٹتے ہیں۔ بعض کشتیاں واپسی میں بھی عدن یا حضر موت کی بندرگاہوں میں ٹھہر جاتی ہیں۔ مگر عام طریقہ یہی ہے کہ سیدھا کویت کا رخ کر لیا جاتا ہے۔ مسقط یا اس پاس کے دیہات والے جو بلیاں خریدتے ہیں وہ مطروح میں فروخت کی جاتی ہیں، لیکن اس تجارت کے لیے بحرین کی منڈی زیادہ نفع بخش ہے، جہاں فرمانروائے دولت سودیہ کے ایجنٹ یا شیخ بیوں کی ابھی قیمت ادا کرتے ہیں۔ کویت کے قریب پہنچنے پر کبھی پریم کشتی پر اڑنے لگتا ہے۔ ڈھول بجاتے اور گاتے ہوئے یہ لوگ گھر کرتے ہیں اور ان کا استقبال بھی بڑی دھوم سے کیا جاتا ہے۔ دس مہینے سفر میں لگ جاتے ہیں اور اس میں کم و بیش دس ہزار روپے منافع ہوتا ہے۔ اس میں سے ساتے کا خرچ نکال لیا جاتا ہے اور چار ہزار روپے کشتی کا مالک لے جاتا ہے۔ چار ہزار روپے ناخدا اور ملاحوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک ملاح کا حصہ ڈیڑھ سو روپے کے قریب بن جاتا ہے۔

اہل کویت کو ابتدا سے سمندر کے ساتھ گہری وابستگی رہی ہے لیکن جب سے وہاں تیل دریافت ہوا ہے۔ تجارت یا کشتی سازی یا مریٹوں کی برآمد پر زوال آ گیا ہے۔ اور ریاست کے مزدوروں کا بلہ حصہ تیل کی صنعت میں مصروف ہو گیا ہے

(بقیہ صفحہ ۲۴۰ کے بغیر مزدوران پہنچنا تعصیب نہ ہوتا) احمد ابن ابی جبر کی لکھی ہوئی کتابیں اور رسلے فرانس میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مطروح مسقط کے شمال میں سمندر سے ناظر ہے۔ ابن بطوطہ نے اسے اپنے نقشے میں مرقا لکھا ہے۔ میرے نزدیک حافظ وہبہ کا تلفظ یعنی مطرح صحیح ہے۔

۱۹۲۹ء میں گلف آئل کارپوریشن نے کویت سے تیل کا اجارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن معلوم ہوا کہ کویت اور برطانیہ کے معاہدے میں جو دفعہ توثیق کے متعلق تھی، شیخ کویت کے برطانوی مشیروں نے اس پر اصرار کے باعث راستہ روک رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کی کمپنیوں کے سوا کسی کو کویت میں اجارہ مل ہی نہیں سکتا۔ آخر طویل گفت و شنید کے بعد، جس میں امریکی وزارت سے بھی مدد لی گئی، ایک سمجھوتا ہوا اور کویت آئل کمپنی کے نام سے دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک نئی کمپنی بنی۔ اس میں نصف حصے گلف آئل کارپوریشن کے تھے اور نصف ایٹکوا ایرانی آئل کمپنی کے۔ اس کمپنی نے پچھتر سال کے لیے کویت میں چھ ہزار مربع میل کا اجارہ لے لیا۔

تیل کی دریافت کے لیے برمانے کا سلسلہ مئی ۱۹۲۶ء میں شروع ہوا اور سات ہزار سو پچاس فٹ کی گہرائی پہنچ کر اسے اپریل ۱۹۳۷ء میں چھوڑ دیا گیا۔ دوسرے آزمائشی برمانے پر برغان میں تیل کا بہت بڑا ذخیرہ مل گیا اور تیل نکالنے کا انتظام مئی ۱۹۳۸ء میں مکمل کر لیا گیا۔ یہ ذخیرہ تین ہزار چھ سو بارہ فٹ کی گہرائی پر تھا۔ اس کی بڑائی کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیل کے جو ذخیرے اب تک معلوم کیے جا چکے ہیں ان

Gulf Oil Corporation

۱۲۔ اس واقعہ سے مراد یہ ہے کہ برطانیہ نے معاہدہ کرتے وقت اپنے سوا تمام اجنبیوں کو بلا منظوری اجارہ دینے کی ممانعت کر دی تھی۔ گلف آئل کمپنی امریکی تھی، لہذا برطانوی مشیروں نے شیخ پر واضح کر دیا کہ یہ اجارہ اصل معاہدہ کے خلاف ہو گا۔

Kaowakhon Company

سب کی مقدار دو چوبیس ارب پیرل ہے۔ اور ضرر تھا برغان کا ذخیرہ بارہ ارب پیرل سے کم نہ ہوگا۔ کویت کی آبادی اگرچہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن ابھی تک دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہوئی، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس ریاست میں تیل کے ذخیرے نے فی کس اتنی بڑی آمدنی کا بندوبست کر دیا ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے ملک کے افراد کو یہ درجہ حاصل نہیں۔

جولائی ۱۹۶۲ء تک نو چھتے برائے جا چکے تھے۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ کام بند کر دینا پڑا۔ جون ۱۹۶۵ء میں دوبارہ کام شروع ہوا اور ۱۹۶۶ء میں پہلا ٹینکر احمدی کی بندرگاہ سے کویت کا خام تیل لے کر روانہ ہوا۔ گلف آئل کمپنی نے زیادہ ماہرین فن اور ساز و سامان مہیا کیا۔ اس سامان کے لئے کم و بیش اٹھ آٹھ بار بردار جہاز غلیج کویت میں یا احمدی کی بندرگاہ میں ٹھہرے رہے یہ سب لوہے کے ٹریک (پائپ) تعمیر کا سامان، ٹریکٹر اور دوسری چیزیں پہنچاتے تھے۔

دولت سعودیہ میں اراکوں نے سڑکوں کی تعمیر سب سے آخر میں رکھی تھی۔ لیکن کویت آئل کمپنی نے سڑکیں سب سے پہلے بنائیں۔ چنانچہ کویت سے ہوائی اڈے تک، نیز کویت سے تعمیری مرکز، نیز برغان کے ذخیرہ نقطہ تک نہایت عمدہ اور نچتہ سڑکیں بن گئی ہیں۔ برغان کے مشرق میں ایک پہاڑی پر تیل جمع

لئے طلب یہ ہے کہ قطر کی زمیں ایک طرف روس میں شالین گراؤنگ اور دوسری طرف مصر میں اللہ میں تک پہنچ گئی تھیں۔ ان کی پیش قدمی نہ کرتی تو اندیشہ تھا کہ وہ ایک طرف سوئز کو عبور کر کے شام میں اور دوسری طرف تققاز کو عبور کر کے ایران میں پہنچ جائیں گی اور اسی تیل کے ذخیرے مفت مل جائیں گے۔ خود انھیں کچھ محنت نہ کرنی پڑتی۔

رکھنے کے ٹینک بنادے گئے ہیں، جن پر ایو مینیم کپنیٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ صحرا کے دھندلکے میں سورج کی تیز روشنی کے باعث ان سے خیر و کن چمک پیدا ہوتی ہے پاس ہی اسی نام نیا شہر آباد ہو گیا ہے جس میں کمپنی کے لازم رہتے ہیں اس کے بازار اور گلیاں بچتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہیں۔ مشینوں کی مرمت کے لیے وسیع دکانیں ہیں۔ نہایت عمدہ شگلوں کی قطاریں ہیں خاص ٹھنڈا رکھنے کا بہت اچھا انتظام کر لیا گیا ہے۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ تازہ پانی ناپید تھا۔ کمپنی نے کئی کوشش کھدوائے، لیکن ان میں سے کھارا پانی نکلا لہذا میٹھا پانی ٹینکوں میں بھر کر لایا جاتا تھا۔ اب ایک نئی مشین منگوا لی گئی ہے۔ جو پانچ لاکھ گیلن منڈکاپانی روزانہ صاف کر لیتی ہے۔ اس نے پانی کی بہت سی ضرورتیں پوری کر دی ہیں البتہ ابھی تک باغوں کو زیادہ پانی نہیں مل سکتا اور ریاست بھر کی ضروریات کا بھی بندوبست نہیں ہوا۔ مسئلے کا مستقل حل یہ ہے کہ شط العرب کے بڑے نلوں (پائپ لائن) یا ہنر کے ذریعے سے پانی لایا جائے۔ متعدد کمپنیاں اس کے لیے اجارہ حاصل کرنے کی خواہاں ہیں۔

خوراک کا مسئلہ پانی سے کم مشکل نہ تھا۔ زیادہ تر غذائی بنیادیں عراق، مندھون، انگلستان، آسٹریلیا، بلکہ امریکہ سے لائی پڑتی تھیں۔ دمشق سے تازہ سبزیوں لانے کے لیے بخاری ۱۹۵۹ء میں ایک منصوبہ مکمل ہوا اور ٹرکوں کا قافلہ بھیجا گیا۔ جو راستہ ان ٹرکوں نے اختیار کیا۔ وہ دو ہزار دو سو کلومیٹر دوپٹے پر چڑھ کر میل لمبا تھا جو پہلے موٹر گاڑیوں نے کبھی عبور نہ کیا تھا۔ جب پہلی مرتبہ یہ ٹرک بنیواں لے کر

آئے تو کویت میں شادمانی کی اہر س دوڑ گئیں۔ ہجوم نے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے ٹرکوں کو گھیرے میں لے لیا۔ شیخ کویت نے ان کے اعزاز میں جشن منایا۔ اب ہوائی جہازوں کے ذریعے سے غذائی جنسیں لبنان اور شام سے چڑھنے میں کویت پہنچ جاتی ہیں۔

ریاست کویت کے جنوب میں دولت سعودیہ اور کویت کا جو غیر منقسم ملکہ ہے اہمال بھی تغیر کی ہوائیں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد شیخ کویت نے یہ ارادہ ظاہر کر دیا کہ اس ملکہ کے کویتی نصف میں تیل کا اجارہ دیا جاسکتا ہے۔ اس کے شمال میں یرغان کا چشمہ تھا اور اس سے کسی قدر جنوب میں اراک (دولت سعودیہ والی کمپنی) ایک بیش بہا ذخیرہ دریافت کر چکی تھی لہذا غیر منقسم ملکہ میں تیل نہ ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انگریز، فرانسیسی، ولندیزی اور امریکی پہنچے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لوبیاں دینے لگے۔ آخر امریکی ۱۹۴۸ء کو رافٹ کے ڈپوٹیز نے اعلان کیا کہ امریکہ کی انڈیپنڈنٹ آئل کمپنی کی بولی سب سے زیادہ سہی۔ اس اجارہ کی شرطیں واضح کی گئیں، لیکن انوار مشہور تھی کہ شیخ کویت لاکھ ڈالروں سے بھی ادیر رقم فوراً دے دی گئی۔ اور ۱۹۴۹ء میں تیل نکالنا شروع ہوگا۔ تو شیخ فی برلین تینتیس سڈ کی رقم مستقل طور پر رائلٹی کے مسئلے میں لے گا۔ اس کے ساتھ بونس بھی شامل ہوگا۔ ساتھ ہی ابن سعود نے اپنا نصف حصہ اجماع سے پر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس

(i) Ralph K. Davies (ii) American Independent Oil Company

میں سات کمپنیوں نے کوشش کی۔ آخر مارچ ۱۹۴۹ء میں پیسیفک ویسٹرن آئل کمپنی کو امداد مل گیا۔ اس کی شرطیں یہ بتائی جاتی ہیں کہ ایک کروڑ ڈالر کی رقم فوراً دے دی گئی اور پچھن سنڈ فی بیرل رائلٹی سفر ہوئی۔ مشرق قریب میں اتنی کمپنی آج تک کسی کو نہیں دی گئی۔

اس اثنا میں امریکن انڈری پنڈنٹ کمپنی نے کام شروع کر دیا۔ انجینیئروں نے پٹرول ٹورلرول ریلوے کے لئے سبھرا سدا ایک جہاز دسمبر ۱۹۴۹ء میں گویت پہنچ گیا اور ماہرین ارضیات ضروری سامان لے کر ۱۹۴۹ء کے اوائل میں موقع پر پہنچ گئے دیکھ جہاں کا کام موسم بہار کے اواخر میں پورا ہو گیا۔ سردیاں شروع ہوئیں تو بریلنے ڈرلنگ کا آغاز ہو گیا۔

امریکن انڈری پنڈنٹ اور پیسیفک ویسٹرن نے کاروباری معاہدہ کر لیا تھا۔ ادھر کوئی حلقہ میں کارکنوں کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا۔ ابتدا میں جہاں جہاں برمایا گیا، کچھ نہ کچھ نکلا۔ اس اثنا میں کمپنی نے شیخ گویت کو ایک عالی شان تقریب منستی۔ یہ طور پر یہ پیش کی جو ہر قسم کے سامان سے آراستہ تھی۔ اس میں ایک دربار ہال بھی تھا۔ ایک جگہ بھیڑیں اور دبے رکھنے کے لئے بنادی گئی تھی۔ باورچی خانہ ایسا بنایا گیا تھا جس میں ہر ایک دقت تین تین دینے لے جا سکیں۔ اس تحفے کا بڑا پروپیگنڈا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ایک سٹورل گیا جس کا تیل عمدہ تھا اور مقدار بھی خاصی بڑی تھی۔ گویت کا اصل مسئلہ محض تیل کے چشموں کی دریافت نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ رائلٹی کی جو رقمیں ملتی ہیں۔ انہیں صحیح طریق پر صرف کرنے کا مشورہ شیخ کو دیا جائے

۱۹۵۳ء

پاسیفک ویسٹرن آئل کمپنی

جب تک تیل نہیں نکلا تھا۔ رہا بھی غریب تھی اور شیخ بھی قرضدار تھا۔ اب
 انڈاس کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ شیخ اور اس کے خاندان کو محلول، موٹرول، کشتیوں
 اور فٹروں کو ٹھنڈا رکھنے کے سامانوں کا جو پکا تھا، وہ بھی ایک مدت تک تسکین پا چکا
 ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ قومی تلاح کے لیے منصوبہ بندی کی جائے جو تاثر کو ملاحظہ
 ہو چکی ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے:- ایک نیا ہسپتال، متعدد نئے سکول، کسٹم کے
 مرکزوں کی از سر نو تعمیر شیخ کے محل سے کویت شہر کے مرکزی چوک ایک شاندار
 ایروی نیوک انتظام- کام کی رفتار البتہ ذرا سست ہے۔ بعض پرانی عمارتیں توڑ
 کر شہر کی پڑیچ و خم گلیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ نئے انداز کی عمارتیں بنانے کا صحیح طریقہ
 یہ ہے کہ پرانے شہر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور تفصیل سے باہر نکل کر ایسی
 نئی آبادی کا بندوبست کیا جائے جس مفسداتی آبادی میں سرکاری سیدھی اور پختہ
 ہوں، جابجا پارک بنے ہوئے ہوں۔ پانی کا عمدہ انتظام ہو۔ شیخ کے عزیزوں
 اور رشتہ داروں۔ دولت مند تاجروں نیز تیزی سے بڑھنے والی اچھی آبادی کے
 لیے حدودہ عمدہ باغوں والے شہر حیا کو دیے جائیں۔ دولت سعودیہ کی حکومت
 نے جزدہ کے سلسلے میں یہی طریقہ اختیار کیا۔

تعلیم کے لیے اچھے سرمایے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بارہ نئے سکول کھولے
 جا رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی سالیقہ سکولوں کی طرح مصری معلم منگوائے جائیں گے۔
 اور ان میں مصری نصاب کے مطابق تعلیم دی جانے گی۔ کویت میں فی الحال ثانوی
 تعلیم تک کا انتظام ہے۔ لڑکیاں ابتدائی درجوں تک تعلیم پاسکتی ہیں۔ کالج کا انتظام
 نہیں ہوا۔ اس کی جگہ قاہرہ میں۔ ایوان کویت کے نام سے ایک عمارت بنادی گئی

ہے جس میں کم و بیش پچھتر طلبہ ہر سال اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں۔ گویا گیت اور بحرین تعلیم میں پورے جزیرہ العرب سے آتے ہیں۔

پانی اور بہتر مکانوں کے انتظام کے بعد محکمہ طبابت پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ شرماء میں مصلحت کا بڑا مرکز امریکی مشن کا ایک ہسپتال تھا جو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا۔ پھر طاعون مچوٹ پڑا۔ سمجھا گیا کہ یہ طاعون مشنریوں نے پھیلا دیا ہے۔ چنانچہ فیض نے حکم دے دیا کہ تمام مشنری ڈیرہ ڈانڈا انصاف نکل جائیں۔ ۱۹۵۵ء میں خود شیخ بیاد ہو گیا اور اسے ڈاکٹر بینٹ کے علاج سے صحت ہوئی۔ جو بصرہ کے امریکی مشن ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ شیخ نے اس صالجے کے فکر سے یہ مشنریوں کو ہسپتال کے لیے زمین دے دی۔ چنانچہ بصرہ کے مشن سے ڈاکٹر بیلر آئے گیت پہنچا۔ اور ۱۹۵۶ء میں نیا ہسپتال قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر ای۔ ای کیلوری ریلیڈی ڈاکٹر نے عورتوں کا علاج شرماء کیا اس کے شہر نے کتابوں کی دکان کھول لی اور وہ نوجوانوں کو لڑخت و نواز سکھانے لگے۔

۱۹۵۷ء کے اوائل میں کویت میں تین امریکی ڈاکٹر تھے اور مشن کا اصل کام علاج صالجے کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو مریض سال بھر رہے آئے اور دوائیں لیں، ان کی تعداد ہا سٹھ ہزار تھی۔ تین سو بڑے آپریشن (عمل جراحی) کیے گئے، تین سو چوبیس چھوٹے آپریشن اور مریض ہزار ٹیکے صرف ہسپتال میں لگائے گئے۔ لانا ہسپتال کے مریضوں کی تعداد اس سے نصف تھی۔

مرطوبوں کی ترمیم سے ریاست کو فائدہ پہنچے گا۔ ایک مرکز شمالی سمت

۱۹۵۶ء حالات تک کے ہیں۔ (iii) Bylray (vi) E. E. Calverly

میں کویت سے بصرہ تک بن جانی چاہیے اور ایک مرکز جنوب میں ماس الشب تک جانی
منزوری ہے۔ جہاں سے دولت سعودیہ کی پائپ لائن شروع ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھنا
چاہیے کہ آیا کویت سے بصرہ تک ریلوے لائن مناسب ہوگی۔ ایک اہم ضرورت یہ ہے
کہ ہوائی اڈا اول درجے کا بن جائے۔ کویت آئل کمپنی نے ایک اڈا شہر سے اٹھ میل
کے فاصلے پر بنا دیا ہے، جہاں چار انجن والے ہوائی جہاز اتر سکتے ہیں۔ یہ سوال
غور طلب ہے کہ آیا کویت کو بھی دولت سعودیہ کی طرح اپنے ہوائی جہاز چلانے
چاہئیں؟

۱۹۳۵ء میں شیخ کویت نے ایک قانون ساز مجلس اور ایک مشورتی کونسل
بنائی تھی۔ تجربہ یہ تھی کہ قانون ساز مجلس کے ممبر چنے جائیں گے۔ اور وہ مجلس
پارلیمنٹ کے وظائف ادا کرے، لیکن مجلس کے قائم ہونے سے ہی ممبروں کے دو گروہ
بن گئے۔ ایک گروہ کی رائے تھی کہ کویت کا الحاق عراق سے کر دیا جائے اور دوسرے
کی رائے تھی کہ شیخ کے ماتحت پوری خود مختاری مل جانی چاہیے۔ فوجانہ کوششوں کا
کہ وہ ابو عراق کی طرف مائل تھا۔ مجلس میں اقتدار کا مالک بن گیا جب معاملات
تعلیل کی منزل میں پہنچ گئے تو مجلس توڑ دی گئی۔ اور از سر نو انتخاب ہوئے۔ لیکن
نئی مجلس پہلی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس نے ایک دستور تجویز کیا جس پر عمل ہوتا
تو برطانیہ سے تعلقات کم تر رہ جاتے۔ اور ملک کے مالیہ کا معتد بہ حصہ شیخ کے ہاتھ
سے نکل کر نواحِ عامہ میں صرف ہوتا۔ اس طرح ۱۹۳۵ء تک سیاسی حالات خاصے خراب
نہ ظاہر نہ کرے۔ دونوں باتیں ملک کے عوام کی ہیئت کے خلاف نہ تھیں، مگر اجنبی اقتدار
اور برسر حکومت طبقے کو حرام کی ہیئت سے کہیں زیادہ اپنے خاص مقاصد کا خیال رہتا ہے
اسخو تجویز ہے کہ ان کے اندر عوام کے درمیان خلجہ پھیلے جاتی ہے اور اس کا اثر عام نظامی و مذہبی مقاصد

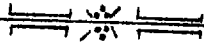
ہو گئے۔ لہذا مجلس پھر توڑ دی گئی اور اس کے ممبروں کو قید کر دیا گیا۔ فسادات ہونے
 جنہیں شیخ کی فوجوں نے فرو کیا۔ اس سلسلے میں کچھ جانیں بھی تلف ہوئیں۔
 شیخ نے مجلس کے مجوزہ دستور کو مسترد کرتے ہوئے خود ایک دستور تیار کیا اور
 ایک محدود قانون ساز مجلس بنائی۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کے فیصلے شیخ کی تصدیق
 کے بغیر نافذ نہ ہو سکیں گے۔ اس کے لیے جس ممبر ایسے رکھے گئے جو اسے عامہ سے
 منتخب ہوں اور قریباً اتنے ہی ممبر شیخ نے خود نامزد کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا۔
 اگرچہ یہ دستور جاری ہے مگر ۱۹۳۹ء کے بعد مجلس کا کوئی اجلاس نہیں ہوا۔ مشورتی
 کونسل کے آٹھ رکن ہیں۔ مگر شیخ کے لیے اس کے مشورے ماننے بھی لازم نہیں۔
 اس طرح کویت کے نظام حکومت میں تغیر کی کوشش بے نتیجہ رہی۔ فوجوں کی قیادت
 گروہ کے ارکان عمر و دانش میں بڑھ گئے تھے اور انہیں اس امر کا اظہار کرنا
 پڑا کہ بڑھا شیخ انتقال کر جائے گا۔ تو پھر کوشش شروع کریں گے۔ اس
 اثنا میں معاشی وائرے کے اندر خاصی تبدیلیاں ہو گئیں۔

یہاں شیخ عبداللہ ابن سالم الصباح فروری ۱۹۵۱ء میں من نشین ہوئے اور
 اس کی عمر پچیس سال کی تھی وہ اپنے پیشرو اور چچے بھائی سر احمد الجابر الصباح
 سے بھی زیادہ قدامت پرستانہ انداز میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نے تفویض
 کشتی نائب اسطنت عراق کے ہاتھ فروخت کر دی۔ اور ذرا چھوٹے محل میں
 محلہ نائب اسطنت عراق سے مراد عبداللہ مرحوم ہے، جو رسوم شاہ فیصل ثانی کے
 سرپرست کی حیثیت میں مدت تک عراق کا نائب اسطنت رہا۔

منتقل ہو گیا۔ جہاں وہ اپنے اہل و عیال اور دوستوں کے درمیان اطمینان کی زندگی گزارا ہے۔ اس کے پاس صرف چند مرٹریں ہیں۔ البتہ اس کی خاص تہہ صبر اس مقصد پر بھی ہوئی ہے کہ گوئیت کو ہر لحاظ سے مشرق قریب کی بہترین ریاست بنا دے، جو دور حاضر کی خوبیوں سے مزین ہو۔ اسے ساڑھے سو لاکھ روٹروالہ کی رقم سالانہ رائلٹی کے طور پر ملتی ہے۔ وہ یقیناً اپنی غریب ریاست کو مشرق وسطیٰ میں اول درجے کی فلاحی ریاست بنا سکتا ہے۔

سرولین کی روئے اپنی کتاب "ویلن آف پاور" میں بین الاقوامی پروردیہ ہے، اول مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لئے بین الاقوامی تعاون کا بندوبست کیا جائے تو اس حصے کے مزدوروں کی تنظیم نہ تقسیم پر خاص توجہ بندولی کی جائے، سوم اس حصے کے سب سے بڑے ریڈیٹروٹ یعنی تیلی سے جو عجمی حاصل ہوتی ہیں، ان کی زیادہ سے زیادہ مقدار بہتر طریق پر مستعمل کی جائے۔

گوئیت کے ماسٹی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ سہل اور آسان ہیں۔ اگر اس کی دولت کا ایک حصہ بھی ریاست کے مجموعی نشو و اتقا پر صرف ہو تو یہ امر ارباب اختیار کے دانش و تدبیر کا ایک عمدہ ثبوت ہوگا اور ان لوگوں کے دلوں میں امید کی نمی۔ روشنی پیدا ہو جائے گی، جو سمجھتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کا استحکام اس کی خوشحالی کا مترادف ہے۔



ضمیمہ

کریت کے تیل کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہاں بھی ہندوستانی مسکد راج اور پونڈیکے تبادلوے کی شرح سوا تیرہ روپے کے قریب ہے۔ تمام مالی معاملات فرانز ولکے ہاتھ میں ہیں۔ سمندر کے پانی کو صاف کرنے کے لیے پہلا کارخانہ ۱۹۵۵ء میں مکمل ہوا جو روزانہ دس لاکھ گیلن پانی صاف کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک کارخانہ ۱۹۵۵ء میں لگا دیا گیا۔ اس طرح پانی کی قلت کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا۔ بجلی ۱۹۵۳ء میں صرف سات ہزار سات سو پچاس کلو واٹ تھی ۱۹۵۵ء میں تیس ہزار کلو واٹ پہنچ گئی +

تیسرا سوال باب:

معاہدہ یاسین بحری قزاقی و سمندری ریس

جنوبی عرب میں اسے ایک یہودی امر سمجھا جاتا ہے کہ ساحل جتنا زیادہ بحر ہو گا۔
 باشندے اتنے ہی زیادہ بحری قزاقی کو ذریعہ معاش بنالیں گے۔ ردیوں کے عہد
 اقتدار میں یونانی نے لکھا تھا:-

مشرق عرب کی جانب ہر سال بحری سفر کیے جاتے ہیں۔ مگر جہازوں پر غیر افغانوں
 کے دسے متنبہین کرتے پڑتے ہیں اس لئے کہ یہ سمندر بحری قزاقوں سے بھرے

یہ ظاہر ہے کہ چین لوگوں کے پاس گزارے کے لئے کچھ ہو گا وہ دوسروں کی لالچ و ترغیب ہو گا
 ایسے جرائم کی ابتداء اصل ضرورت سے ہوتی ہے پھر عربوں میں قزاقی کا غارتگر اصل پر گزروں
 کی سیر و سیرتوں سے ہوا۔ جنہوں نے بولہویں صدی کے اواخر میں بحرین اور دوسرے ساحلی
 مقامات پر قبضے بنائے تھے اور عربوں کی تجارت بالکل روک دی تھی۔ عربوں نے یہ کوشش
 حصول آزادی کے لئے شروع کی تھیں۔

ہتے ہیں۔

کوئی ماہ سو سال بعد ونس کے پہلی بار کو لوڑنے بیان کیا کہ عرب قزاقوں نے خلیج فارس کے دہانے پر جہازوں کی ایک قطار کھڑی کر رکھی ہے اور کوئی تابو ان کے حملوں سے بچ نکلنے کا موقع نہیں پاتا۔ ایٹ انڈیا کمپنی نے اس حصے میں تجارتی سرگرمیاں شروع کیں تو اسے بھی عمانی قزاقوں سے سابقہ پڑا۔ اول اس کے کئی برس جہاز تیز رفتار عربی کشتیوں سے لڑتے لڑتے غرق ہو گئے۔ یا پکڑے گئے۔ ہندوستان کے ساتھ تجارت کا سلسلہ وسیع ہوا تو عمان اداس کے آس پاس بھری قزاقی اتنی نفع بخش ہو گئی تھی کہ یورپ اور امریکہ کے قزاق بھی قسمت آزمائی کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ نیرارک جیسے دور افتادہ مقام سے جہاز تیار کر کے بھری قزاقی کے لیے خلیج فارس میں بھیجے جانے لگے۔ ۱۶۹۵ء میں اطلاع ملی تھی کہ قزاقوں کے پانچ جہاز برطانوی پرچم اڑاتے ہوئے عربی سمندر میں پہنچ گئے ہیں۔ مشہور قزاقی کپتان کدھیرا ایسا بہترین موقع ہاتھ سے نہ دے سکتا تھا۔ لیکن عربوں کے ساتھ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ وہ بہت جلد اس میدان کو چھوڑ کر امریکی سمندر میں کی طرف لوٹ گیا۔

صان کی جانے وقوع ایسی تھی کہ قزاق خلیج فارس خلیج عمان اور بحر ہند

Marco Polo (۱۲۵۴ء - ۱۳۲۴ء) مشہور اطالوی سیاح تھے

نے بمبئی، ت قبا ئی خان کی سلطنت میں گویا چل دیں ہندوستان و میر کے متعلق اس کا سفر نامہ قیمتی حلیات کا ذخیرہ ہے۔

Captain Ridd

میں بے تکلف داخل ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے عانی قزاق عربوں میں اپنے تمام عربوں پر بازی لے گئے۔ وہ مشرق میں ہندوستان کے ساحل تک پہنچ جاتے تھے۔ شمال میں بصرہ ان کی ترکتازوں کا آخری مقام تھا اور مغرب میں انہوں نے زنجبار کو مسخر کر لیا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں احمد بن جابر بڑا کامیاب اور خوفناک قزاق تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی ملاح کی حیثیت میں شروع ہوئی۔ اس نے ایک مرتبہ سلطان مسقط کو بحرین کے حملے میں امداد دی، یہ حملہ اتنا کامیاب رہا کہ پھر احمد مصریوں کے ساتھ ہو گیا۔ جو عرب علاقوں پر حملہ آور ہوئے تھے لگاتار قدر خدات کے عوض میں اسے وٹام دے دیا گیا۔ جو آج کل دولت سعودیہ کی مشہور بندرگاہ اور پورے لائن پر مشرقی جانب آخری مقام ہے۔ احمد نے وٹام کو اپنا مرکز بنا کر کچھ جہازوں کا بیڑا تیار کیا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی اس کے پاس تھیں۔ دو ہزار جنگجو اس کے ساتھ تھے۔ غرض وہ کچھ مدت تک خلیج فارس میں سب سے زیادہ با اقتدار بنا رہا، اور دور دور تک دہشت پھیلا دی تھی۔ آخر ایک موقع پر بڑی قوت سے مقابلہ پیش آ گیا جب اس نے دیکھا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تو گرفتاری پر موت کو ترجیح دیتے ہوئے اپنا جہاز بارود سے اڑا دیا اور خود بھی جہاز کے ساتھ ہی موت کے گھاٹ اتر گیا۔

اٹھارہویں صدی میں نیز انیسویں صدی کے اوائل میں عانی قزاقوں کا مستحکم تربس مرکز و خراج رہے آب و گیاہ ساحل تھا جو قطر اور اس السہم کے درمیان واقع ہے۔ یہ ساحل اس زمانے میں برائے نام سلطان مسقط کے ماتحت تھا، لیکن

لے خلیج فارس کے دہانے پر خلیج عمان ہے۔ جہاں خلیج عمان ختم ہوتی ہے (باقی پر صفحہ ۱۵۶)

حقیقت یہاں کے شیخ اور رئیس یا تو خود مختار تھے یا وسط عرب کے وہابی مکرانوں کو خراج ادا کرتے تھے اس صحیح جو اسم نیلے کے لوگوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اس وجہ سے تمام باشندوں کو عام لوگ جو اسم ہی کہتے تھے۔

برطانوی جہازوں کی آمد و رفت بڑھی تو ساتھ ہی قزاقوں کے جھاپے بھی بڑھ گئے۔ ۱۸۰۱ء میں جو اسم نے وہابیوں کی معیت اختیار کر لی۔ چند ماہ کی ہرج و مرج کے بعد یا تو کوئی برطانوی جہاز کچا جاتا یا اسے بچ نکلنے کے لیے بھاگنے پر مجبور کر دیا جاتا لیکن ہندوستان میں جو لوگ برطانوی نظم امور کے کفیل تھے، انہوں نے نرمی اور مصاحت کی پالیسی جاری رکھی۔ انہوں نے اسٹوڈنٹس اور یا کمپنی کے دو جنگی جہازوں پر حملہ ہوا۔ ان میں سے ایک کا نام مورنگٹن تھا جس پر چوبیس تیس نصب تھیں بمبئی کے ارباب اختیار نے اس وقت بھی دے کے لیے قدم نہ اٹھایا۔ بلکہ "تبدیلی" نام ایک انگریزی جہاز کے کپتان نے قزاقوں کا مقابلہ کیا تو حکومت بمبئی نے کپتان کی خدمت کی۔

(بقیہ صفحہ ۲۵۵) وہاں مرز بن عرب کا ایک گوشہ بہت آگے بڑھ گیا ہے اور ایران کا ساحل نیم دائرے کی شکل میں پیچھے ہٹ گیا ہے۔ بڑے ہرنے گوشے کو اس المندم کہتے ہیں اور ایران کے مذکورہ بالا نیم دائرے میں بندر عباس واقع ہے۔ یہاں ہرزہ ہے جو پہلے ایران کی خاص شاہ گاہ تھی اس جگہ میں سمندر بہت تنگ ہو گیا ہے اور اسے آبلے ہرزہ کہتے ہیں۔ اس سے گزر کر آگے چلیں تو اصل غلیج فارس شروع ہوتی ہے۔ معاہدہ استور کا ساحل اس المندم سے شروع ہو کر جویرہ نامے قطر تک جاتا ہے۔

Fury of Mornington ۱۸۰۱ء اس علاقے کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے مصنف نے پیش نظر نہیں رکھا۔ یعنی (باقی صفحہ ۲۵۵)

۸۸۸ء میں جو اسم "نے برطانیہ کے ایک بڑے بحری جہاز سمٹرواہ پر لڑائی کے بعد قبضہ کر لیا اور دو کے سوا تمام مسافروں اور ملاہوں کو قتل کر ڈالا۔ مسافروں میں ایک خاتون بھی تھی جس کا نام مسز طیلر تھا۔ اسے ندیہ کی بھاری رقم دے کر راکر دیا گیا مگر خود خاتون کا بیان ہے کہ اسیری کی حالت میں اس سے کوئی برہمن کی نہ ہوئی۔ قزاقوں نے "منروا" پر چوبیس توپیں لگا لیں اور اسے اپنے رئیس و امیر کا خاص جہاز بنا لیا۔ ان کے بڑے میں ساٹھ بڑی کشتیاں اور آٹھ سو چھوٹی کشتیاں تھیں اور ان کا لشکر بیس ہزار سے کم نہ تھا۔ آخر ستمبر ۱۸۵۸ء میں ان قزاقوں کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ تیغ و خنجر کی لڑائی میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ مگر آتش بار مستحیادوں کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس الخیر ان کا مدد سے

دقیقہ ۱۸۵۸ء میں نے جو کچھ کیا اپنی آزادی محفوظ رکھنے اور بچنے ہوئے حقوق بحال کرنے کے لیے کیا۔ آخر تین گیارہویں صدی کے آغاز میں کیا کیا تھا؟ کیا ساحل ایران، ساحل ہندوستان اور ساحل عرب کا کوئی قابل ذکر مقام چھوڑا تھا؟ جہاں نشتہ کی آگ شعلہ نہیں کی تھی؟ کیا مسلمان تاجروں کے جہازوں کو چھوڑا تھا؟ کیا عاجیوں کے جہازوں پر حملے نہیں کیے جاتے تھے؟ جہاں تک بعض لوگوں نے امن طریق نہ ہونے کے باعث حج سے رک جانے کا حکم دے دیا تھا؟ کیا مدینہ پر دومرتبہ ان کا حملہ نہیں ہوا تھا؟ کیا لٹکا پاس بچے قبضہ نہیں کیا تھا۔ کہ مسلمانوں کی خضر صاعروں کی تجارت تباہ ہو جائے؟ وہ فرنگیوں کو ہر ممکن کوشش سے تباہ کرنے کے سوا اور کن سے راستہ اختیار کر سکتے تھے؟ یہاں انہوں نے کیا۔ اگر یزیدوں نے ابتدا میں زحی کی جو پالیسی اختیار کی تھی، وہ خاص تک دلی پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ ان کا عام طریقہ یہی تھا کہ حسب تک کوئی مقام تباہ کر لیتے چپ چاپ کام کرتے جاتے اور جب سہارا ملتا تھا

بڑا مرکز تھا۔ اس پر قبضہ کر کے نذر آتش کر دیا گیا اور بندرگاہ میں جتنے جہاز موجود تھے، وہ بھی جلادینے گئے۔ ان میں خود منردا بھی شامل تھا۔ ”جواسم“ کے باقی قصبے بھی برباد کر ڈالے گئے۔ اس کارروائی کے بعد کچھ دیا گیا تھا کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ مگر ”جواسم“ ختم نہیں ہوئے تھے، صرف اندرون ملک میں نکل گئے تھے۔ جب انہیں موقع ملا تو پھر قزاقی شروع کر دی اور صرف تیز رفتار اور سنجی مسلح جہاز ہی ان سے بچ کر نکل سکتے تھے۔ ۱۸۱۸ء تک یہ حالت تھی کہ مشرق میں ساحل ہند اور مغرب میں عدن تک جہاز پکڑے جانے کی اطلاعیں ملتی تھیں۔ جب ابراہیم پاشا نے دہایوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اور ”جواسم“ امداد کے ایک بہت بڑے سہارے سے محروم ہو گئے تو موقع مناسب دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی بھی حرکت میں آئی۔ اس نے سلطان مسقط کو حلیف بنایا اور بحر ہند کے پڑے کا بڑا حصہ اس کی امداد کے لیے بھیج دیا۔ سمندر کی جانب سے برطانوی جہازوں کی گولہ باری جاری تھی۔ عقب سے سلطان مسقط کی چار ہزار فوج نے حملہ کر دیا۔ چھ روز کی جنگ کے بعد اس انجم پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا، جسے پہلی تباہی کے بعد ”جواسم“ نے از سر نو آباد کر لیا تھا۔

واقعہ ۱۸۲۵ء میں ہوتا تو مصومیت کا لباس اتار کر زور و قوت سے کام لیتے مائٹرا انگریزوں انگریزوں کو نیپالیوں میں پہنچ کر عربوں کے تہذیبیہ مشینیں تجارت پر چھاپا مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ تجارت امن پسندانہ بھی ہوتی تو عربوں کو انگریزوں اور پرتگیزیوں میں کیا تمیز ہو سکتی تھی؟

(i) Minelwa (ii) Mrs. Taylor

کہ تمام آدمی اور کچھ بھی ہوں، اگر وہ حقنا شناس نہ تھے۔ اور کم از کم عورتوں کے احترام میں وہ سب سنگت تھے کیا پرتگیزیوں نے کہاں بھی ایسا کوئی ثبوت پیش کیا؟ لہٰذا اس انجمہ مسقط کے جنوب میں تھوڑے فاصلے پر ہے۔

پھر دوسرے شہر بھی یکے بعد دیگرے مسخر ہو گئے۔

اب انگریزوں نے آنگے بڑھ کر مقامی شیوخ سے جوہری سلسلہ میں معاہدے

کئے۔ ان سے صرف یہ اقرار لیا کہ جہازوں پر چھاپے نہ ماریں گے۔ باہمی رزم و پیکار

سے باز رہنے کا کوئی اقرار نہ دیا۔ اس کا نتیجہ پھر یہ نکلا۔ کہ آہستہ آہستہ بحری

تفراتی شروع ہو گئی۔ ۱۸۳۵ء میں پھر ایک معاہدہ ہوا جس میں شیوخ سے اقرار

لیا گیا کہ سال بھر میں چھ ماہ تک وہ ساحل پر کوئی ہنگامہ بپا نہ کریں گے۔ چھ ماہ

کی مدت ان موتی نکالنے والوں اور ماہی گیروں کے لیے مفید کی گئی تھی۔ ۱۸۳۵ء

میں ان شیوخ سے انگریزوں کا آخری معاہدہ ہوا۔ اس وقت سے اس ساحلی علاقے

کو معاہدہ ریا متوں کا ساحل کہتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جب تک دفاعی جہاز

لے نہ جائے اس تفصیل میں انسانیت پروری کا کون سا مظاہرہ نظر آتا ہے؟ جب تک دہایوں کی

قوت زور پر تھی، انگریز چپ بیٹھے رہے۔ جب وہ قوت مصریوں نے برباد کر دی تو زمین اسی موقع

پر انگریز بڑھ دوڑے اور جو اہم کا خاتمہ کر دیا اس سلسلے میں بھی حسب عادت سلطان منقطع

کر آ کر کار نہایا۔ تو کامیابی کا دروازہ کھلا۔ پھر جہاز چلانے اور شہروں کو ذرا آتش یا برباد

کر دینے میں کون سا پہلو قابل تحسین ضابطہ نیز دہایوں کی قوت تباہ کرنے سے معاملہ محض نہیں

تک محدود نہ رہا۔ دوسرے بہت سے اجزاء قوت بھی برباد ہوئے۔ ان میں سے ایک جوہر

جو اہم بھی تھے اٹھ عجیب بات ہے کہ تفراتی رد کی اور خانہ جنگی زدہ کی۔ حالانکہ تفراتی رکھنے سے

ان لوگوں کی محاش خطرے میں پڑتی تھی! اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر حملے

شروع کرتے۔ لیکن ان ریا ستوں یا اراکوں کے علاقوں کا ساحل جن سے انگریزوں نے صلح کی ہے

کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس خطے کو ٹریشیل عمان Trucial Oman

اور ساحل کو ٹریشیل کوسٹ Trucial Coasts

نہ چلنے لگے۔ خلیج فارس نتراتی سے بالکل پاک نہ ہو سکی۔ - دغانی جہانڈول کا چلنا ابوابی جہانڈول کی طرح ہواؤں یا لہروں پر موقوف نہ تھا۔ نیز ان پر لوبا پڑھا ہوا مخالفہ عام چوبی کشتیاں ان سے ٹکرا نہ سکتی تھیں۔

۹۲ء میں ان شیرخ سے اتر آیا گیا کہ وہ برطانیہ کے سوا کسی طاقت سے کوئی معاہدہ نہ کریں گے۔ ۹۱ء میں اس معاہدے کو پھیل کر مریٹوں کے اجاڑوں پر قائم کیا گیا۔ ۹۲ء میں ایک دفعہ برطانیہ کی گئی۔ کہ ہر مقامی شیخ کسی دوسری طاقت کو کوئی اجارہ دیتے وقت برطانوی ریزیڈنٹ سے مشورہ کرے گا۔

جس شخص نے ان علاقوں کو دیکھا ہے، اس پر خود بخود واضح ہو گیا ہوگا کہ جو اسم نے کس وجہ سے ترقی شروع کی۔ ان میں کل اسی ہزار لوگ رہتے تھے اور یہاں چھ اڑتیں قائم ہیں۔ غالباً یہ لوگ عرب ہیں سب سے زیادہ غریب ہیں تمام علاقوں کا رقبہ چھ ہزار مربع میل کے قریب ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ریت ہی ریت ہے۔ کہیں کہیں خام مودار میدان یا کھارے پانی کے نالے ملتے ہیں۔ بادش کا اوسط پانچ پانچ سالانہ ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت سایہ میں بھی ایک سو دس رہتا ہے۔ ایک دلیل ان علاقوں کی مغربی حد ہے۔ اس دلیل اور باقی کے درمیان ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ یہ ساحل علاقہ بحر ہے۔ کہیں کہیں معمولی پہاڑیاں ہیں، باقی پورا خطہ ریتلا یا شورہ زار ہے۔ وہاں صرف معمولی ہی سبزول سکتا ہے۔ جو جنگلی جانوروں کے لیے کفایت کرے۔ یہاں ایک ہی مستقل مکان نہیں مل سکتا، البتہ مسامیر، بنی یاس، مرہ، بنی باجر، اور دھرو وغیرہ قبیلوں کے بعض افراد کبھی کبھار پہنچ جاتے ہیں۔

ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں اور چٹانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ٹاپوؤں میں سے ایک کا نام دلمابہ ہے جو زمین میل لمبا ہے۔ یہاں موتی نکالنے کے موسم میں تاجور غوطہ خوروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں تاکہ جو مال موجود ہو اسے خرید لیں۔ اس جگہ کو ہے اور بلور کی بھی کچھ مقدار ملی ہے۔ مزید مشرقی جانب ایک بڑا جزیرہ ہے۔ یہ بنی یاس ہے۔ یہاں سے ساحل کو ٹی نینتالیس میل تک شمالی رخ ہوتا چلا گیا ہے۔ اسی طرح خور البطنین آجاتی ہے۔ یہ کھاڑی پانچ میل چوڑی ہے اور ساحل کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف پچاس میل تک چلی گئی ہے۔ خلیج فارس کی جانب سے ریت کے ٹیلوں نے اسے پھیلا رکھا ہے۔ انیسویں صدی کے قزاقوں اور بیسویں صدی کے سمگلروں کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ تھی۔

تمام ساحلی بلاد و قصبات کو ایک سڑک کے ذریعے سے ملا دیا گیا ہے لیکن یہ سڑک ایک صحرائی راستے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ۱۹۳۱ء میں مناصیب قیلے کے ایک شیخ نے فورڈ موٹر کار میں ابو ظہبی سے مکہ معظمہ تک سفر کیا تھا۔ لوگ اس سفر کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ ساحلی شہروں میں عرب بھی آباد ہیں، بلوچ، ایرانی اور ہندو بھی۔ حبشیوں کی بھی خاصی بڑی تعداد رہتی ہے۔ اندرون ملک میں دس ہزار بدو ہیں۔

جزیرۃ العرب کی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی اول وہ لوگ جو صحرائی علاقوں میں رہتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو پہاڑوں میں آباد ہیں، تیسرے وہ لوگ جن کا خاص تعلق سمندر سے ہے۔ یہ الفاظ و گیارہ صحرائی، جبلی یا کوہستانی اور دھری، کویت، بحرین اور مابعد امانتوں کے ساحلی باشندے طبعاً بحری ہیں۔

ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی مشیناں بنا لیتے ہیں۔ پھر موتی نکالتے یا مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اور خلیج فارس میں تیار کرتی مال لاتے لے جاتے رہتے ہیں۔

خلیج فارس میں موتیوں کا دوسرا ذخیرہ جسے دوسرے درجے پر سمجھنا چاہیے اسی ساحل کے سامنے ہے۔ موتی نکالنے اور مچھلیاں پکڑنے کی زیادہ تر کشتیوں کے مالک ہندو اور غوجے ہیں۔ وہ گراں نرخ پر ضرورت کی چیزیں ناخالص نیران کے ملاحوں اور غواصوں کو دے دیتے ہیں اور بیشتر بڑا نفع کماتے تھے۔ اب موتیوں کی تجارت پر زوڑ پی تو سب سے بڑھ کر برا اثر اس ساحل کے لوگوں پر ہوا جن کے پاس گزارے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ موتی نکالنے کا طریقہ یہاں بھی وہی استعمال کیا جاتا ہے جس کا ذکر بحرین کے سلسلے میں آچکا ہے۔

نظر کی جانب سے ساحل کے ساتھ ساتھ چلیں تو سب سے پہلے بو شہر آتا ہے، وہ البظمی ہے لیکن بحرین یا کویت کے مقابلے میں ساہ مارا توں کے بڑا دو قصبات خاصے کم حیثیت ہیں اور البظمی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے چند اچھے مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر مکانوں کی دیواریں کچی ہیں۔ پانی بہت کم ہے اور جو ہے وہ اتنا کھار ہے کہ سیریل کے چند باغات یا کھجوروں کے جھنڈوں یا گدزم کے معمولی کھیتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ان شہروں کے بازار اور منڈیاں بھی کویت و بحرین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بلائیں ہمہ البظمی کے ایرانی دکاندار مختلف اقسام کی چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ مثلاً کپڑا بچھے فعال کھجوریں، نلہ، تھوہ، اچائے، چینی، مسالے، مسٹائی، کارلوس کی پیٹیاں، خنجر اور خنجریاں تاہم بدو یا نیمول کو اچھا نہیں سمجھتے۔

علاوہ کے مولد ابوطلحہ بن خنیسہ لنگار ٹھہرنا پسند کرتے ہیں چونکہ اس لیے ابن سلطان نہیں ابوطلحہ اور مشرقی ماہانب کی اداست کے شیخ سعید ابن مکتوم کے درمیان لڑائیاں جاری تھیں۔ اس نے ابن سلطان سمجھا ہے کہ رد ان لڑائیوں میں مہارسلہ اور ادا کا باعث ہیں شیخ ابن سلطان رئیس ابوطلحہ کا محل بہت بڑا ہے لیکن اور کسی تمام پر سے زیادہ اچھا نہ سمجھا جائے گا۔ شہر کے لوگوں یا برووں یا باہر سے آنے والے مسافروں میں سے جو بھی اس کے پاس پہنچ جائے اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے محل کے علاوہ ابوطلحہ میں ایک کچا قلعہ بھی ہے جس کی دیواریں زیادہ بلند نہیں اس میں چند رنگ خوردہ قلعے بھی ہیں ممکن ہے ان میں سے بعض پر نگینوں کی زینت کی ہوئی شیخ کے ہاں خانے سے بندرگاہ کا نظارہ بخوبی کیا جاسکتا ہے جہاں ہر وقت کھجوروں، ریلے، خشک پھلیوں اور کپڑوں سے بھری ہوئی کشتیاں بٹھری رہتی ہیں۔ ایسی کشتیاں بھی ہیں جو لوگوں کو ساحل سے خریدنے کے لیے جڑواں میں لے جاتی ہیں جن کی حیثیت محض بیٹانوں کی ہے۔ ایک نالے میں ابوطلحہ کا بیڑا موٹی نکالنے والا رہتا ہے۔

سے بہتر تھا، مگر ایسا سنجیدگی سے سروٹ جانے سے پہلے کسی روٹی اور چھل پہل نہیں رہی۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، شیخ ابن سلطان رئیس ابوطلحہ اور شیخ ابن کنوم رئیس دبی کی خدائی اقلقت کا اثر پورے ساحل کی سیاسیات پر پڑا ہے۔ دبی، ابوطلحہ سے قریباً اتنی میل مشرق میں ہے اور اس ساحل کا رقبہ بڑا شہر ہے۔ اگر کمزوری نے دونوں کے درمیان طائی ۱۹۲۴ء میں رک دی تھی۔ مگر یہیں ایک ایک دوسرے سے خفا میں اور اندرون ملک میں بھی کبھی کبھی ان دونوں کے درمیان جنگ کی آگ مشتعل ہو جاتی ہے۔

دبی بنی یاس کے قبیلے کا مرکز و مزبج ہے۔ بازا رنگ اور کسی قدر تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ سوچ کی حدت کہ روکنے کے لیے ان پر چٹائیوں کی پھتیس ڈال دی گئی ہیں۔ بازا لیل میں ایرانی، عرب، حبشی، ترک، چاکر، غلام، ملاح، تاجر، ماہی گیر، موتی نکالنے والے، غرض ہر قسم کے آدمی ملتے ہیں۔ بدھ بھی چھ ماہ کے لیے ضروری جنسین

غریب نے کی فرض سے آجاتے ہیں۔ ساحل بالکل سطح ہے۔ اور اس کے متوازی ایک
 ذریعہ اب چٹان چلی جا رہی ہے، جو بہت سی نادائق کشتیوں اور جہازوں کا قبرستان
 بن چکی ہے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاز "نفس" ۱۸۳۷ء میں یہاں ٹکرایا تھا۔
 دہلی میں اڑن کشتیوں کا ایک اڈا بنا ہوا ہے۔ محاصرہ داروں کے علاقے کو یہ دہلی
 دینک سے ملانے کا یہ ایک اہم ذریعہ ہے اور اس سے مغربی آمدنی ہوتی ہے۔ جس کی ذہنی
 کو ضرورت ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہاں ہوائی جہازوں کی خاصی آمد و رفت تھی
 اور برطانوی کمپنی "بی" او "ای" کے مچھری طیارے ہندوستان جلتے آتے اس
 جگہ ٹھہر کر پٹرول لیتے تھے۔ ہوائی ڈاک اور مسافر بھی یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ جو
 لالچ میں سوار ہو کر ڈاک بنگلے میں پہنچتے تھے۔

بڑے بڑے تاجروں نے موتیوں اور زانہ ریشمی پارچوں کے ذریعے سے بڑی
 دولت کمائی۔ اب وہ بڑے بڑے مکانات میں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تیل آگے
 ابھی تک نہیں لا سکا۔ سب سے بڑھ کر راستہ مکان پٹرولیم کمپنی کے نمائندے
 ہی کا ہے۔ کچھ مدت پیشتر تک اس ریلوے پر یہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ ان علاقوں
 میں وہ معروف ترین اور ہر دلعزیز ترین آدمی تھا۔ اسے قبائل کے متعلق سب
 سے زیادہ معلومات تھیں۔ تمام بڑے بڑے رئیسوں سے بے تکلف ملتا، اس لیے
 کہ ان کے درمیان بیس سال گزرا تھا۔ ہزاروں روپے لے کر نکل جاتا۔ اور جن
 سے ٹھیکے لے رکھے تھے، انہیں دے آتا۔ عربی لباس پہنتا اور تمام مقامی بولیاں
 بولتا۔

دہلی سے قریب ہی ایک اور ریاست مشرق ہے۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے

Basil Hermit & R. L. Hermit.

جس میں بی، او، اے، سی کے کارکن رہتے تھے۔ اس قلعے کے اچھے بڑی تیز روشنیاں لگی ہوئی ہیں جن سے دور دور تک صحرائی علاقہ روشن ہو جاتا ہے۔ قلعہ انیسویں صدی میں بنایا تھا۔ برطانیہ نے اس کی خوب مرمت کر لی ہے اور اونچے درجے کے عہدہ داروں کے لیے ہندوستان سے ساگو ان کا فرنیچر بنوا لیا ہے۔ شہرچہ میں کشتی سازی کے لیے ساگو ان عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔

رائل ایر فورس کی عمارتیں بھی قریب ہیں۔ انھیں میں ایک عمارت ہے جو دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کی فضائی حملہ و قتل کے ذمہ دار استعمال کرتے تھے۔ بارشیں نہ ہوں تو شہرچہ کا ہوائی سفر بہت اچھا ہوتا ہے۔ لیکن معمولی بارش بھی ہو جائے تو یہ مقام طویل بن جاتا ہے۔ ہوائی جہازوں کی حد پر واژ طویل تو ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے شہرچہ میں جھڑنے کا سلسلہ بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ شہرچہ میں برطانوی پولیٹیکل انسٹرکٹوریام گاہ ہے جس کا سطح خلیج کی طرف ہے۔ یہاں بڑے بڑے تجربہ کار افسر رہ چکے ہیں۔ یہاں سے پاؤ میل کے فاصلے پر شیخ کا قلعہ ہے۔ جو پرتگیزیوں نے سولہویں صدی میں تعمیر کیا تھا۔ شیخ لوجران ہے، وہ اپنے باپ کی وفات پر ۱۹۵۱ء میں منڈن بن ہوا تھا۔

عام عرب حکمرانوں کی طرح شیخ شہرچہ بھی اپنے مہارانی کو دعوت دے کر خوش ہوتا ہے۔ کھانا فرش پر کھایا جاتا ہے۔ قالین پر سفید کپڑا بچھ جاتا ہے۔ اور شیخ اکتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ بڑے بڑے قابلوں میں پلاؤ آتا ہے۔ جس پر عالم دنیا دھرا ہوتا ہے۔ اس پاس درجنوں رکابیاں سبز لیل سے لبریز ہوتی ہیں شیخ دے کا کوئی مکینا کاٹ کر اپنے معزز مہمان کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ شیخ کی مزاج پرسی کے علاوہ بارش یا تیل کے متعلق بات چیت ہوتی ہے کھانے کے کمرے میں مرد و عورت

سکلتے رہتے ہیں۔ تہہ پینے کے بعد جہاں رخصت ہو جاتے ہیں۔ شہر کی پوری زمین شہر کی ملکیت ہے۔ وہی ٹیکس لگاتا ہے، وہی کاروبار پر کمیشن وصول کرتا ہے۔ وہی ہوائی اڈے کا کرایہ اور جہازوں کے اترنے کی ٹیکس لیتا ہے۔ تاہم وہ دولت مند نہیں شہر کے پاس ہی ایک جگہ ہے۔ جہاں سمندر کا کنارہ اہل مغرب کے لئے خوشگوار ترین مقام ہے۔ سفید ریت پر رنگ رنگ کے گھونگے اور پیدیاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ پانی اعتدال ہے۔ اس لئے شاربک بھلی وغیرہ کے آجانے کا وہاں کوئی خوف نہیں۔ اگر شہر میں کبھی تیل نکل آیا تو یہ مقام وہی حیثیت حاصل کر لے گا جو فرانس کے جنوبی ساحل پر ریلویر کو حاصل ہے۔

شہر سے پانچ میل شمال مشرق میں عجمان ہے جو دس مربع میل صحرائی علاقے اور ایک گہری کھاڑی کا مرکز حکومت ہے۔ شہر خوب بنایا گیا ہے۔ گیلیاں پختہ مکان سفید ہر ایک میں پانی کا تالاب اور باغ پاس ہی بحری قزاقوں کا ایک بہترین قلعہ ہے جس کے برج اور درے بادامی رنگ کے پتھر کے ہیں۔ اس میں اب تک رضید بن حمید عجمان کا شیخ رہا ہے عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گئی۔ تندرلیا، رنگ نکھڑا ہوا، آنکھیں نیلی۔ اسے شکار کا بہت شوق ہے اور اس کا محل نہایت خوبصورت غزالوں کے سروں سے آراستہ ہے۔ یہ سب اس نے شکار کئے ہیں۔ اسے گھوڑے پالنے کا بھی بہت شوق ہے۔ زیادہ تر گھوڑے شاہ ابن سعود کے ریاض سے حاصل کیئے۔ اب کوئی اڑتالیس گھوڑے اور گھوڑیاں ہوں گی۔ یہ جانور دن کے وقت قلعے کے صحن میں پھرتے رہتے ہیں ملاط کے وقت وہ سائبانوں میں چلے جاتے ہیں۔ عام عربوں کی طرح عجمان میں بھی گھوڑوں کو رے سے نہیں بانہتے۔ صرف بھیلی ناگیں بانہہ دیتے

ہیں۔ شیخ رشید نے نسل کشی کے لیے جو ساڈر رکھے ہیں وہ کوئی ساڈر سے چارنٹ اونچے ہوں گے۔ پتھے اور کوئلے بھرے ہوئے، ماتھے چوڑے، کان چھوٹے پھرتے اور تھکے تنگ، ان کی بالیں اور دُمیں ایسی رکھی جاتی ہیں۔ زیادہ تر کے رنگ سفید یا ہلکے ادا می تھنے۔ یہ گھوڑے بڑے مشریت ہیں۔ ایڑ اور گھٹنے کا اشارہ پہچانتے ہیں۔ چونکہ ان علاقوں میں چارے اور پانی کی بہت کمی ہے اس لیے ماہر مارٹول میں گھوڑوں کا غالباً یہی ایک اصطیل ہے۔

مجان سے چند میل مشرق الحمیریہ کی بستی ہے۔ یہ نام وہاں کے پانچ بُرج والے قلعے کی وجہ سے مشہور ہوا۔ جس کا رنگ سُرخ ہے۔ مزید تیرہ میل لگایا اور قصبہ اور امارت ہے۔ قزاقی ختم ہو گئی۔ موتیوں کی تجارت سہو پڑ گئی۔ مسابہ ریاستوں سے جھگڑے بھی ممکن نہ رہے۔ اب لوگوں کی حالت بہت تپلی ہے۔ بعض ایسی گیری پر گزارا کرتے ہیں جس سے بعض اوقات خاصے پیسے مل جاتے ہیں۔ بعض کا پیشہ زراعت ہے جو بہت معمولی حیثیت رکھتی ہے اور فصل ابھی نہیں ہوتی۔ حاصل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں تو ایک میدان آتا ہے جس میں سراب بہت پیدا ہوتے ہیں۔ عربوں کا خیال ہے کہ یہ سراب نمک کی ہلکی سی تہ کا نتیجہ ہیں۔ موسم بہار میں یہ میدان مٹی کی دیر کے ٹیٹے سرسبز ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں بھول بھی نکل آتے ہیں۔ اس علاقے کا مرکز حکومت راس الخیمہ ہے۔ ایرانی سلاطین تک اس پر قابض رہے۔ پھر انہیں شدید جنگ کے بعد نکال دیا گیا۔ یہ جو ام قبیلے کا مرکز ہے جس کا حاکم فتح محض ابن محمد ہے۔ اس حصے کے دوسرے شہروں کی طرح راس الخیمہ میں بھی ایک قلعہ ہے۔ تاکہ اگر کبھی محرقی علاقے سے حملہ ہو تو اس کی روک تھام

کی جاسکے۔ البتہ یہاں پانی خاصا ہے اور شہر کے مقب میں جو کھاڑی ہے۔ اس میں پھلیاں خوب پکڑی جاتی ہیں۔ فہر کے قریب ہمند کے کنارے ایک ساٹھ فٹ اونچی بلندی ہے جسے ”اصغم“ کہتے ہیں یعنی بٹ۔ غالباً اسلام سے پیشتر کے دور میں یہاں عبادت ہوئی تھی۔ اس جگہ کھدائی ہوئی چابیئے۔ پاس ہی ایک مسلمان بزرگ شیخ زہیر کا مزار ہے جس کی وضع قطع ایرانی ہے۔ بارش خوب ہو جائے تو سبز یوں کو پانی مل جاتا ہے انجیر، خربوزے اور انار بھی یہاں ہوتے ہیں۔

اس العیمہ سے مشرق کی طرف چلیں تو شیلیہ پہاڑ ہمند سے قریب تر آجاتا ہے اور عمان کے مشہور پہاڑی سلسلے حجر کی بلند ترین چوٹی دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگتی ہے۔ سہرا میں ان پہاڑیوں کے دامن رہنے کے لئے بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ اور بدو بہت بڑی تعداد میں یہاں خیمے لگا لیتے ہیں۔ چند مقتول کے لئے خشک دادیلوں میں پانی بہنے لگتا ہے اور ابر بہار مرغزاروں میں منبر کے کاغز بچھا دیتا ہے۔

ان پہاڑوں میں وہ قبیلے آباد ہیں جو قدیم ترین زمانے کے تمدن سے آگے نہیں چکے اور جن کے متعلق لوگوں کو کم سے کم معلومات حاصل ہیں۔ وہ ایسی بولی بولتے ہیں جو عرب میں کہیں نہیں بولی جاتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جزیرۃ العرب کے بالکل ابتدائی باشندوں کے اخلاف ہیں۔ عرب انہیں سندباد ملاح کی اولاد مانتے ہیں۔ ان میں بعض اب تک پہاڑوں کے غاروں میں رہتے ہیں۔ یا گڑھے کھود لیتے ہیں۔ اور انہیں مچول کی ٹیوں سے پاٹے کر اور مٹی بچھا لیتے ہیں۔ اس طرح نسبتاً ایک خشک تیا نگاہ تیار ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ان کا عام پیشہ ریلو لہجہ آتا ہے لیکن ان میں

بعض ساحلی علاقے میں بھی آجاتے ہیں۔ یا تو چھیلیاں پکڑتے ہیں یا کچھوروں کے باغوں میں محنت مزدوری پر لگ جاتے ہیں۔ یہاں کا حکمران شیخ حسن ابن محمد ہے ۱۹۳۳ء میں ایک برطانوی پارٹی سروے کے لیے آکرنا چاہتی تھی۔ شیخ نے اجازت نہ دی انگریزوں نے چند گولے چلائے اور شیخ حسن خودکشی میں سوار ہو کر ہزار پتہ پہنچ گیا۔ اور اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔

اندرونی علاقے کے عرب کسی قانون کے تابع نہیں وہ انجیل اور عیسائیوں کے سخت دشمن ہیں۔ سلطان مسقط اور شیخ امارت ہائے معابد دونوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان قبائل میں جنگ خونی اتمام کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ وہ لٹنے کے اتنے مشتاق ہیں کہ پیسے لے کر شیخ کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان سے لڑائی کا کام لیا جائے۔ یہاں پر تانے کے لیے شیوخ میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تو ہر شیخ ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر تحفے پیش کرتا ہے اور ان کی خوب خاطر تواضع ہوتی ہے۔

دوقبیلوں میں مدت سے ایک جھگڑا چلا آتا ہے۔ جس کی وجہ سے عمان سا لہا سال تک کشمکش گاہ بنا رہا۔ قبائلیوں کے نزدیک اس قسم کے جھگڑے دولت سے بڑھ کر زیادہ عزیز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرنگیوں کو امداد نہیں دیتے دیتے اور بھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے جھگڑے بند ہو جائیں گے۔ اگرچہ اب حالات بہتر ہو گئے ہیں لیکن یہ سب کچھ درست ہے۔ لوگ کسی دور میں چلے جا رہے ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پیش از روئے عرب پر طاری تھا۔ کیا ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے کو کس پست میراثی حالت سے اٹھا کر حقیقی انسانی طور پر ترقی کی سדרہ المنتہی

ہیں۔ لیکن ۱۹۷۵ء کی بات ہے جب دہلی سے مناصیر پر حملہ ہوا اور اس میں بادل آدمی مارے گئے۔

ان علاقوں میں خطرہ جان صرف شہیلیہ پہاڑوں کے اندر دہلی حصے ہی تک محدود نہیں۔ صرف ایک دولت سحدیہ ہے جہاں، ترم کے جھگڑے کا ختم ہو گئے ہیں درہ ہر جگہ حملے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ حملے عموماً رات کے آخری حصے میں اس وقت ہوتے ہیں جب چاند گھٹکتے گھٹکتے ایک چوتھائی رہ جاتا ہے۔ اس روشنی میں رہزن کو سب کچھ نظر آتا رہتا ہے، لیکن خود اسے دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ تنے پیاک ہوتے ہیں کہ سلاٹ میں رائل ایر فورس کی بارکول اور امریکہ کے کیپ میں گھس گئے اور اس وقت تک کسی کو پتہ نہ چل سکا جب تک ایک بدو نے ایک سوئے ہوئے ڈاکٹر کا مل کھینچنا شروع نہ کیا۔ ڈاکٹر کی آنکھ کھل گئی۔ جب یہ لوگ کمل، کھانا پکانے کے برتن، قالین، جواہرات وغیرہ فراہم کر لیتے ہیں تو اتہائی تیزی سے اندرون ملک پہنچے جاتے ہیں اور وہ جگہ شیخ کے دائرہ اقتدار سے باہر ہوتی ہے۔ بعض اوقات آدمیوں کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں اور ان کا فدیہ وصول کرتے ہیں۔ برہمی ان حملہ ورؤں کی خاص اقامت گاہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں برہہ فروشی بھی ہوتی ہے۔ عرب لڑکا دہنرا کو بکتا ہے عرب لڑکی ڈیڑھ ہنرا۔

دقیقہ ۱۹۷۹ء پر سپرد کیا جس قوم کی یہ حالت تھی وہ اسلام کی غوث میں پہنچے ہی تہذیب و شرافت و مسائل اخلاق سن و نسل اور کالات علم ہیں دنیا بھر کی مسلم بن گئی اور حکومت کا جو نمونہ اس نے دینا کے سامنے پیش کیا، اس کی نظیر آج تک کہیں نہیں مل سکتی وہ قوم ایسے ہی لوگوں میں صرف بیس سال کی مدت میں تیار ہو گئی ہیں اس سے اطمینان کے ساتھ کام کرنے کی مدت صرف چند سال تھی مگر چاند اور تاروں کی اکھوں نے اس سے بڑا حیرہ نکال دیا کہ نہیں دیکھا اور یہ عجیب و غریب کایا ملی آپس۔

کہ اور حبشی ایک ہزار کو لے۔ ایسے لوگوں کو سزائیں دی جاتی ہیں، مگر یہ سلسلہ کابلہ ختم نہیں ہوا۔ اس کے لیے یا قریب ضروری ہے کہ کوئی زبردست حکمران برسرِ کار آجائے یا یہ ضروری ہے کہ تیل، سونے، امین یا کسی دوسری قدرتی دھات کی دریافت افلاس کی حالت ختم کر دے۔

بریمبی نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ جب دولت سعودیہ اور اس کے مہسابلوں کے درمیان حد بندی کے متعلق جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے دولت سعودیہ کے خلاف شیخ ابو ظہبی اور سلطان مسقط کی حمایت کی تھی۔ رہزنیوں کے پھیلنے کے علاوہ خود شیوخ میں بھی کشمکش ہوتی ہی رہتی ہے مثلاً ۱۹۵۲ء میں مشرق اور دہلی کے درمیان لڑائی ہو گئی، جس کی ذمہ دار شیخ دہلی کی ایک بیوی ام رشید تھی۔ جب دہلی کے قلعے پر حملہ ہوا تو یہ خاتون خود دفاع کرتی رہی۔ برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ نے لڑائی روکی۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء میں عجمان و منا عیر کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی تھی، اس لیے کہ عجمان نے منا عیر کی چراگاہوں پر اعتراض کر دیا تھا۔ یہ جھگڑا سے زور جاہلیت کے ایام العرب کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

ان علاقوں کے باشندوں کی حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ اس حالت سے بچ نکلنے کی تین صورتیں ہیں: اول تیل کی دریافت، دوم کشتی سازی لے بریمبی اب تک برطانیہ کے زیر اثر ہے جس نے تیل کے لالچ میں اسے ابو ظہبی اور مسقط کا حصہ قرار دیا، لہذا بروہہ فردوسی وغیرہ کو روکنے کا ذمہ دار بھی رہی ہے۔

کی صنعت کا فروغ، لوٹ مار اور قزاقی کی غرض سے نہیں، صرف تجارت کی غرض سے، سیم ان باشندوں کو عرب کے کسی ایسے حصے میں آباد کر دینا جہاں پانی مناسب مقدار میں مہیا ہو، ورنہ یہ دردناک حالت ختم نہیں ہو سکتی۔ کہ بحر بیابانگ مندر سے ضرورت کے مطابق روزی حاصل نہ کر سکتے اور زمین ان کے پاؤں کے نیچے اپنی روح نشو و ارتقا ختم کرتی جا رہی ہے۔ ان علاقوں کی خوش نصیبی ہے کہ پہلی صورت برعکس کار آگئی ہے یعنی ابوطبی کے نزدیک تیل مل گیا ہے۔



ضمیمہ

تیل کی رائٹ اور کسٹمز کی آمدنی دہائی کے لیے پنتالیس لاکھ ہے، ابوطبی کے لیے تیس لاکھ اور باقی ریاستوں کی مجموعی آمدنی آٹھ نو لاکھ کے درمیان ہے مگر کبھی بھی کسی قدر بگنی نہیں۔ انتظامی امور عام طور پر بحریہ و مسقط کی طرح برطانیہ کے مشورے سے چل رہے ہیں۔

پچود موال باب

مستط

مشرق قریب میں ہمارا قدیم ترین حلیف

عرب حکومتوں میں ہمارا معاہدہ سب سے پہلے ۸۷۱ء میں مراکش کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد ہم نے سلطان مستط سے عہد نامہ کیا جس پر ۸۳۳ء میں مستط ہونے سے یہ معاہدہ سعید ابن سلطان سے ہوا تھا جو مستطی سلطانوں میں سب سے زیادہ قابل سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ مشہور و معروف تھا۔ اسیویں صدی کے اوائل میں وہ مستط و زنجبار دونوں پر حکومت کرتا تھا۔ عہد طفلی میں اس کا چچا نائب السلطنت کی حیثیت میں کاروبار حکومت کا کفیل تھا۔ سعید نے اختیارات طلب کیے تو چچا نے انکار کر دیا، بلکہ سعید کو قتل کرنے کے لیے ساز باز شروع کر دیا۔ سعید نے یہ اطلاع پاتے ہی چچا سے ملاقات کی اور بحلی کی تیزی سے منہج مار کر اسے زخمی کر دیا۔ چچا زخم کھا کر محل سے بھاگ نکلا۔

لے "ہمارا" سے مراد امریکہ ہے اس لئے کہ مصنف امریکی ہے۔

سید گھوڑے پر سوار ہو کر پہنچا کیا اور بھیجی سے اس کا کام تمام کر ڈالا۔ ۱۸۰۶ء
میں مسند نشین ہوا۔ اس نے ملک کا نظم و نسق بڑی مستندی سے سنبھالا۔ خوب
دولت جمع کی اور سب اسے احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس کے پڑے میں پھتر جہاز تھے، جن میں سے ہر ایک پر چار چھان تک نہیں
نصب تھیں۔ جہازوں کے منتظم اور ملاح ہندوستان سے تربیت پا کر آئے
تھے۔ ایک موقع پر اس نے اپنا ایک جنگی جہاز برطانیہ کو بھی دے دیا تھا۔
۱۸۲۵ء میں وہ اپنے جہان پر سوار ہو کر حج کے لیے مکہ معظمہ گیا، تو حکومت
نے اس کا رسمی استقبال کیا۔

مسقط کے ملاحوں اور قزاقوں نے مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقے پر ایک
حد تک اقتدار قائم کر رکھا تھا۔ سید نے جزیرہ زنجبار کو اپنا مرکز بنایا۔ وہاں
ایک محل تعمیر کیا اور ملک کی کاشت شروع کرادی، جو بہت جلد جزیرے کی
سب سے بڑی پیداوار بن گئی۔ پھر اس نے تجارتی چوکیوں کا ایک سلسلہ وسطی افریقہ
سے چین اور جزائر شرقی ہند تک قائم کر لیا۔ کلکتہ، ایران وغیرہ میں بھی اس
کے کاروبارے موجود تھے۔

عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اس نے بہت بڑا خزانہ جمع کر رکھا ہے، اور زنجبار
یا مسقط میں کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیا ہے۔ اس کی وفات ۱۸۵۶ء میں ایک
جنگی جہاز پر ہوئی۔ نزح کی حالت میں اس نے زنجبار کے انگریزی قنصل کو
بلایا۔ سمجھا جاتا ہے کہ وہ شاید اسے دفینے کا مقام بتانا چاہتا تھا، لیکن قنصل کے
پہنچنے سے پیشتر ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے چوبیس بیٹے اور بارہ بیٹیاں

تھیں۔ مرنے سے پہلے اس نے ہریٹھی کے ساتھ ہزار کراؤن اور ہریٹھی کو انیس ہزار کراؤن کی رقم دے دی تھی۔

امریکہ کے ساتھ معاہدے کی داستان بڑی عجیب ہے۔ ہمارے اہل کی ریاست ٹیمپلنگلینڈ کے ایک تاجر ایڈمنڈ رابرٹس نے بہت سارے قرض لیا۔ مسلمان خریدا اور جہاز کرایے پر لے کر زنجبار پہنچ گیا۔ اسے امید تھی کہ تجارت میں بہت سامنا فہم ہوگا۔ مگر زنجبار پہنچ کر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہاں تجارت کا پورا کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے اور جن ملکوں نے زنجبار کی حکومت سے معاہدے نہیں کیے، ان کے شہری سخت گھائے میں رہتے تھے۔ نفع کی دولت کا تو خون ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے سلطان سعید سے دوستی پیدا کر لی اور مشورہ دیا کہ امریکہ اور مسقط کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا ہو جانے سے کاروبار کو بہت فروغ حاصل ہوگا۔

امریکہ پہنچ کر رابرٹس نے گفت و شنید شروع کرنے کے لیے اپنے آپ کو حکومت کا مفید علیہ نمائندہ مقرر کر لیا اور ایک جنگی جہاز پی کا کٹے میں روسٹن سے چلا تا کہ اعلیٰ حضرت سیدی سعید بن سلطان امام مسقط سے گفتگو کی ابتداء کرے۔

پہلی کاک، ۱۸۷۳ء ستمبر ۱۳ء کو مسقط میں لگیا مذاکرہ سلطان سعید

نے گویا اگر کراؤن پانچ شلنگ کا اناجائے تو ہریٹھی کو پندرہ ہزار پونڈ اور ہریٹھی کو سوا سات ہزار پونڈ کی رقم دی۔ اس طرح کل رقم چار لاکھ سینتالیس ہزار پونڈ بنتی

کی خبر ملی تو چار قسم کے انکوار اور تازہ فوری ہوئی کھجور کی کثیر مقدار میں جہاز پر بھیج دیں ساتھ
 ہی امریکی سفارت کے بنیریت پہنچنے پر مبارک باد دیتے ہوئے تکلیف کا شکریہ ادا کیا۔
 رابرٹس کا اندازہ یہ تھا کہ مسقط کی آبادی بارہ ہزار کے قریب ہے اور پانچ ہزار
 نفوس اس کے آس پاس رہتے ہیں۔ وہاں باندے بھی تھے جو خانہ وارد و تارکین
 بننے تھے۔ وہاں اسٹار اسٹار سن مارا، برصغری اور مروجی بھی تھے۔ بازار میں خوش پوش
 عرب غلام یا کشمیری شمال یا گنڈے کی ڈھالیں یا روپہلی قبیلے والے شجر خریدتے
 پھرتے تھے اور ان کے لباس سے خوشید میں اڑتی تھیں۔ غواصول کا ذکر رابرٹس
 نے خاص طور پر کیا اور کہا کہ وہ دو منٹ سے زیادہ عرصے تک پانی کی تہ میں رہ سکتے ہیں۔
 رابرٹس اور اس کے ساتھی سلطان کے محل میں پہنچے تو راضیہ کے لیے مٹھائیاں
 اور لالچہ والی تہہ پیش کیا گیا۔ پھر رابرٹس نے صدر جمہوریہ امریکہ کا خط سلطان کو
 پہنچایا۔ ساتھ ہی دونوں ملکوں کے گہرے تعلقات کی اہمیت پر ایک تقریر کی سلطان
 اس امر پر راضی ہو گیا۔ کہ امریکہ کے جہازوں اور باشندوں کے ساتھ بہترین سلوک
 کیا جائے گا۔ نیز تجارت اور دوستی کا معاہدہ کر لیا گیا۔ معاہدے کی ایک دفعہ یہ بھی
 تھی کہ اگر کبھی امریکہ کا کوئی جہاز سلطان کی مملکت کے کسی حصے میں پٹان سے ٹکرائے
 گا۔ تو سلطان بچ رہنے والے آدمیوں کی مہانداری کرے گا اور انہیں واپس امریکہ
 پہنچا دے گا۔ ایسے حادثے میں جو مال ملے گا، وہ احتیاط کے ساتھ امریکی نو فصل یا اس
 کے مقرر کیے ہوئے کارندے کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۴۔ اگست کو خود سلطان "پی کاک" جہاز پر آیا۔ پھر رابرٹس معاہدہ اور صدر
 جمہوریہ کے نام سلطان کا ایک خط لے کر واپس چلا گیا۔ امریکہ کے سینٹ نے جون ۱۸۹۳ء

کھائیں۔ پی کا کہ ”کے ڈاکٹر کا بیان ہے کہ کھانا دوسو آدمیوں کے لیے بھی کافی تھا۔ اس کے بعد پی کا کہ ”مزید چند روز ٹھہرا رہا اور امریکیوں نے مختلف معلومات حاصل کیں۔ ۱۰- اکتوبر ۱۸۳۲ء کو ”پی کا کہ ”روانہ ہوا۔ سلطان نے عربی گھوڑے دینے چاہے۔ رابرٹس نے منذرت پیش کی کہ اٹھیں لے جانے میں دقت ہوگی۔ اپنی طرف سے ریا تہا نے متحدہ کا ایک نقشہ، امریکی نظموں کی ایک کتاب اور بہت سے بلوری لیمپ پیش کیے۔ رابرٹس کی ان کوششوں سے امریکی تجارت خاصی بڑھ گئی۔ معاہدے سے سات سال پیشتر کی مدت میں صرف ایک تجارتی امریکی جہاز مسقط میں ٹکرا کر اٹھانہ ہوا تھا۔ اور معاہدے کے بعد صرف پہلے سال میں نو امریکی جہاز وہاں پہنچے۔

جس امریکی نے سب سے پہلے مسقط و عمان میں قوتیں اٹھایا کیا۔ وہ امریکی تجارتی جہاز ”ایکسل“ کا ایک خدمت گار تھا۔ ایکس جہاز پر یمن کی بندرگاہ مختا میں قزاقوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے پورے عملے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف ایک لڑکے کو جس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی، قزاقوں کے رئیس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ آئندہ سال اس قزاق نے، جس کا نام محمد عقیل تھا، نظامدار کا علاقہ فتح کر لیا۔ جو عمان کے مغرب میں عرب کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ ایک انگریز نے ۱۸۳۳ء میں عمان کا سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایکس کے اس خادم نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اپنے

اس مختا میں کی مشہور بندرگاہ ہے۔ جزیرہ یرم کے پاس باب المندب کو عبور کر کے بحیرہ قلزم میں داخل ہو جائیں۔ تو سب سے پہلے یمن کے ساحل پر مختا ہی کی بندرگاہ آتی ہے۔

اہل و عیال کے ساتھ نیدرگاہ سٹالہ میں رہتا تھا۔

پھر امریکی تجارت میں انیسویں صدی کی پیدائش ہو گئی۔ اس وجہ سے امریکہ کا تجارتی گھٹ گیا۔ مئی ۱۸۵۱ء میں مسٹر ٹوماس جیورس نے امریکہ کے سلطان مسقط کو ایک خط لکھا جو موجودہ عہد کی ڈپلومیٹک خط و کتابت سے بالکل مختلف ہے اور اس سے سو سال پیشتر کی بین الاقوامی خط و کتابت کا انداز واضح ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ صدر نے "اعلیٰ حضرت سید سعید سلطان مسقط و ملحقات" کو اپنا عظیم المقدور اور خیر خواہ دوست "قرار دیتے ہوئے لکھا امید ہے آپ بہ خیر ہوں۔ میری دعا ہے کہ آپ کو طویل عمر عطا ہو۔ آپ کا عہد حکومت امن و خوشحالی اور عظمت و شان کے ساتھ جاری رہے اور آپ کے سایہ عاطفت میں کبھی کمی نہ آئے۔

میرے ایک پیشتر دستخط پر فاکس پر لکھ کر آپ کے کئی مکاتیب وصول ہوئے تھے۔ آپ نے ان کی صحت کے بارے میں استفسار فرمایا تھا۔ میں انہوں کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ پیشتر جنرل ڈگری ٹیلر نے دیا تھا، جس نے متحدہ کے صدر تھے میکسیکو میں ان کی زبیرت

۱۸۵۹ء میں نائب صدر منتخب ہوا۔ ۱۸۵۹ء

Millard Fillmore

صدر کا انتقال ہو گیا تو غلاموں اپنے عہدے کی بناء پر صدر بن گیا اور ۱۸۵۹ء تک صدر رہا۔

عہد صدارت ۱۸۵۹ء - ۱۸۶۱ء

James Knox Polk

عہد صدارت (۱۸۶۱ - ۱۸۶۹)

Zachary Taylor

طوائف اور فرحات کے بارے میں آپ ہمارے تو فصل چارلس وارڈ سے اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ میرا دل بے تہمتے ہوئے ڈوب رہا ہے کہ وہ بھی لاٹانی ہستیوں کی صف میں شامل ہو گئے.....

ہمارے ملکوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، وہ اب ہمارے وطن کا ایک قانون بن چکا ہے۔ میں اسے قوم کی مجلس عالیہ یعنی سینٹ کی منظوری کے بغیر بدل نہیں سکتا۔ آپ کے جہاز ہماری بندرگاہوں میں ابھی شرطوں کے مطابق آ سکتے ہیں جن شرطوں کے مطابق ہمارے جہاز آپ کے ملک میں جا سکتے ہیں۔ اذقیانوس اور خلیج میکسیکو میں ہماری بے شمار بندرگاہیں ہیں، جن میں آپ کے جہاز داخل ہو سکتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت بحر الکاہل کی جانب ہماری نئی ریاست کیلی فورنیا کی بندرگاہوں کی ہے، جہاں شگ مزد کی چٹانیں سونے سے بھری پڑی ہیں۔ دریا سونے کے خلوں پر سے بہتے ہیں اور مندر کے کنارے کی ریت میں بیش بہا دھاتوں کے ذرے جگمگاتے ہیں۔ شمالی جانب کے پرستاروں سے جنوبی جانب کی سنگترے کے پھولوں سے بھری ہوئی زمین تک ایک سودن کی راہ ہے۔ مشرقی کناروں سے جن پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں سب سے پہلے پڑتی ہیں مغرب تک جہاں یہ کرنیں غائب ہوتی ہیں۔ ڈیڑھ سودن کی مسافت ہے۔

لے Charles Ward گاہ اس زمانے میں طول و عرض ملک کے پانچ عام طریقہ پر تھا۔ اگرچہ امریکہ میں ریلیں اور دفانی جہاز جادوی ہو چکے تھے، جیسا کہ خود خط بیان کیا گیا ہے لیکن عرب میں اس وقت ایسے وسائل محل و نقل کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صد ہر یک نے طول و عرض کو عام طریق سفر کے مطابق پیش کرنا ضروری سمجھا۔

اور یہ وسیع ملک ریگ زار نہیں، بلکہ باد شہرول سے بھر چکا ہے۔ اس میں عظیم الشان دریا بہتے ہیں۔ بلند پہاڑوں نے اسے تاج پہنا رکھے ہیں۔ اس عظیم الشان ملک کے شہری ریلوں اور دفاعی کشتیوں میں سوار ہو کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک اس تیزی سے جاتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے صدر مقام واشنگٹن سے ہیں اپنے احکام تار رتی کے ذریعے سے چند لمحوں میں ریاستہائے متحدہ کے ہر حصے تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور ان کی تعمیل ہوتی ہے۔

ان چیزوں کے ذکر سے میرا مقصد فخر و مباہات نہیں، بلکہ میں سب کچھ دہکتی اور امن کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس وسیع ملک کا گوشہ گوشہ تجارت کی غرض سے آپ کے لیے، آپ کے جہازوں کے لئے اور آپ کے آدمیوں کے لئے کھلا پڑا ہے۔ جو جہاز آپ کا پرچم اڑاتے ہوئے آئیں گے۔ ہر بندرگاہ میرے ان کاخیر مقدم ہوگا۔ ہمارے جہاز آپ کی بندرگاہوں میں جاسکیں گے۔ یہ حقوق معاہدے کے مطابق فریقین کو حاصل ہیں اور معاہدے کی پابندی یہ ہر حال ضروری ہے۔ عظیم القدر اور نیک نیت فریقین آپ سے کیوں کہ قرین انصاف قرار دے سکتے ہیں کہ ہم تو اپنی سیکڑوں بندرگاہیں آپ کے لئے کھول دیں اور آپ ہمیں صرف ایک بندرگاہ تک محدود رکھیں، اور سلطنت کے دوسرے حصوں میں جانے کی اجازت نہ دیں یہ مناسب نہیں، آزاد تجارت عام طور پر مطلوب ہے۔ اس طرح مختلف ملکوں سے قسم قسم کی پیداوار بہترین طریق پر دنیا کے ہر حصے میں پہنچ سکتی

ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت فریقین کے لیے فائدہ مند ہوگی۔ یہ بھی امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ بلکہ جڑھنا جائے گا.....
آپ کا خیر خواہ دوست

(لارڈ غنمد)

اس مکتوب کے بعد امریکہ کی پہلی پوزیشن بحال ہو گئی۔

۱۸۵۷ء میں سلطان سعید نے وفات پائی اور اس کے دو بڑے بیٹوں کے درمیان جانشینی کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ دونوں نے ہندوستان کے دائرے لارڈ کینگ کو فیصلے کا مختار بنا دیا۔ اس نے ۱۸۵۸ء میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ زنجبار کو مستطو عمان سے الگ کر دیا جائے، ایک بیٹا زنجبار لے اور دوسرا مستطو پر حکمران رہے۔ امریکہ اور مستطو کے تعلقات کی کیفیت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اہل ایک مشن قائم ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں بصرہ سے پادری میٹر جے زیمیر مستطو پہنچا۔ اور اس نے حالات کے بارے میں ایسی رپورٹ بھیجی کہ مشن کا ایک قیام کر کے قائم کر لینے کی اجازت دے دی گئی۔ قبائلی جنگوں کے باعث سفر سخت مشکل ہو گیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں قبائلیوں نے مستطو پر قبضہ کر لیا اور کوئی دو سو جانیں تلف ہوئیں۔ مشن کا مکان اور کتابیں لوٹی گئیں۔ زیمیر کو برطانوی قونصل خانے میں پناہ لینا پڑی۔ جب حالات پر سکون ہوئے تو مشنریوں اندران کے ساتھیوں نے دورہ کر کے بائبل کے ایک سو کے قریب نسخے فروخت کیے۔

کچھ مدت بعد اٹھارہ حبشی لڑکے ایک ڈوبتی ہوئی گشتی سے بچاتے گئے

تھے۔ پادری زومیر نے ان کے لیے ایک سکول جاری کر دیا اور مقوڑی سی جگہ ایک چھاپے خانے کے لیے حاصل کر لی مسقط کی گرجی اور بنجار نے پادری زومیر کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ ۱۸۹۵ء میں امریکہ چلا گیا۔ جانتے ہی وفات پائی۔

زومیر کے بعد پادری باری ٹیو بھیجا گیا۔ وہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا اور اسے علاج کے لیے ہندوستان جانا پڑا۔ پھر اس کی جگہ پادری ہایج سٹون کو مقرر کیا گیا۔ وہ جوان تھا۔ صرف اسی سال کی عمر تھی، مگر لو لگنے سے اس نے بھی وفات پائی۔ ان مشکلات کے باوجود مشن جاری رہا۔ تعلیم بھی دی جاتی تھی اور علاج معالجہ بھی کیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۳ء ہومر بریٹ مسقط میں امریکی نو فصل مٹھا۔ اس نے رپورٹ بھیج دی کہ یہاں نو فصل رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک کارفرمہ سب کام کر سکتا ہے۔ تجارت کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۸۹۵ء کے بعد ۱۸۹۶ء تک کوئی امریکی جہاز نہیں آیا۔ پھر ۱۸۹۶ء کے بعد ۱۹۱۳ء تک کوئی جہاز نہیں آیا۔ چھ سال کی کوششوں سے دو مورکشیاں اور دو میپ فروخت کیے گئے۔ اور حالت یہ ہے کہ مقامی آدمیوں کی ناواقفیت کے باعث ان سے صحیح کام نہیں لیا جاسکتا۔

باقی رہے مشنری تو بحریں و کویت کی طرح وہ بھی کسی امداد کے بغیر اپنا کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں۔

[i] Rev. F. J. Barny [ii] Rev. George E. Stone
[iii] Homer Brett

حکومت کی چکی بڑی سست چلتی ہے۔ اس پر ورث سے دو سال بعد تار
 پہنچا کہ مسقط کا تو فصل خانہ بند کر دیا جائے۔ اس اثنا میں پہلی جنگ عظیم
 شروع ہو چکی تھی۔ جرمنوں نے امام عمان کو ارادہ سے کرکھڑا کر دیا جو انور دین
 ملک کے پہاڑی علاقوں پر حکمران بننا چنانچہ امام نے مسقط پر حملہ کر دیا۔ یہاں
 سات سو برطانوی فوج سلطان کی امداد کے لیے بھیجی تھی۔ حملہ تو پس پا ہو
 گیا۔ مگر کوئی فیصلہ کن نتیجہ سامنے نہ آیا۔ جنگ کے بعد ملک ملا تقسیم ہو گیا۔ انور دین
 ملک کے پہاڑی علاقے امام کے قبضے میں رہے۔ اور ساحلی علاقوں پر سلطان
 حکومت کرتا رہا۔

ذہریہ ۱۹۳۳ء میں جان بریڈلفٹ نے، جو بغداد میں امریکی تو فصل تھا۔ سلطان
 مسقط سے ترکیبی ملاقات کی اور مزید دس سال چپ چاپ گزر گئے۔ پھر یہ خیال
 آیا کہ مسقط کے ساتھ امریکہ کے معاہدے کی مدد سے قریب منانے اور باہمی
 تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے ایک خاص سفارتی مشن بھیجا جائے۔ چنانچہ
 ۱۹۳۷ء میں یہ مشن گیا اور مشہور امریکی ماہر عربیات بالینین شو اس کا رئیس تھا جو
 بغداد میں امریکہ کی طرف سے وزیر تھا تھا۔ اس کے ساتھ چند اور صحاب تھے۔ مثلاً
 نیسن شو کا بیٹا ڈینس کم اور امریکی سفارت خانے کا جوئر مکہ ٹری جیمز ایس کوز
 وہ بصرہ سے چلے اور بحریں و بندر عباس ٹھہرتے ہوئے مسقط پہنچے۔ سلطان
 معیاد بن تیمور دو سال پیشتر مندرشتین ہوا تھا اور چوبیس سال کی عمر تھی اس

i John Randolph [ii] Paul Knabenshue

[iii] Dennis [iv] James S. Moose

نے اپنے محل کے دروازے پر امریکیوں کا استقبال کیا۔ اور انہیں تخت گاہ میں لے گیا۔ نسب سے پہلے نہایت مہمن لیدی پیش کی گئی۔ اس میں لیس اتنا تھا کہ کھانے کے بعد وہ گلاب سے ہاتھ دھو کر تولیے سے پونچھنے پڑتے۔ پھر تقریریں ہوئیں۔ تجارت کو بڑھانے اور تعلقات زیادہ منظم بنانے کے متعلق فیصلہ ہو گیا۔ شام کو سلطان نے اپنے محل میں دعوت طعام دی۔ کھانا فرش پر کھایا گیا۔ بڑے بڑے قابول میں بھنے ہوئے دنبہ چاول، مرغ، منبریاں، روٹیاں، آم، انگور رکھے تھے۔ کھانے کے بعد یہ منین شہ اور سلطان کے ہاتھ وہیں دھلا دیئے گئے۔ باقی اصحاب کو اس غرض سے دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔

اگلے روز بعد دوپہر نہیں شہ نے امریکی مشن کے ایک نئے ہسپتال کا افتتاح کیا۔ اس تقریب میں امیر سعید محمد سلطان کا نائبہ بن کر آیا تھا۔ دوسرے امرامہ سرکاری انسپورل اور غیر ملکی افراد کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہ ہسپتال پادری ڈرک ڈکسٹر کی کوششوں سے بنا تھا۔

۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو سلطان نے ایک خط صمد روز ویلٹ کو لکھا کہ آپ کے وزیر مختار مینسن شوکی باز دید کے سلسلے میں امریکہ آنا چاہتا ہوں۔ روز ویلٹ نے فوراً سلطان کو دعوت دے دی۔ چنانچہ وہ ہندوستان سے مشرق بعید کے راستے ۱۹ فروری ۱۹۳۸ء کو سان فرانسسکو پہنچا۔ قریب ایک

سہ ماہی مسقطی علما تھا جو اپنی شیرینی، لذت، لطافت اور خوشگوار کی گئے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ تعجب ہے مصنف بھی اس سے آگاہ نہ ہو سکا حالانکہ عرب میں جگہ جگہ پھرتا رہا ہے

ہینا امریکہ میں بسر کیا۔ اور ۲۴- مارچ کو نیویارک سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ چلتے وقت روز ویلٹ کو شکریہ کا خط بھیجا، اس کے ساتھ ایک سنہری خنجر بر طور تحفہ پیش کیا۔

دوسری جنگ منظم کے زمانے میں غارت خان ملک بھالی جہازوں کے سفر کے لئے اڈوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سلطان سے مشورہ کر کے سلاطین مغربی اقطاف اور جزیرہ حبشہ میں اڈے بنایے گئے۔ جنگ کے بعد ان کی ضرورت نہ رہی۔ ضرورت کا ان اٹھا لیا گیا۔ اور باقی سب کچھ سلطان کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔

سلطنت کا رتبہ بیاسی ہزار مربع میل ہے یعنی مین سے کسی قدر زیادہ ہے۔ جسے جزیرہ العرب کے جنوبی و مغربی گوشے میں وہی حیثیت حاصل ہے جو مسقط و عمان کو جنوبی و مشرقی گوشے میں حاصل ہے۔ مگر مسقط و عمان کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ جو مین کا چھ حصہ ہے۔ ساحل آٹھ سو میل کے قریب۔ اندرون ملک میں برہنہ اور خشک پہاڑ ہیں۔ مغربی حد پر ناقابل عبور صحرا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ آبادی غیر مسلموں کی سخت مخالفت ہے، اس وجہ سے اندرون ملک کی دیکھ بھال اور چھان بین اب تک پوری طرح نہیں کی جاسکی۔

اندرون ملک کے پہاڑوں کے بعد عمان کا ساحلی میدان آتا ہے۔ جسے

لکھ یہ ناقابل عبور صحرا ریلوے الخالی ہے جس کا مفصل ذکر اس کتاب

کے دسویں باب میں آچکا ہے۔ مصنف پر نگاہ ان ملک کو ذکر کر رہا تھا۔ اس لئے یہ لکھا کہ تمام مینافہ یا ضروریات سمجھا۔

بطینہ کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ جو علاقہ ہے، وہ دنیا کے عظیم ترین نخلستانوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ اندولوں مسقط و عمان میں صرف چار سو سالانہ بارش ہوتی ہے مگر بطینہ میں بارش اتنی ہو جاتی ہے کہ یہاں خوب کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ کھجوریں پرورش کی جاتی ہیں۔ گندم بڑی جاتی ہے، قسم قسم کے پھل والے درخت لگائے گئے ہیں۔ جالور اور مرغیاں بھی پالی جاتی ہیں۔ دیہات میں مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں۔ مثلاً عرب، حبشی، ایرانی، عراقی، ہندوستانی، ہندو، بلوچ، چک ہیں کہیں پر تگیزی خون بھی نظر آ جاتا ہے۔ عام مکان کھجور کی چٹائیوں سے بنائے گئے ہیں۔ بڑے بڑے مکان کچی دیواروں کے ہیں۔ تعلقوں اور محلوں کی تعمیریں پتھر استعمال ہوا ہے۔ یہ لوگ شارک پھلیاں بھی مار لیتے ہیں۔ اور ان کے بازو زروخت کی غرض سے چمین تک بھیجے جاتے ہیں۔ مقامی کپڑوں میں سے ہوتی خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے مقامی کشتیوں کے لیے بادبان بنانے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ مسقط کی شمالی جانب دو سو میل موڑ میں جا سکتے ہیں۔ اندرون ملک میں اونٹ، گھوڑے اور گدھے کی سواری استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے و خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نیز پانی کی کمیابی اور ملکی حالات کی بے یقینی کے باعث یہ خطرناک بھی ہے۔

اندولوں ملک میں لوگ زیادہ نوکھیتی باڑی کرتے ہیں، لیکن پانی کی قلت نقصان رساں ہے۔ پہاڑوں کے اندر بعض وادیوں میں اب تک کافی پانی مل جاتا وہاں کھجوروں کے علاوہ۔ لیمو، سیب، قند اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں مسقطی انکو غالباً پر تگیز لائے جاتے ہیں۔

(حاشیہ: محلہ منفر پر)

مستط سے ایک سو چالیس میل شمال میں سان کی ایک بندرگاہ کا نام سہام ہے۔ یہاں امریکہ کی دو خاتونوں نے ایک ہسپتال قائم کر رکھا ہے جو دنیا کے منقطع ترین ہسپتالوں میں سے ہے۔ زیادہ سن رسیدہ خاتون ڈاکٹر سارا لونگ ورتھ ہاسٹن مدت تک مستط کے زمانہ ہسپتال میں انسریسی ۱۹۳۲ء میں اس نے سہام میں الگ ہسپتال کھول لینے کا فیصلہ کیا۔ سات سال تک تنہا اس میں کام کرتی رہی۔ پھر اسے ایک نوجوان مددگار مل گئی۔ ان خاتونوں نے سہام کے باشندوں کو مغربی دواؤں اور طریق علاج سے فائدہ پہنچایا۔ ۱۹۴۹ء کے موسم بہار میں انھیں دواؤں منگوانے کے لیے فہرستان کے امریکی توفصل سے درخواست کرنی پڑی۔ چنانچہ دواؤں جو انہیں جہاز میں سے سہام پہنچا کر بھیجی کے ذریعے سے اتاری گئیں۔

مستط کے شمال میں تھوڑی دُور قصبہ سب ہے جہاں گرمیوں میں مستط کی نصف آبادی منتقل ہو جاتی ہے اور سمندر کے کنارے روزانہ بڑا ہجوم رہتا ہے۔ پاس ہی مطرح ہے، جسے سلطنت کا تجارتی مرکز سمجھنا چاہیے۔ اس کی آبادی دس ہزار ہوگی۔ پانچ میل جنوب میں مستط کی بندرگاہ کے قریب ہی ایک بڑا ٹاپو جہاز کا ڈھانچا نظر آتا ہے جس پر دوسری جنگ عظیم میں جاپانی ابدوز نے تار پکڑ چلا دیا

(بقیہ صفحہ ۲۸۹) انگور کی ایک قسم کشمیر میں دیکھی جے مستط کہتے ہیں۔ اس کی جلد ذرا سخت ہوتی ہے اور کھایا جائے تو اس میں سے شیرینی کے ساتھ نہایت عمدہ خوشبو نکلتی ہے جو طبیعت میں انشراح پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ قسم مستط سے آئی ہو۔ (صفحہ ۲۸۸) لے

Sarah Longworth Hosma ان خاتون کا جذبہ خدمت خلق یقیناً حد درجہ

قابل ستائش ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔

تھا اور جہاز غرق ہو گیا تھا۔ مسقط اور مطرح جزیرۃ العرب کے گرم ترین شہر ہیں۔ یہاں سلیے میں بھی درجہ حرارت ۱۲۵ رہتا ہے۔ البتہ راتیں کسی قدر خشک ہوتی ہیں۔ برطانوی تو فصل خانے کے ارد گرد پختہ کی بلند دیوار ہے اور دیکھنے میں یہ تو فصل خانہ قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ نمائندے کا سرکاری لقب پرنسپل ایجنٹ ہے۔ امان مسقط کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں اس کا وظیفہ مشیر کا ہے۔ مشہور سیاح اور کاشف برٹرام ٹامس بھی ایک زمانے میں یہاں برطانوی افسر تھا۔

مقامی طور پر کوئی چیز نہیں بنتی۔ بیشتر چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ جینے میں دد انگریزی جہاز یہاں آتے ہیں مایکسلیج فارس کے اندر جاتے ہوئے اور ایک نوتے برٹے۔ عرب زنجبار، عدن یا خلیج فارس کی امارتوں سے جو سامان لاتے ہیں وہ کشتیوں میں آتا ہے۔

مسقط میں انگریزی فوج کوئی نہیں، مگر ایک پنشن یافتہ انگریز افسر کو سلطان نے اپنی فوجوں کا کماندار بنالیا ہے۔ ہوائی جہاز میں سوار ہو کر جنوب مشرق کی طرف سفر کیا جائے تو ایک قضیبہ آتا ہے جس کی آبادی سات ہزار سے کم نہ ہوگی۔ پھر اس الحد کا چکر کاٹتے ہوئے جہاز کا رخ مغرب کی جانب ہر جاتا ہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جزیرہ مسیو پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے آگے ایک وسیع صحر ہے پھر سلاطہ آ جاتا ہے۔ جو مسقط کے صوبہ خلفار کا مرکز حکومت ہے۔ سارے ملک میں یہ مقام حدودیہ خوشگوار ہے۔ سلطان اور اس کے درباری گرمیوں کا موسم یہیں گزارتے ہیں۔ یہاں علی ہر برائے شکار ہوتا ہے۔ سلطان نے اس جگہ یا محل تعمیر کرایا ہے جو ہوائی اڈے سے دس میل پر ہے۔ اس کے ارد گرد اینٹوں کی دیوار ہے۔ پھولوں کی کھاریاں

اور پھل والے درختوں کے جھنڈ میں جو ایک چشپے سے میرا پھرتے ہیں چشمہ مقبی بہاؤ سے آتا ہے جو بارہ میل دور واقع ہیں۔

ظفار پر دو ہزار سال تک ساز و گیروں کی طرح طاری رہی، اس لیے بخورات و عود و لوبان کی جس تجارت کا یہ واحد مرکز تھا، وہ ختم ہو چکی تھی۔ سلاطین کی بندرگاہ میں موسمی ہواؤں سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام نہیں، اس لیے کہ پانچ ماہ تک یہ بالکل بے کار ہو جاتا ہے۔ مسقط سے خشکی کے راستے آنا ہر تو موثر نہیں ہو سکتا، اونٹ پر آئیں تو بیس دن لگ جاتے ہیں۔ عدن کی جانب سے آنا اور بھی مشکل ہے۔ اس لحاظ سے سمجھنا چاہیے کہ ظفار کے بیس ہزار باشندے آج کل بھی اسی طرح الگ تھلک زندگی بسر کر رہے ہیں، جس طرح دو ہزار سال پیش کرتے تھے وہ انجیلوں خصوصاً مغیر مسلمانوں کو بہت شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

شہرہ اور محابہ اناقوں کے ساحل پر یورپ کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ یمن کے باشندے جیلوں کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ حضرموت کی الگ تھلک وادیوں میں بھی موٹریں پہنچنے لگی ہیں، لیکن مسقط میں بیسویں صدی نے ساحل ایک ہی قدم رکھنا ہے۔ یہ عمان اور اظفار کے صوبے تک نہیں پہنچی۔ اگر وہاں تیل یا معدنیات ملنے سے کوئی دوسرا چیز دریافت نہ ہوئی تو اغلب یہی ہے کہ زندگی میں فوج پر اب جاری ہے، اسی فوج پر باقی رہے گی۔



پندرہواں باب

عدن کی نو آبادی عرب میں برطانیہ کا دوسرا جبل الطارق

دنیا میں بہت کم بندرگاہیں ہیں۔ جو اب دہوا کی نوابی میں عدن کے برابر نام
ہوں۔ نام ہمارے صرف چند گھنٹے پہاں ٹھہرتے ہیں اور مسافر اپنے روزنامے میں یہی لکھے
لگا کہ عدن میں بے آب سد گیاہ چٹانوں، سنگین تالابوں اور حبسا دینے والی گرمی کے
سوا کچھ نہیں۔ ایک امریکی قونصل کا قصد مشہور ہے۔ اس نے عدن میں دو سال
کی مدت ملازمت پوری کر لی تو وائٹنگٹن سے تار پھا کہ نئے قونصل کا تقرر ہو چکا
ہے اور وہ جائزہ لینے کے لیے پہنچنے والا ہے۔ دوسرے روز تار ملا کہ وہ شخص
ملازمت سے مستعفی ہو گیا ہے اور نئے آدمی کا انتظار کرنا چاہیے۔ دوسرے ہی
دن۔ پھر ایک صاحب پہنچ گئے۔ سابق قونصل نو وارد کو لے کر کلب گھر گیا۔
وہاں حیرت ممتی، نہ بچکے بل رہے تھے۔ اور درجہ حرارت سایے میں ایک سو
سٹا۔ قونصل بندے میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد وہ لوگ ایک پہاڑی پر چلے

گئے۔ جہاں سے بندرگاہ عدن کا نظارہ بخوبی دیکھا جاسکتا تھا اور یہ بھی خیال تھا کہ وہاں ہوا خوشگوار ہوگی، لیکن اتفاق سے ہوا گرم بھی تھی اور اس میں ریت بھی ملی ہوئی تھی۔ نووارد نے پہاڑی کی چوٹی ہی پر تو فصل سے پوچھا جس جہاز سے میں اتر ہوں اس کے بعد امریکہ جانے والا جہاز کب آئے گا؟ جواب ملا کہ مہینے بھر میں ایک جہاز آتا ہے۔ جب جہاز آئے گا تو ہمارے لیے آئس کریم اور برف میں لگی ہوئی دوسری چیزیں بھی لائے گا۔ نووارد نے کہا: نہیں، ان کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر امریکہ جا رہا ہوں۔

سٹی سے ستمبر تک عدن گرم ہوتا ہے۔ سٹی اور ستمبر کے مہینے اس وجہ سے بدترین ہیں۔ کہ ان میں برساتی ہواؤں کا رخ بدلتا ہے۔ مہینوں تک ایسا جیس رہتا ہے کہ جس میں دم گھٹنے۔ اکتوبر سے اپریل تک شمالی و مشرقی برساتی ہوائیں چلتی ہیں۔ اس زمانے میں مقابلہ خشکی ہوتی ہے۔ نومبر اور دسمبر اور جنوری میں ہوا یقیناً خوشگوار رہتی ہے۔ اب کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے انتظامات جاری ہو گئے ہیں اور سفید فام لوگ بھی وہاں صحت و توانائی کو نقصان پہنچانے بغیر کام کر سکتے ہیں۔ گرمی کے باوجود جو امریکی عدن میں رہتے ہیں۔ وہ اس مقام کے لیے ایک عجیب پسندیدگی پیدا کر لیتے ہیں۔ ہوٹل، اجتماع کے خوشگوار مقام ہیں۔ شہر میں دکانیں بھی ہیں۔ ان کے علاوہ کافے، میس، پولو کشتی رانی، تیراکی، باہمی گیری اور شکار کے مشغلے ہیں۔ بعض لوگ پہاڑوں پر چڑھنے ہیں۔

عدن کی نوآبادی دو جزیرہ نماؤں پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل ایک آتش نشان پہاڑ کے دو بازو تھے جو مدت ہوئی خاموش ہو چکا تھا اور آج کل زیر آب ہے۔

مغربی جزیرہ نما۔ عدن خود گائے نام سے مشہور ہے۔ یہاں تیل صاف کرنے کا کارخانہ لگ جانے سے خوب پھل پھل ہو گئی ہے۔ مشرقی جزیرہ نما میں اصل عدن واقع ہے۔ یہاں جہاز ٹھہرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے باشندے سمندر کے کنارے یا اونچے ٹیلوں پر رہتے ہیں۔ پرانا عدن شہر جو ایک آتش فشان پہاڑ کا وادہ ہے اس جزیرہ نما سے آگے مشرقی جانب واقع ہے۔ عربوں کے شہر کا نام شیخ عثمان ہے۔ وہ اس سے بھی آگے ہے۔

یہ دو جزیرہ نما، دو نہایت عمدہ بندرگاہیں ہیں۔ اس وجہ سے عدن نے دنیا کی تجارت میں خاص اہمیت حاصل کی۔ ان کے سر پر جو پہاڑ کھڑے ہیں اس کی بلندی ایک ہزار سات سو چھ سو تتر فٹ ہے۔ انگریزوں نے اس پر ۱۸۴۹ء میں قبضہ کیا تھا۔ اس وقت سے یہ آزاد بندرگاہ بن گیا کوئٹہ اور تیل لینے کا یہ ایک اہم مرکز ہے۔ نہایت اہم بحری اور ہوائی اڈا بھی بن گیا ہے۔

نو آبادی عدن میں قریباً اتنی ہزار افراد رہتے ہیں جس میں عرب بھی ہیں، صومالی بھی، پارسی بھی ہیں اور یہودی بھی۔ مصری بھی ہیں اور شامی بھی۔ ایرانی بھی ہیں اور تھوڑے سے چینی بھی۔ ایک درجن سے کم امریکی ہیں۔ نیز برطانوی بری فوج، بحری فوج اور ہوائی فوج کے افسر اور قلم و نسق کے ذمہ دار بھی رہتے ہیں۔

لے این دیمانی نے اپنی کتاب ملوک العرب میں عدن کا ذکر کرتے ہوئے اعداد میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: عدن ایک عام شہر ہے، نہ یہ مغربی ہے نہ شرقی اور نہ عربی، یہ صرف تجارتی شہر ہے۔ مکہ کا مرکز ہے اور فوجی محکمہ ہے۔ یہاں مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں، پارسی مسیح کی (باقی رہے)

ہیں تاکہ وہ بندرگاہ کا محصول ادا کیے بغیر روانہ نہ ہو سکے۔ پہلا انگریزی جہاز ۱۶۹۹ء میں عدن پہنچا تھا اس کا نام "اسٹیشن" تھا۔ اس پر مشہور مباح اور تاجر جان جوہر دائیں سے سوار ہو کر آیا تھا جسے عدن، صنعا اور محاب میں بعض حیرت انگیز واقعات سے سابقہ پڑا۔

۱۷۳۵ء میں سلطنتِ کچ نے ام صنعا کے اقتدار کا جوا اتار پھینکا اور آئندہ سو سال تک عدن کچ کے ماتحت رہا۔ اس زمانے میں یہ مقام بحرِ منہ کے قزاقوں کے لیے ایک بین الاقوامی نوآبادی بن گیا۔ وہ لوگ اسی بندرگاہ سے نکل کر ہندوستان سے بحرِ احمر یا اس امید کی طرف جانے والے مالدار جہازوں پر بچھاپے مارتے تھے۔ مشہور امریکی قزاق کپتان کڈ بھی کچ مدت تک عدن کی بندرگاہ سے پھلے مارتا رہا، مگر اس نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہ دیا، البتہ ایک اور امریکی قزاق کپتان ٹیوٹ نے خاصی کامیابی حاصل کی۔ وہ نیلیج عدن سے واپس امریکہ پہنچا تو بڑی دولت ساتھ لے گیا۔ دوسری مرتبہ اس حلقے میں آیا تو بحیرہ قلم کے جنوبی حصے میں ایک برطانوی جہاز پر بچھاپا مارتے ہوئے مارا گیا۔ یہ قزاقیاں برطانیہ اور امریکہ کے تجارتی جہازوں کے لیے اس درجہ اذیت افزا بن گئیں کہ ۱۷۹۹ء) لیکن گیلیس راستے میں ہی رہ گیا۔ جنوب تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن یہ عدن کو کسی اور شخص نے فتح کیا ہو

- (i) Constantius (ii) theophilus Indus (iii) Di Varthernd
(i) Ascension (ii) John Jourdain (iii) Kidd
(iv) Tew

چکی تھیں کہ ۱۸۱۵ء میں بمبئی سے ایک بحری جہم ان کے خلاف بھیجی گئی۔ لہج کی طرف سے عدن میں جو حاکم مقرر تھا، اسے قزاقوں نے خوب رقتیں مل جاتی تھیں، لہذا اس نے قزاقی کے اندر ادیں برطانیہ کے ساتھ تعاون نہ کیا۔

۱۸۲۵ء میں ایک برطانوی جہاز عدن کے قریب کنارے کی چٹانوں سے ٹکرا گیا۔ اس کے حملے اور مسافروں کو سلطان لہج نے قید کر لیا۔ آخر ان کی ہائی کے لیے برطانیہ کو ایک مہم بھیجی پڑی۔ اس قسم کے حالات سے مجبور ہو کر برطانیہ نے ۱۸۳۹ء میں عدن پر بزور قبضہ کر لیا۔ کپتان مینر پیل شخص تھا، جسے برطانیہ کی طرف سے ریزیڈنٹ بنا کر عدن بھیجا گیا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اس نو آبادی کی رفتار ترقی نیز نہ تھی۔ لیکن جب سوزگے افتتاح سے عدن دنیا کی شاہراہ تجارت کا ایک اہم مقام بن گیا تو اس کے تاجروں نے خوب نفع کمایا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے جس نے سوزگے پہنچ گئی تھیں جو عدن سے صرف بیس میل شمال میں ہے۔ مگر وہ عدن پر قابض نہ ہو سکیں۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے بحیرہ قلزم میں پاؤں جھاننے کی کوشش کی، اس وجہ سے عدن کی حفاظت اور تجارت کے لیے خطرہ پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں اٹلی نے عدن پر بم برسائے اور اس کی آمد و زوں نے کئی برطانوی جہاز عدن کی بندرگاہ میں ڈبوئے۔

تجارت عدن کی زندگی ہے اور یہاں عرب کی تمام بندرگاہوں سے زیادہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بندرگاہ بہت اچھی ہے۔ تاجروں کا روبرو خاص ملک

رکھتے ہیں۔ اور یہاں محصول وغیرہ کوئی نہیں۔ اس وجہ سے تجارت خوب ترقی کر گئی ہے۔ علاوہ برین یہ مقام جنوبی افریقہ، سنگا پور وغیرہ کے راستے کا بدست مرکز ہے۔ یہاں کے تاجروں مقامی کارندوں کے ذریعے سے جنوبی و مغربی عرب اور شمالی و مشرقی افریقہ سے کھالیں، چمڑے، قہوہ اور سپیاں خریدتے ہیں۔ پھر یہ چیزیں امریکہ، برطانیہ، ہندوستان، مصر وغیرہ میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں بہ کثرت پروٹی سکے مل جاتے ہیں جن سے کپڑا، مٹی کا تیل اور اپنے گرد پیش کے حلقے کی ضرورت کی دوسری جنسیں خرید کر تقسیم کر دیتے ہیں، البتہ تجارت میں مقابلہ سخت ہے۔

باشندگان عدنان جس لباس کے عادی ہیں۔ اس کے لیے شوخ رنگوں کے کپڑوں کی خاصی مقدار درکار ہوتی ہے۔ عورتیں سر سے پاؤں تک بھاری کپڑوں کی تھول، شالوں اور نقابوں میں مغموم رہتی ہیں۔ مرد ٹخنوں تک لمبا کرتا پہنتے ہیں۔ کندھے پر لنگی یا شال رکھتے ہیں اور پگڑی باندھتے ہیں۔ پہلے کپڑے کی درآمدیں امریکہ کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ موجودہ صدی کے عشرہ ثلاثہ میں جاپان آگے نکل گیا۔ اب کچھ مدت سے پھر امریکہ نے اپنا سابقہ مقام ایک مدت تک دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ تاہم جاپانی کپڑا پھر عدنان کے بازار میں آنے لگا ہے۔ نمک عدنان کی خاص برآمدی جنس ہے۔

بندر گام کے سامنے نمک بنانے کے بڑے بڑے کھیتے ہیں۔ چاندنی رات میں یہ حصہ ایسا نظر آتا ہے جیسے دور تک برف پڑی ہوئی ہو۔

عدنان، جنوبی افریقہ، کوئٹہ، بمبئی اور سمیرن کے قریب وسط میں واقع

ہے۔ یہاں پٹرول غلیج فارس سے آتا ہے۔ اور کوئلے کے ذخیرے جزیرہ افریقہ سے
 لئے جاتے ہیں۔ تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ ایٹیلو ایرینین اٹل کمپنی نے
 ساحل بحرہ کرڈ ڈالر کے خرچ سے لگایا ہے جس میں ایک لاکھ تین تیلی روزانہ
 صاف ہو سکے گا۔ اس میں اڑھائی ہزار کے قریب امریکی یٹالومی اور دوسرے یورپی ملکوں
 کے ماہرین فن اور دس ہزار عرب اور ہندوستانی مصروف کار ہیں۔ جو خام تیل اس
 کارخانے میں صاف ہوگا، وہ زیادہ تر کویت سے آئے گا۔ قریباً نصف تیل بحری
 جہازوں میں استعمال کے لیے ہوگا۔ اس وجہ سے عدن کی اہمیت اور بڑھ جائیگی۔
 ان مسافروں کے ذریعے سے بھی اہل عدن کو آمدنی ہوتی ہے جو یہاں ذول
 کے چند گھنٹے ٹھہرنے کے دوران میں اتر کر شہر پہنچ جاتے ہیں اور وہ کانوں سے
 چیزیں خریدتے ہیں۔ بدعائدہ کی بری بحری اور فضائی فوج اب بھی وہاں موجود ہے
 اور ان لوگوں نے بہترین جگہ پر قبضہ کر رکھا ہے پہلے عنان نظم بری فوج کے ہاتھ
 میں تھی۔ اب فضائی فوج کے ہاتھ میں ہے۔ ہوائی اڈا ایک مسلح اور تیلی خاکٹے
 پر ہے جو جزیرہ نما کو اوپر ملاتی ہے۔ نو آبادی کا داخلی نظم و نسق پولیس کے ہاتھ
 میں ہے جس کے اعلیٰ انسپکٹرز ہیں اور زیر حمایت امارتوں میں قیام امن کی
 ذمہ دار دو فوجی تنظیمیں ہیں، اول سرکاری گارڈ دوم حضرمی بندوق کا لہجن،
 یہ دونوں فوجیں عدن میں رہتی ہیں اور زیادہ تر داخلی عرب کے رضا کاروں پر مشتمل
 ہیں۔ البتہ ان کے انسپکٹرز ہیں۔ نظم و نسق کے ذمہ دار فوجی کو جب ضرورت
 پڑتی ہے، مختلف قبائل میں سے بقدر ضرورت آدمی بھرتی کر لیتے ہیں۔ اس لیے
 کہ خنزہ، اخدماک اور لباس کے ساتھ جگہ کوئی کی زندگی بہت سے آدمیوں کو اپنی طرف

کینچ لاتی ہے۔

پہلا جیش (سرکاری گارو) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سرکاری چوکیوں اور
ادروں ملک کے افسروں کی حفاظت کے لیے ہے۔ ایک تیسرا جیش بھی تیار کر
لیا گیا جس کا نام ہے عدن لیونیز (عدنی خاصہ دار) جسے باقاعدہ فوجی تربیت
دی گئی ہے۔ مسلح موٹروں اور ٹرکی توپوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھیجا جا
سکتا ہے۔ یہ جیش اس وقت بھیجا جاتا ہے جب کوئی شیخ اپنے کسی ہمسایے کے
خلاف جنگ چھیڑ لیتا ہے۔ یا قافلے کا راستہ روک لیتا ہے اور پہلے دوستوں
اسے راہ راست پر لانے میں ناکافی متصور ہوتے ہیں۔

منفری پیمانے کے مطابق نوآبادی کے ویسی باشندوں کا معیار زندگی پست
ہے لیکن اگر زمین یا زیر حمایت امارتوں کے سادہ اور قدیم رضع کے معیار کو سامنے
رکھا جائے تو مذکورہ بالا معیار خاصا بلند نظر آتا ہے۔ عدن پورے علاقے کا
مرکز ہے۔ اس لیے بہت سے مسافر روزانہ پیدل یا اونٹ اور ٹوٹی چھوٹی موٹر
پر یا کشتی کے ذریعے سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مغرب کا کوئی باشندہ کھچا کھچ
بھرے ہوئے بازار دیکھے گا تو حیران ہوگا کہ عدن جیسے بھر جاتے ہیں ان سب
کے لیے کھانے پینے کا سامان کیوں کر مہیا ہوتا ہے۔ سب کے گزارے کی
ایک نیا و تر غذائی روابط ہیں۔ اس لیے کہ ہر بیکار لوگ عدن پہنچ جاتے
ہیں۔ وہ جب تک بیکار رہتے ہیں، رشتہ دار انہیں کھانا کھلاتے ہیں اس لیے کہ
اگر ان پر کسی بے کاری کا دور آئے گا تو وہ خود بھی دوسرے عزیزوں کے
ہاں کھانے کے حقدار ہوں گے۔

بہت سے آدمیوں کو گزریں پر یا عمارتیں بننے کی جگہ زور دی مل جاتی ہے بعض لوگ خانگی ملازمتیں قبول کر لیتے ہیں۔ یا دفتروں میں قاصد بن جاتے ہیں اور بعض چھوٹی دکانوں پر لڑکے مہر جاتے ہیں۔ جو لوگ تھوڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں، انہیں کسی فرم میں سرکاری محکمے میں محرومی مل جاتی ہے ایسے لوگ بھی اپنی جنمیں مناسب موقع مل گیا اور وہ اچھے کاروبار بن گئے یا زمینیں خریدیں یا قانون دانی کا پیشہ اختیار کر لیا یا ڈاکٹری شروع کر دی یا سکول میں معلمی پسند کر لی۔ اگرچہ آبادی میں عربوں کا حصہ غالب ہے۔ لیکن صوبائیوں، موجودہ لوگوں اور مہندوستانیوں کے لئے بھی روزی پیدا کرنے کے امکانات موجود ہیں۔

اکثریت ایسٹرن کے پلستر کے ہوئے گنجان مکانوں میں رہتی ہے۔ ان کی نیچے کی منزلیں عموماً دکانوں کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ وہاں بے شمار چائے خانے ہیں، وہاں دن بھر لوگ جمع رہتے ہیں اور مسلسل باتیں کرتے جاتے ہیں۔ قات کھانے والے لوگ ذرا الگ تھلاک نشست گاہوں میں بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ حجام کو مجلسی لحاظ سے اور سجادہ صاحب حاصل نہیں، تاہم مدین میں اس کی خاص حیثیت ہے۔ شادی کی تقریبات میں اس کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فصد بھی وہی لیتا ہے اور اچھے پیسے کماتا ہے۔

مدین میں مسجدیں بہت ہیں۔ بہت سے لوگ ہولت کے لیے کھلی جگہوں میں صبح نو تک باغ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ مسجد جامع کے میناروں سے اذان کی صدا بلند ہوتی ہے کہ ساتھ ہی ہر کونے سے اللہ اکبر، اللہ اکبر گونج اٹھتا ہے۔ مدین میں دلچسپی کی بھی بعض چیزیں ہیں۔ مثلاً سبلی میں کشتی سازی

کا کارخانہ۔ یہاں عدنی کا ریگہ ایسی کشتیاں بناتے ہیں، جو بصرہ، بھبھی اور زنجبار تک مسافر اور سامان لے جاتی لاتی ہیں۔ عوام میں مشہور ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی عدن ہی میں بنی تھی۔ اور غالباً ملک سبا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے لیے عدن ہی سے جہاز پر سوار ہوئی تھی، ابہر طریقہ ہم سمجھ لیں، وہ خشکی کے بجائے سمندر کے راستے گئی تھی۔ یہاں دو درویشوں کی کشتیاں بنتی ہیں۔ کشتیوں کے کارخانے کے عقب میں بولندریلیے ہیں، اُن کے اوپر رانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک سنگین دیوار ہے۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے، جب اندرون ملک کی طرف سے لڑاکا دی پر قبائلی حملے ہوتے تھے۔ اور فوجی اس دیوار کی اوٹ میں بیٹھ کر حملوں کی روک تھام کرتے تھے۔ اس دیوار کے ایک حصے کے پاس ایک بلند چوٹی پر قبیلہ کی قبر تائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ مقامی روایت کے مطابق ”باغ عدن“، عدن ہی کے علاقے میں تھا، ممکن ہے جزیرہ سقوطرہ یا وادی حضرت موت میں ہو۔

لے یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ مسئلہ حقائق کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کا وطن دراکہ و درات میں تھا۔ لے یہ بھی صحیح نہیں اس لیے کہ کتاب مقدس میں ملک سبا کا سفر اونٹوں کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ بینہ یہ سفر یقیناً خشکی کے راستے ہوا۔ ملاحظہ ہو کتاب مقدس ۱۰۔ تواسیخ زوال باب، لے قایل ابن آدم علیہ السلام سے انگریزی میں تائن کہتے ہیں۔ لے جزیرہ سقوطرہ خلیج عدن کے دانے پر جنوبی سمت میں ہے اور عرب کا ایک اہمیت مشہور جزیرہ ہے، یعنی کراچہ وغیرہ کی طرف سے خلیج عدن کے دروازے پر پہنچیں تو پہلے سقوطرہ پہنچے گا۔

شہر مدن میں پرائیڈوں کے حامن کے ساتھ ساتھ ایسے بڑے تالاب بنائے گئے ہیں جن میں راکش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔ یہ تالاب انیسویں صدی کے اختتام پر دریافت ہوئے تھے، اور انہیں صاف کیا گیا تھا۔ اندازہ ہے کہ ان میں دو کروڑ گلیں پانی کی گنجائش تھیں۔ اس سے نیاں کیا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں مدن کے امداد وسط بادش موجودہ ایک انچ سالانہ سے بہت زیادہ تھا۔ یہ تالاب حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر کے بنے ہوئے ہیں۔ جب مدن بخورات کی تجارت کا مرکز تھا۔

۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۶ء تک مدن کا نظم و نسق وزارت مند کے ماتحت تھا۔ ہر تجویز پہلے مدن سے ہندوستان بھیجی جاتی تھی۔ اور حکومت ہند اس تجویز کو لندن بھیجتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کاروبار میں خاموشی تاخیر ہو جاتی تھی۔ برطانوی فرج نظم و نسق کی ذمہ دار تھی۔ عیسائی کسی نیشن یا فٹہ کرنل کو بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہی ناظم اعلیٰ ہوتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں مدن کو تاج کی نوآبادی بنا دیا گیا۔ اور اس کا انتظام حکومت بمبئی نے منتقل کر کے وزارت مستعمرات برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ جنگ کے بعد حکومت برطانیہ نے ایک رقم مدن کو ارتقاء معیولوں کے لیے دی۔ ایک پروگرام تیار کر لیا گیا جس کے مطابق امید ہے کہ کسی روز بڑی بڑی غریبیں اگر خالے دکانیں، مسکان اور تیل کے ذخیرے وغیرہ گڈر نہ رہیں گے، بلکہ ایک ایک سلعوں میں چلے جائیں گے۔ اس طرح مدن کی آبادی زیادہ دلکش ہو جائے گی۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں نازن ساز مجلس قائم ہوئی۔ مگر مدن کی مختلف

آبادیوں کے نمایندوں کو ممبر نامزد کرتا ہے۔ اس طرح سیاسی ذمہ داری کی طرف پہلا قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ امید ہے مقامی باشندے ایک روز پورے اختیارات کے مالک بن جائیں گے۔ ۱۹۷۹ء میں مجلس بلدیہ کے نئے ممبروں کا انتخاب عمل میں آیا اور چنے ہوئے ممبروں نے اسکا سال اپریل میں کام شروع کیا۔

جزیرہ سقوطرہ بھی عدن ہی کے انتظامی حلقے میں شامل ہے جو جنوبی سمت میں ساحل عرب سے تین سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ جزیرہ اسی میل لمبا اور تیس میل چوڑا ہے۔ مقامی روایت یہ ہے کہ یہی جزیرہ باغ عدن تھا۔ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں جزیرہ جنوبی عرب کی شہری ریاستوں کی ایک نوآبادی تھا۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ جزیرے کے جنوبی و مغربی گوشے میں ایک سنگین ٹکڑے کے کھنڈر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت رسول تو مانے بنائی تھی۔ یہ امر تو قرین قیاس نہیں۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں نسطوری مسیحوں کا ایک گرجا سقوطرہ میں موجود تھا۔

مارکو پولو کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں ہندوستان سے عدن کی جانب آنے والا ہر جہاز سقوطرہ میں ٹھہرتا تھا۔ اور یہاں تجارت کی گرم بازار رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پرتگیزی امیر البحر ابو قرق نے ۱۵۰۱ء میں سقوطرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس لیے کہ اسے لڑین سے لڑپ اور ہندوستان

سے Apostle thomas

۱۴۵۲-۱۵۱۵ء مشہور پرتگیزی گورنر

Albuquerque ایک

کے درمیان تجارتی شاہراہوں پر قبضہ کرنے ہی کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ ہر پہ
 کہ یہ جزیرہ بحیرہ قلزم کے جنوبی گوشے سے بہت فاصلے پر واقع تھا، اس لیے تجارتی شاہراہ
 پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا۔ پرتگیزیوں کے تعمیر کیے ہوئے قلعے کے کھنڈر اب تک
 موجود ہیں جو قبیلہ بنزیرے کے مشرقی حصے میں رہتا ہے، وہ پرتگیزی حملہ آوروں
 ہی کی اولاد ہونے کا دعویٰ ہے۔ البتہ قرق کے مراہیوں نے مسیحیت کے احیاء
 کی کوشش کی۔ کورٹلی فرنی کے ایک پادری نے سترھویں صدی میں اس
 جزیرے کو دیکھا تو گرجاؤں کی حالت خاصی خواب بستی، اگرچہ عوام بتیاں
 اور صلیب نے کرسٹوس کی شکل میں نکلتے تھے اور چاند کی پوجا کرتے تھے۔
 اسیویں صدی کے ابتدائی دور میں رہابی مبلغ وہاں پہنچ گئے۔

لوگ امن پسند اور تن آسان ہیں۔ کھجوروں اور شارک مچھلی کے گوشت
 پر ان کا گزارا ہے۔ اتنا ہی کھاتے جس سے ان کے گوارے کا بدوبست ہو۔
 شمالی حصے میں کچھ خٹے سرسبز ہیں۔ وسطی حصے میں اچھی چرواگا ہیں۔ جہاں
 جانور پالے جلتے ہیں اور کھئی باہر بھیجا جاتا ہے۔ یہاں دم الانوین کی کثرت ہے۔
 عرب اس سے، دغن اور وارنش بناتے ہیں۔ سقوطرا میں گھوڑے انچریا کتے

ملے CARMELILE یہ مسیحی درویشوں کا ایک فرقہ تھا۔ ان کے پیشوا
 نے فلسطین کے مشہور پہاڑ کو دکارمل (کہہ اریاس) پر ایک عظیم پڑی بنائی تھی۔
 اسی سے یہ فرقہ چلا۔ یہ لوگ بہت عابد و زاہد ہوتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں
 باتیں نہیں کرتے۔ اور غربت و انلا سے انہیں محبت ہوتی ہے۔ دم الانوین
 کو انگریزی میں DRAGON'S BLOOD TREE کہتے ہیں۔

نہیں ہوتے۔ صرف اونٹ سے بادبرداری اور سوداری کا کام لیا جاتا ہے۔
جزیرے کا حکمران خاندان لاس قرسان سے آیا تھا۔ ۱۸۸۷ء سے یہ عدن
کے ماتحت چلا آتا ہے۔ مختلف سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ قرون وسطیٰ میں جزیرہ
سحری تفراتی اور ساحری کے لحاظ سے بہت بدنام ہے۔ اس کے نشہ و ارتقا
میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ یہاں کوئی اچھی بندرگاہ نہیں۔ جنوبی سطح مرتفع کے
باد جو زبان لہاتے ہیں، وہ جنوبی عرب کی قدیم حکمتوں کی زبان سے زیادہ
ملتی جلتی ہے۔ اگر ان لوگوں کے مطالعے میں وقت صرف کیا جائے تو امید ہے
کہ جمہوری عہد کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہوگا۔

کوہ یا موریا اور جزیرہ قرآن بھی عدن ہی کے علاقے میں شامل ہیں۔
کوہ یا موریا چھوٹے چھوٹے اور بنجر جزیروں کا ایک مجموعہ ہے جو مستطیل کے
صوبہ ظفار کے سامنے واقع ہے۔ ان سے صرف ماہی گیریوں کو دلچسپی ہو سکتی
ہے۔ قرآن بن کے سامنے ہے۔ (بحیرہ احمر میں) عثمانی سلطان سلیمان اعظم
کے ماہرین بحریات نے اس جزیرے کی اہمیت محسوس کر لی تھی۔ اور ۱۵۱۵ء
تک یہ ترکوں کے قبضے میں رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی بیڑے نے اس
پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا انتظام عدن کے پاس کی ان امارتوں
میں شامل کر دیا گیا جنہیں مغربی جانب کی زیر حمایت امارتیں کہتے ہیں۔ یہ اعلان
بھی کر دیا گیا کہ یمن اس جزیرے پر تمام دعووں سے دست بردار ہو گیا ہے۔
قرآن کے متعلق یمن چیزیں قابل ذکر ہیں:-

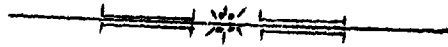
۱۔ یہاں زمانہ سابق میں ان حیاتوں کے لئے قرطبہ، مغارہ جو عمر مند کی
اس جزیرہ کے رہائے ان نام طرہ پر قرآن لکھے ہیں لیکن یہ علم کے مطابق صحیح قرآن ہے۔

نہد رگاہوں سے مکہ معظمہ جاتے تھے۔ انہیں جزیرے کے مشرقی حصے میں
 ٹھہرایا جاتا تھا۔ جہاں ایک اچھا ہسپتال بنا دیا گیا تھا۔ عمارت پتھر کی تھی۔
 اور مختلف اقوام کے لوگ وہاں کام کرتے تھے۔

۲۔ وہاں ایک عمدہ ہوائی اڈا ہے، جہاں امرائے عدن جانے آتے تھے
 ہوائی جہاز ٹھہرتے ہیں۔

۳۔ بحر ثامن بنو تھوڑی دیر ہوئی نیشنل پر سبک دوش ہوا، وہ برسوں
 جزیرہ قرآن میں رہا اور وہاں کلبے تاج بادشاہ مشہور تھا، ماسی کی کشتیوں
 سے وہاں برف کا کارخانہ لگ گیا۔ اور کھاری پانی کو صاف کرنے کا سلسلہ
 شروع ہوا۔

جزیرے کی آبادی صرف تین ہزار ہے۔



سولہواں باب:

عدن کی زیر حمایت امارتیں لحان اور فلک بوس عاتقوں کے تحت

عدن اور متعلقہ جزیرے تاج برطانیہ کی نوآبادی ہیں۔ اس سے درجہ زیادہ وسیع وہ امارتیں ہیں جو برطانیہ کے زیر حمایت ہیں۔ ان میں سے مشرقی امارتوں میں حضرموت کی خوش منظر اور سطح مرتفع آگئی ہے۔ مغربی امارتیں عدن کے شمال میں واقع ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں۔ جو تعداد میں اٹھارہ ہیں اور ان میں تین سلطان اور بیس شیوخ اور ایک امیر حکمران ہیں۔ ان کی حیثیت وہ نہیں جو خلیج فارس کے زیر حمایت حکومتوں مثلاً کویت، بحرین، قطر اور حمام امارتوں کے ساحلی علاقے کی ہے۔ یہ آخر الذکر خطے اصلاً آزاد ہیں۔ صرف خارجی معاملات کا انتظام برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ مغربی امارتوں میں حج، حبشی، عوزائی اور ضالع بھی شامل ہیں۔ یہاں انگریز مشیروں نے ایسا انتظام حکومت قائم کر دیا جو سلطنت برطانیہ کے مقاصد اور مقامی

آبادی کی طبیعتوں کے عین مطابق تھا۔

مغربی امارتوں کا علاقہ عدن کے عقب سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے گرم اور ریتلا میدان آتا ہے جو چار میل سے چالیس میل تک چوڑا ہے۔ مزید اندر کی طرف بڑھیں تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آجاتی ہیں اور علاقے نے سطح مرتفع کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جو دو ہزار فٹ بلند ہے۔ پھر اونچے پہاڑ آجاتے ہیں، جن میں سے جنوبی عرب کے چار دریا اور بہت سے نالے نکلے ہیں۔ یہ سب ریگ زار میں گم ہونے سے بیشتر مغربی امارتوں کے علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی ہوا مقابلہ خشک اور خوشگوار ہے۔ موسم گرما کی کسی شام میں عدن کے کسی مکان کی چھت پر بیٹھ جائیں تو یہ دیکھ کر دل کو سخت رنج ہوتا ہے کہ سورج کی کرنوں نے جو پانی بحر منہ میں سے اٹھایا تھا، بادل وہ مارے کا سارے جا کر زیر حمایت امارتوں کے بالائی علاقے پر پڑا تھا۔ دھار بارش کی شکل میں برساتیے ہیں۔

ان امارتوں کے حلقے میں آہستہ آہستہ ترمیم ہوئی۔ جب کسی بڑی طاقت نے عدن کے آس پاس کوئی قدام گاہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو حکومت برطانیہ اندرونی حدود کے عرب قبائل سے معاہدے کرتی گئی۔ اب پرانے خونی انتقام ختم ہو رہے ہیں۔ اور شیخ نہ تو اپنے حدود کی ترمیم کے لیے کوشش کرتے ہیں، اور نہ بھاری محصول گزر لگا کر قافلوں کا راستہ روکا جا رہا ہے۔ اس حلقے میں تشویش کا اصل سرچشمہ امام سین کا یہ دعوئی ہے کہ اس کا ملک جنوبی سمت میں بحر منہ تک جاتا ہے، یہاں تک کہ عدن کی آبادی اور تجارت

اماتیں بھی یمن ہی کا حصہ ہیں۔ امام یمن سے قریب ظاہر کوئی خطرہ نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ جزیرہ یمن کے سرحدی قبیلے وقتاً فوقتاً زیر حمایت امارتوں کے شالی حصے پر چھاپے اترتے رہتے ہیں اور ان کی طرف سے سخت تر جواب دیا جاتا ہے جب ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے یا کوئی مقامی رئیس امن میں خلل ڈالتا ہے تو پولیٹیکل افسر پہلے ثالثی کے ذریعے سے تصفیہ کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تدبیر کارآمد ثابت نہ ہو تو رائل ایئر فورس کو خاص منصوبے کے مطابق کام کا حکم مل جاتا ہے مثلاً پہلے اقباء کیا جاتا ہے کہ طرہ طریقہ درست کر لو، ورنہ ہم برسرے جائیں گے۔ اگر قبائل نہ مانیں تو تباہ دیا جاتا ہے کہ فلاں مقام پر اور فلاں وقت ہم گریں گے۔ اس طرح وہ مقامات خالی ہو جاتے ہیں اور وہاں پہلے پہل وہ ہم پھینکے جاتے ہیں جن سے صرف دھواں اٹھتا ہے۔ حبیب کوئی بھی صورت

یہ صحیح نہیں۔ خزانہ امارتوں میں بھی ہزاروں آدمی آزادی کے طلبگار ہیں۔ لیکن برطانوی اقتدار نے انہیں بے بس کر رکھا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یمن کا دعویٰ صحیح نہیں یعنی یمن کا علاقہ جنوبی یمن بحرہند تک نہیں آتا۔ تاہم برطانیہ کو اس علاقے پر کیا حق حاصل ہے؟ یمن تو زبان، نسل اور قومیت کا دھڑے بے تکلف پیش کر سکتا اور اسے جھٹلایا نہ جاسکے گا۔ مگر برطانیہ کس بنا پر کوئی دعویٰ کر سکتا ہے؟ یمن جزیراتی وحدت کا سوال بھی اٹھا سکتا ہے، برطانیہ کا ملک تو ان علاقوں سے کم از کم چار ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ دوسری سامراج کے باقیات ہیں۔ اور جتنی جلدی ختم ہوں تمام انجیروں کے ساتھ خصوصاً برطانیہ کے ساتھ تعلقات بہتر ہوں گے۔ برطانیہ کا انحصار صرف خود مرض شیورخ یا روٹنگ قبائل پر ہے۔ لیکن یہ مہاراجہ تک ساتھ دے سکے گا؟ یہ آج ہے تو کل نہیں، کل ہے تو پر سوں نہیں۔

کارگر قنطرہ آئے تو واقعی ہم پر سائے جاتے ہیں۔ اس پر سے معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ زمین اور زیر حمایت ملاتے دونوں کے جنگجو ہوائی جہازوں پر گولیاں چلتی رہتے ہیں اور زیادہ بلندی پر نہیں اڑتے۔ جب کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور جہاز زمین پر اتر کر ہم باری کے نتائج کا جائزہ لیتے ہیں تو قائل باشندے آکر گمکجوشی سے ان کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی چلائی ہوئی گولیاں جہان کے کہاں کہاں لگیں۔

نواب آبادی سے بالکل ملنا ملاوٹہ عبادت گاہ ہے۔ جن پر امیر علی بن عبدالکبیر المصطفیٰ سلطان مسیح حکمران ہے۔ اس امارت کا دار الحکومت "المحوطہ ریتلے شجر زار میں ایک شاداب و دروہ افروز نخلستان ہے۔ یہ آبادی درودادیل کے درمیان نہایت مرزوں مقام پر واقع ہے۔ اور عدل کی ضرورت کے مطابق زیادہ تر خوراک یہیں پیدا ہوتی ہے یہاں لیوا کھجور اور دراکٹھل کے گھنے باغ ہیں۔ شہ بھی بہت ہر تہا ہے۔ بڑی بھی کثرت سے پانی جاتی ہے اور معدودہ نسلوں کے وسیع کشت زار بھی ہیں۔ ان تمام چیزوں کا مالک یا تو سلطان ہے یا مقامی امرا ہیں۔ رعایا کا ادنیٰ فرد بھی اپنی شکایت سلطان کے پاس پیش کر سکتا ہے تو کول نے ۱۹۱۵ء میں آٹھویں کو تباہ کر دیا تھا لیکن اسے دوبارہ نئے اعزاز پر آباد کر لیا گیا۔

مسح سے آگے جائیں تو ریت اور خشک بادلوں میں سے گزنا پڑتا ہے۔ اور چلتے وقت گرد و غبار بہت اڑتا ہے۔ دس میل کا سفر طے کر کے آدمی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ جاتا ہے جہاں غری نالوں پر تہتیر ڈال کر پل بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مینیٹیل مہل و عبدل کی جمع مہادر ہے۔

اچانک زبردست سیل آجاتے ہیں۔ ان ندی نالوں کے ساتھ ساتھ گاؤں آباد ہیں جن کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ اوپر گھاس بھوس ڈال لیا گیا ہے۔ عام لوگ جہاں کہیں زمین کا اچھا ٹکڑا پاتے ہیں۔ کاشت کر لیتے ہیں یہ بھی ان کے گزارے کا ذریعہ ہے، قمر تانوں کو دیکھتے توں باہر قریب میں شہ پاراضوہ پادشاہی کو بھی نظر آئی گی بس بھولنا چاہیے کہ یہ لوگ ہنگ ہیں مارے گئے۔ ان لوگوں کو بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جو شخص بندوق اور خنبیہ حاصل کر لے، اسے قبیلے کا صحیح رکن سمجھا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ۱۹۷۹ء میں یہاں بے امنی پیدا ہوئی مغلنی۔ جب سلطان صالح بن عمر ادناس کا بیٹا عمر بن صالح مارے گئے۔ اطلاعات یہ تھیں کہ چند آدمی سلطان سے ملنے کے لیے آئے۔ کھانا کھایا۔ پھر خاصی رات گئے تک قاتل چھانے رہے۔ سلطان کے پہرہ دار سو گئے۔ تو وہ لوگ دو بجے اٹھے۔ دروازہ کھولا، اپنے دس ساتھیوں کو اندر داخل کر لیا، سلطان ادناس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ محافظین پر قابو پا لیا، عورتوں کو باہر نکال دیا، سارے محل پر قابض ہو گئے۔ یہ سنتے ہی سلطان کے دوسرے بیٹے محمد بن صالح نے دو ہزار آدمی جمع کر کے حملہ کیا تو قلعے کے دروازے کھلے پھٹے اور قاتلوں کا گروہ جانور اور دوسرا سامان لے کر چھپت ہو چکا تھا۔ ممکن ہے وہ اس لیے نکل گئے ہوں کہ ہوائی جہازوں سے بمباری کے لیے انتباہ ہو چکا تھا۔

ان پہاڑی دیہات میں سے ہر ایک کا شیخ ہے، جو اپنے علاقے کے سلطان ملہ جنب کے معنی پہلو اور کناسے کے ہیں۔ جنبیہ اس منجر کو کہتے ہیں، جو عرب عموماً پہلو میں لگاتے رہتے ہیں۔

کے تابع ہوتا ہے۔ سواشب کے علاقے کا سلطان محمد بن بہرور ہے جس کا دار الحکومت مسیمیر ہے اس کا محل بہت بڑا ہے۔ ارد گرد چھوٹے چھوٹے مکان ہیں۔ بڑے دروازے پر مسلح پہرہ رہتا ہے۔ جس میں داخل ہوں تو مرغیاں، مکدیاں اور ایک دو گائیں بھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف پرانی موٹر کا زنگ خوردہ ڈھانچا پڑا ہے پاس ہی ایک نئی مشین دہن ہے جس میں سلطان عدل جاتا ہے۔ کوئی بلند پایہ بہانہ آجائے تو سلطان اوس کے متعلقین دروازے پر استقبال کرتے ہیں اور ایک تارک زینے میں سے ہوتے ہوئے ملاقات کے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ جوتے دروازے پر انارنے پڑتے ہیں۔ فرش زم گدیوں کا ہے۔ سلطان سیگٹ پیٹ ہے۔ نصف سیگٹ پی کی فرش پر پھینک دیتا ہے اور ملازم اسے اٹھا کر زمین کش لگا لیتا ہے۔ سلطان کے لیے تات کے اعلیٰ درجے کے پتے لائے جاتے ہیں۔ جہاں کھانا کھا کر اوردھڑی دیر آرام کر کے رخصت ہوتا ہے۔ تو سلطان اسے ایک دو مرغیاں اور ایک آدھ بکرہ ضرور دیتا ہے۔

اور آگے جائیں تو بلند پہاڑوں کے درمیان سرسبز وادیاں ملتی ہیں۔ اور بن نسلوں کے لشکر ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے ہیں۔ کہیں سستانے کے لیے ٹھہر جائیں تو ممکن ہے ہڈ بھڑھائی سامنے آجائے۔ ساحل سے بچاؤشی میل پر درہ ختم ہے جہاں سے بلند تر پہاڑ شروع ہوتے ہیں۔ ایک تنگ اور پُر پیچ و خم سڑک پر سے گزرتے ہوئے گھاٹی پر چڑھتے جائیں۔ تو صنایع کا زرخیز خطہ آجاتا ہے جس کی حیثیت سطح مرتفع کی ہے۔ میدانی علاقوں کی تکلیف وہ گرمی کے مقابلے میں لہ خوشب کی جمع، ایک قبیلے کا نام ہے۔

اس خطے کی جنگی اور خوشگوار سیاق و سباق قابل تصور ہے۔ منصفہ ضائع کی آبادی قریباً چار ہزار ہے اور ایک نو جوان شیخ علی بن علی بن شایف اس کا امیر ہے۔ نظم و نسق میں اس کا انحصار عدن کے ایک تعلیم یافتہ عرب پر ہے جو اس مقام پر اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے تعلیم اور حفظان و صحت کے انتظامات بہتر ہو گئے ہیں، سبزیوں اور گندم کی کاشت بڑھ گئی ہے۔

یہاں قات بھی بہت ہوتی ہے اور ضائع کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ قات بھی ہے خود حکومت برطانیہ نے بھی اب پرانی پالیسی بول لی ہے۔ پہلے صرف قبائل کے درمیان باہمی رزم و پیکار کو روکنے پر قناعت کی جاتی تھی۔ اب قبائل کے شیوخ کو نقد روپیہ دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی نشو و ارتقا کے منصوبے ان کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب سرطیکس درست ہو گئی ہیں۔ کہیں کہیں ہوائی جہازوں کے اڈے بن گئے ہیں۔ اس طرح آمد و رفت اور تجارت میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ بڑے مرکزوں میں ہسپتال اور چھوٹے قصبات میں دواخانے قائم ہو گئے ہیں۔ سکولوں کا جالی بچھ رہا ہے۔ زراعت کی اصلاح پر زور دیا جا رہا ہے۔ اب تمام مقامی رئیسوں کے پاس موٹریں اور ریڈیو موجود ہیں۔ سچ میں بجلی کی روشنی، بجلی کے ٹمکھول اور پانی کے نلوں کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ بلکہ سینما بھی بن گئے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بکھتے ہیں کہ مغربی امارتوں کی زمین میں تیل کے ذخیرے ہیں۔ اگر یہ خیال درست ثابت ہو تو درودِ عامر کے سالانہ قرامم ہونے کی رقم تیز تر خرچ جائے گی اس لیے کہ سرمایہ حاصل مل جائے گا۔

حد درجہ اہم اصلاح یہ ہو گی کہ لوگوں کو پانی کے صحیح استعمال کا طریقہ بتلایا جائے

جب پہاڑوں پر خوب بارش ہو جاتی ہے تو بعض وادیاں میں پھر پھٹنے کی گہرائی تک پانی آجاتا ہے۔ افسوس کہ زیادہ تر پانی منافع جاتا ہے۔ اگر بند بنائیے جائیں یا ایسے کنوئیں تعمیر کر دیئے جائیں جن میں پانی محفوظ ہو سکے یا زراعت کے لیے نالیاں کھود لی جائیں۔ تو سیل اور طغیانی کی لعنت ترقی زراعت کا خوشگوار و بارکت ذریعہ بن جائے گی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں انگریزوں نے عدن کی نو آبادی کے لیے سبزیاں فراہم کرنے کے ایک منصوبے پر عمل شروع کیا تھا۔ چنانچہ ایک فارم عزرائلی سطح مرتفع پر قائم کیا گیا۔ ایک اور فارم ابین میں قائم ہوا جو ساحلی میدان میں واقع ہے۔ اور جہاں ایک بہت بڑی آبادی ایک زرخیز مغلے کو قطع کرتی ہوئی سمندر تک چلی گئی ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً سیلاب آتے رہتے ہیں۔ انگریزوں کے زیرِ ہدایت جا بجا مٹی کے بند بن رہے ہیں۔ نہریں کھد رہی ہیں۔ امید ہے کہ کسی وقت ان کی جگہ پختہ بند اور پختہ نہریں بن جائیں گی۔ کپاس کی کاشت کا دائرہ بھی بڑھایا جا رہا ہے۔ مغربی امارتوں کے انیس اجزاء کو ملا کر دفاعی انداز کی ایک سیاسی وحدت کی شکل دے دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ کام پائیدگی کیلئے کچھ سنجیدگی سے لیا جائے گا۔

۱۔ مصنف نے قعدہ ابدادی۔ مگر تفصیل کچھ نہ بتائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ عقربہ بڑی سی تفصیل مناسب ہے۔ یہ علاقہ جسے مصنف نے زیرِ حمایت ریاستوں یا حکومتوں یا امارتوں کا مغربی حصہ قرار دیا ہے۔ عام طور پر لبح اور نواحی تنج کے نام سے مشہور ہے۔ لبح کا ذکر اچکا ہے۔ زمین ربحی کے بیان کے مطابق باقی علاقوں کی کیفیت یہ ہے، جو قبائل کی بنیاد پر منقسم ہیں۔ ۲۔ انقباضی ہے۔ یہ قبیلہ عدن کے مغرب میں آباد ہے۔ اولس کا علاقہ ساحل کے ساتھ ساتھ راس عمران سے باب المندب تک چلا جاتا ہے (باقی برصغیر)

ہر طرف کامل امن کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔ اگر ان کے لیے کافی خوراک
 مہیا ہو جائے اور وقت کی سہولتیں پیشہ جائیں، اور قاتل کھانے کا سلسلہ گھٹ
 جائے تو یہاں کے باشندے مفید شہری بن سکتے ہیں۔

بقیہ ص ۳۱۵ ان میں اور قبیلے بھی ہیں۔ مثلاً مطیع اور برہمی۔ یہ لوگ بڑے جنگجو ہیں
 اور ضرورت کے وقت میں نزار آدمی میدان جنگ میں لاسکتے ہیں۔ یہ تین
 قبیلے میں ایک مرتبہ عدن جا کر مہانی کا ڈیڑھ سو روپیہ لے آتے ہیں۔ سلطان
 حج کے ذریعے سے وصول کرتے ہیں۔

۲۔ آل فضل یا فضلی:۔ یہ قبیلہ عدن کے مشرق میں ساحل کے ساتھ ساتھ آباد

۳۔ عوالق:۔ یہ آل فضل کے مشرق میں آباد ہے اور ان کا علاقہ نواحی تنبع

میں سب سے بڑا ہے۔ یہ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک کو عوالق علیا

کہتے ہیں اور دوسرے کو عوالق سفلی، یعنی عوالق بالا اور عوالق زیریں۔

۴۔ عوازل:۔ عوالق کے ملانے سے پھر مغرب کی طرف تو میں تو قبل فضل کے

شمال مشرق میں عوازل ہیں۔ المذنبہ ان کا مرکزی مقام ہے۔

۵۔ یوافج:۔ عوازل سے مغرب میں یوافج ہیں۔ ان کے بھی دو حصے ہیں یوافج

بالا اور یوافج زیریں۔

۶۔ حلوی اور قطیمی:۔ یہ دو قبیلے یوافج اور عواشب کے درمیان ہیں۔

۷۔ عواشب:۔ یہ نجد اور الصبیحہ کے مہا ہے ان کا مرکز مسیحہ ہے۔ انہوں نے

سب سے پہلے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور پچیس نزار آدمی میدان

جنگ میں لاسکتے ہیں۔ (باقی ص ۳۱۶)

عدن سے ساڑھے چار سو میل مشرق میں ایک دادی ساحلی سطح مرتفع کو قطع کرتی ہوئی بحر منہ میں گرتی ہے۔ یہ دادی حضرموت ہے۔ جو جزیرہ منائے عرب کے دوسرے حصوں کی طرح تاریخ، آثار قدیمہ اور ردوائنس کے قیمتی ذخیرے اپنے دامن میں سمیٹے بیٹھی ہے۔ حضرموت اسی مال تک اس علاقے کا حصہ رہا۔ جو عدن کے عقب میں واقع ہے۔ پھر ایک مستقل پولیٹیکل انسر مقرر ہوا۔ صرف چند انصروں یا مبلغوں یا ایروفرس کے چند ممبروں اور مٹی بھرا کر کی سائنس دانوں کے سوا اس علاقے کا دورہ کسی نے نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ بہت سے مسلم قبائل کی مذہبی روش بھی ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرموت کے مشرق و غرب میں بلند پہاڑوں کی دیواریں کھڑی ہیں۔ جنڈی سمت میں کوئی اچھی بندرگاہ نہیں شمالی سرحد پر صحرائے ربع الخالی نے پختہ قہر لگا رکھی ہے۔

عدن کے مشرق میں جو زمینیں علاقے ہیں، ان کا رقبہ تقریباً ستر ہزار مربع میل اور آبادی تین لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ بحالی ہوا اگرچہ گرم ہے، مگر عدن سے بہتر ہے۔ البتہ حضرموت کی دادی کے اندر اور پہاڑی علاقے میں موسم خاصا خشک اور خوشگوار ہوتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ نام صحفر سے

۸۔ بقیہ صفحہ ۳۱۵ انقلاب۔ یہ ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے۔

۹۔ الصالح۔ اس کی تفصیلات معن میں پیش ہو چکی ہیں۔ یہ لچ سے آگے بلند پہاڑوں میں واقع ہے۔

ان کے علاوہ مشرقی حصے میں ایک بہت بڑا قبیلہ الودادی ہے۔ لیکن اسے نئے انتظامات کے ماتحت غالباً حضرموت یعنی مشرقی امارتوں میں شامل کر لیا گیا۔

ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ٹہرول اور مرز روضہ خطول کا علاقہ۔ بعض لوگ اسے عاد سے منسوب کرتے ہیں۔ یہاں سات بڑے علاقے ہیں جو جن سے حکومت برطانیہ نے معاہدے کر رکھے ہیں۔ دو الواحدی سلطنتیں۔ ایک بڑعلیٰ کی اور دوسری بلجات کی تیسرا علاقہ قشطن کا، چوتھا عرقہ کا اور پانچواں حورا کا۔ سب سے اونچا درجہ سلطان شحر و مکلا کا ہے۔ جسے ہزبانس (اعلیٰ حضرت) کا خطاب حاصل ہے۔ اس کے لیے گیارہ توپ کی سلامی ہے۔ اس کے بعد ایک سلطان آتا ہے جس کے لیے نو توپ کی سلامی مقرر ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے ہزاروں سال پیشتر جزیرۃ العرب کے صحرا سمر سبز و شاداب تھے۔ مشرقی سین کے علاقوں سے پانی کے جو چشمے بہتے تھے وہ دریاؤں کی شکل اختیار کر کے حضرموت کی سر زمین کو کاٹتے ہوئے بحر مند ہیں گرتے تھے۔ ممکن ہے یہاں بھی ایسی ہی دریا ئی تہذیب نشوونما پائیک ہو۔ جیسی تہذیبیں نل یا وبلہ و فرات کے کنارے درجہ کمال کو پہنچیں۔ قدیم داستانیں، آثار قدیمہ بلکہ آج کل حضرت محمد بن قیس بھی وادیوں کے ابتدائی باشندوں کو بابل سے ملاتا ہے۔ عربوں کی روایت کے مطابق قحطان یا یقطان، جو عربوں کا پدر اول تھا۔ ۲۵۶ ق م کے لئے حضرت کات نام قحطان یا یقطان پر راول عرب کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کے ساتھ منسوب ہے، جس کا نام حضرت باؤت تھا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی اپنی کتاب ”ارض القرآن“ میں یہی وجہ تسمیہ بیان فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو جلد اول ص ۹۹ مبرانی میں اس مقام کا نام ”حضرموت“ یا ”حصار موت“ مذکور ہوا ہے۔

آس پاس حضرت موت میں پیدا ہوا۔ پھر یہاں سے اٹھ کر یمن چلا گیا۔ یہ تاریخ اس اعتبار سے بڑی دلچسپ ہے۔ کہ یہی زمانہ ہے جب حضرت موت، ہندوستان اور مصر کے درمیان بحراتِ دیوان کی تجارت اعلیٰ درجے پر پہنچی اور وادی کے باشندوں کی خوشحالی کا دور شروع ہوا۔

جب وادی خشک ہونے لگی تو باشندے دیول اور دیادل کے ساتھ ساتھ یمن کے پہاڑی علاقوں کی طرف چلے گئے اور ایک ہزار قبل مسیح کے آس پاس دماں معین، سبا، قطان اور حمیر کی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ بعض اوقات حضرت موت کے شہر مذکورہ بالا شہری ریاستوں کے تابع چلے جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ آزادکا حاصل کر لیتے تھے۔ یہ ہر صورت یہاں سے دیوان باہر جاتا تھا۔ ہندوستان اور مشرق بعید سے ریشم اور سالے آتے تھے۔ یہ تجارت حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد سے حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد تک چھلتی رہی۔ تجارتی راستہ یہاں سے مکہ معظمہ ہوتا ہوا بحیرہ روم کی طرف جاتا تھا۔ جب تجارت کا رخ بحیرہ اُحمر اور خلیج فارس کی طرف پلٹا تو ان شہروں کی بلند حیثیت ختم ہو گئی۔ ساتھ ہی حضرت موت کے لیے تنگی اور حسرت کا دور شروع ہو گیا۔ جواب ختم ہونا شروع ہوا ہے۔

اسلام اس وادی میں ۶۱۰ء کے قریب پہنچا۔ ۶۳۰ء میں یمن کے عباسی حاکم نے باشندوں کو سیاہ لباس پہننے پر مجبور کیا، جو خاص عباسی نشان تھا۔ یہ لباس اب بھی حضرت موت میں عام ہے۔ جب ترکوں نے خلافت کا منصب حاصل کر لیا اور عرب ان کے قبضے میں آیا تو حضرت موت پر بھی ان کی توجہ مبذول ہوئی۔ سلیمان پاشا نے ستر جہادول کا بیڑا تیار کیا۔ ساتھ سات ہزار تک سپاہی بھیجے

انھوں نے جنوبی ساحل کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ البتہ اندرون ملک میں ترکی اقتدار محض برائے نام رہا۔ پھر وہ خاندانوں میں جھگڑا شروع ہو گیا، جن میں سے فیصلی خاندان نے خاصا غلبہ حاصل کر لیا۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے ہندوستان میں (دولت آصفیہ کی ملازمت کر کے، بڑی دولت جمع کر لی تھی ۱۸۵۵ء میں برطانیہ نے حضرموت پر فیصلی خاندان کی حکومت تسلیم کر لی اور خارجی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ نیز اس کی حمایت و حفاظت کا اقرار کر لیا۔

برطانیہ ۱۸۳۵ء سے حضرموت کے ساتھ دلمچی پیدا ہو گئی تھی جب ایک برطانوی جہاز پالمورالسٹس نے عرب کے جنوبی ساحل کا چکر لگایا تھا۔ حضرموت کی بندرگاہ محکمہ کے متعلق کنٹان لے لکھا کہ آبادی ساڑھے چار ہزار کے قریب ہے۔ پانچ فی صد محصول لیا جاتا ہے۔ اندر سے بوسلمان باہر بھیجا جاتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے: گند، الوبان، چمڑے، اسنے کی اور قہوہ۔ باہر سے عام طور پر سوئی کپڑا، مسیحا، الہ ہے کے برتن، چاول، کھجوریں، خشک پھل، بھٹریں اور غلام آتے ہیں۔ کنٹان لکھتا ہے کہ میں نے بروہہ فروشی کی منڈی میں سات سو عربی لڑکیاں فروخت کے لیے دیکھیں..... ان کی قیمتیں سات پونڈ سے پچیس پونڈ تک تھیں، اسی جہاز پر جیمز کارڈیل سٹیڈ نام ایک انگریز سوار تھا۔ وہ مختصر سی دور ملک کے اندر چلا گیا اور وہاں سے حمیری کتبے لے کر آیا۔ یہ اپنی اہمیت کے پہلے کتبے تھے جو وہ وہاں سے لے کر آیا۔

حاضر میں مغربی دنیا کے اندر پہنچے۔

پہلا یورپی سلاحدار جس نے حضرموت کے تفصیلی حالات بیان کئے۔ ایڈوالڈ وریڈ

(i) Palmuras ii. James R. Wellsted

(iii) Adolph von Wrede

تھا جس نے مادم جج کا جیس بدل کر ۱۸۷۳ء میں علاقے کا سفر کیا۔ وہ وادی
دھان سے تربیت تک گیا۔ پھر بھید کھل گیا۔ مقامی شیخ نے اس کی تمام چیزیں چھین
لیں۔ اور اسے نکال دیا۔ راپسی میں جان بھی بہ مشکل بچے۔ ریڈ نے اپنے سفر نامے
میں دوسری باتوں کے علاوہ اونچی عمارتوں اور دولت مند شہروں کا بھی ذکر کیا
تھا۔ سمجھا گیا کہ یہ کہانیاں سنسنی پیدا کرنے کی غرض سے گھڑی گئیں۔ وہ بیچارا
مجد میں ٹیکاس (امریکہ) چلا گیا جہاں ۱۸۶۶ء میں خودکشی کر لی۔ اس کی بڑی
وجہ یہ تھی کہ حضرموت کے متعلق اس کے بیانات کو شبہ کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔
اگرچہ حضرموت عدن کے ماتحت تھا، لیکن ۱۹۱۵ء تک کسی برطانوی
افسر نے اس علاقے کا دورہ نہیں کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں
حضرموت کے دو بڑے خاندانوں کی کشمکش کو دیر کرنے کے لیے برطانیہ نے
۱۹۱۸ء میں امن و دوستی کا معاہدہ کر دیا۔ اس معاہدے کے سلسلے میں برطانوی
افسروں کو وہاں جانا پڑا۔ اس وقت احساس ہوا کہ حضرموت میں نشو و ارتقا
کے بڑے امکانات ہیں۔ چنانچہ آئندہ سال سے علاقے کی چھان بین شروع
ہو گئی اور بعد میں بہت سے انگریز افسروں نے وہاں کی مندرگاہوں کے
کے دورے کیے۔ ۱۹۲۲ء میں ڈبلیو۔ ایچ، انگریس کو مکلا میں مشین بنا کر بھیجا
گیا۔ یہ قابل ترین فوجیوں میں سے تھا جو برطانیہ نے بحر ہند کے حلقے میں بھیجے
گئے۔ اس نے عربوں میں اعتماد و احترام حاصل کر لیا اور آہستہ آہستہ افسروں
ملک میں اپنا اثر بڑھا لیا۔ ۱۹۳۷ء میں انگریس نے سلطان شحر و مکلا

کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق سلطان نے مذہبی احکام و معاملات کے سوا تمام امور میں مشیر کی رائے مان لینے کا اقرار کر لیا۔ مختلف دیہات و موضع میں جھگڑے جاری تھے، انگریزوں نے سب ختم کر دیئے۔ ایک صلح نامہ تیار ہوا جس پر چودہ سو آدمیوں کے دستخط ثبت ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں اس صلح نامہ کو مزید دس سال کے لیے توسیع دے دی گئی۔

انگریزوں نے ۱۹۳۵ء میں سکلا پہنچا تھا۔ تو سلطان کا نظام حکومت ایک وزیر، ایک خزانچی، ایک جرنیل، ایک ڈاکٹر، اور چند معلموں پر مشتمل تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ایک مجلس شوریٰ بن چکی تھی جسے کاہنہ سمجھنا چاہیے۔ اور میں محکمے منظم ہو چکے تھے ایک عمانی عرب کو سکریٹری مقرر کیا گیا، جو ٹانگانیکا کی حکومت میں نظم و نسق کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں کل مالیہ سید لاکھ تھا۔ دس سال بعد پندرہ لاکھ پہنچ چکا تھا۔ جن غلاموں کی مالک سلطنت تھی، ان سب کو آزاد کیا جا چکا تھا۔ سکلا میں ایک ہسپتال بن گیا جس پر عرب ڈاکٹر کام کر رہے تھے انگریزوں کی آمد کے وقت پوری سلطنت کے طلبہ کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ دس سال بعد یہ تعداد ایک ہزار سات سو پہنچ گئی اور سکلا میں ایک سو چالیس لڑکیاں بھی سکول جانے لگی تھیں۔ ذریعوں کے ایک گروہ نے بانگوں کو زور دیا۔ دواؤں کو کھانے کا ذمہ اٹھایا۔ یہ ساری ترقیات اس حالت میں ہوئیں کہ جو حضری جاوا اور سنگاپور میں تھے۔ ان کی طرف سے روپے کی آمد بند ہو چکی تھی سات سال سے حضرموت میں خشک سالی تھی اور ہی تھی اور ٹاکس میں تینے اوٹ موجود تھے، ان میں سے نصف کے قریب مر چکے تھے۔

انگور اس کا عقیدہ تھا کہ نو آبادیوں کے نظم و نسق کے عام طور طریقے، ان لوگوں کو خود مختاری کی تربیت دینے کے لیے موزوں نہ تھے۔ اس کے نزدیک عرب حکومتوں کے معاملات میں کم سے کم دخل دینا چاہیے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ صرف مشورہ دیتے رہنا چاہیے۔ نیز طبی اور اقتصادی امداد کا انتظام مناسب ہے۔ اس کا تجربہ یہ تھا کہ بہترین نتائج اس صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب لوگوں کو ذمہ داری دے دی جائے اور غیر ملکی مشیر عوام میں رہ کر کام کریں گے تو وہ تمام معاملات کو عوام ہی کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں گے۔

داوی میں خاصا پانی بہتا ہے جس سے کمبیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ گندم مکئی، باجرا، نیل، تنباکو، تل، کھجوریں، روئی اور ناریل خاص فضلیں ہیں۔ شہر بھی بہ کثرت پیدا ہوتا ہے۔ سالانہ پیداوار ایک لاکھ پڑوسے کم نہ ہوگی بہترین شہر داوی دھان سے آتا ہے، بھدراں اور لڑپ بھیجا جاتا ہے۔ مکلا اور شھر کے درمیان ساحلی علاقے میں نہایت عمدہ تنباکو کاشت کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ حقے میں پیا جاتا تھا، لیکن لڑچوان حضرمی امریکی سیگٹوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تنباکو کے بعض کمبیتوں کو کاریزوں کے ذریعے سے پانی دیا جاتا ہے۔ عمود لوبان بھی پیدا ہوتا ہے جو گزشتہ تین ہزار سال کی طرح اب بھی ہندوستان اور بحیرہ روم کے حلقے میں بھیجا جاتا ہے۔ حضرموت میں سوئی کپڑا بھی بنا جاتا ہے۔

لے شہر یقیناً بہت اچھا ہوتا ہے اس سے بھی بڑھ کر قابل ذکر امر ہے کہ شہر اچھی حالت میں رکھا جاتا ہے مثلاً حماموں نے مین کے گول گول ڈبے دیکھے جن میں چھتے کے گول گول ٹکڑوں کے ساتھ شہر بھر اموات اور مردہ حدودہ لڑینوش ڈالنا تھا ڈبے کو مٹی دی جا رہی ہے۔ شہر خراب نہ ہوگا۔

چوڑے بھی رنگے جاتے ہیں۔ جو تا بھی بنتا ہے۔ اور نیل بھی تیار ہوتا ہے۔ ساحل کے مختلف مقامات پر لوگ ماہی گیری کے لیے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بناتے ہیں۔ آبادی مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ جن میں غنیمتوں کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ سید: یہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی اولاد ہیں حضرت موت میں ایک بزرگ نوے صدی عیسوی کے آسن پاس بصرہ سے آئے تھے جن کا نام احمد المہاجر تھا۔ تمام سید اسی بزرگ کی اولاد ہیں جن میں سے آٹھ خاندانوں کو مستند مانا جاتا ہے۔ لوگ انھیں روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ وہ باہر نکلتے ہیں تو نہ کوئی سہتیار ساتھ لیتے ہیں، نہ محافط ان کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، لوگ ان کا انتہائی احترام کرتے ہیں اور کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ انہیں اُتار پہنچائے۔ محبطی خاندان کے حلقے میں سیدوں کا اثر قریباً ذائل ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ تعز و تعالیٰ ان کی سابقہ حیثیت حاصل قائم ہے۔

۲۔ شیخ: اگرچہ ان کا درجہ سیدوں سے کم تر ہے، لیکن یہ بھی بڑے محترم مانے جاتے ہیں اور عموماً اچھے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔

۳۔ باقی: ان کی کیفیت بنی حوی شکر کی سی ہے۔ ابتدا میں انھیں خواہ دار سپاہ کی حیثیت میں بھرتی کیا گیا تھا۔ اب یہ خاصے اقتدار کے مالک بن گئے ہیں۔ اور محبطی حلقے میں حکمرانی کی ممکنات انھیں کو حاصل ہے۔

۴۔ قبائلی: حضرات میں تین قبیلے پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک

کا مالک سردار ہے اور ہر قبیلہ مختلف خانہ دلوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہ خانہ بدوش ہیں اور ملک کے اندر تجارتی مال لانے لے جانے کا سارا کام انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہمیشہ مسلح پھرتے ہیں۔ ان میں غنی برے کے سلسلے بھی جاری ہیں۔ مگر جب کوئی اقرار و عہد کر لیں تو اس سے کبھی منحرف نہیں ہوتے۔ ۵۔ شہر سحر، وادی کے بڑے بڑے شہروں میں جو لوگ آباد ہیں، ان میں سے ان انہی خانہ دلوں کے اخلاف ہیں جو سید احمد امہاہر کے ساتھ بصرہ سے آئے تھے۔ ان میں سے بعض تاجر ہیں، بعض نے صنعت گری اختیار کر لی بعض مزدوری کرتے ہیں۔ یا گھروں میں نوکر رکھ کر لیتے ہیں۔

۶۔ غلام: حضرموت میں غلام اب بھی موجود ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر حکومت کی ملکیت ہیں اور ان کے ساتھ بڑا فائدہ بہت اچھا ہوتا ہے بعض اچھے تعلیم یافتہ ہیں اور اہم سرکاری عہدوں پر مامور ہیں۔ ۷۔ اخدادم: یہ لوگ حضرموت میں حفیر درجے کے کام کرتے ہیں۔ مثلاً بھاڑ دینا یا زراعت میں مدد دینا۔

بخورات (عمود اور بوبان) کی تجارت میں نزاع پیدا ہوا تو حضرموت کے شہروں کی چہل پہل بھی جاتی رہی۔ تدریجاً آبی وسائل میں کمی شروع ہو گئی۔ اس وجہ سے زراعت بھی گھٹ گئی۔ اچھی بندرگاہیں موجود نہ تھیں، اس لیے لوگوں میں سحر بیانی کا شوق بھی پیدا نہ ہو سکا۔ رفتہ رفتہ ان میں یہ رجحان شروع ہو گیا۔ کہ شادیاں کرتے ہی بال بچوں کو وطن میں چھوڑ کر مرد دولت کمانے کے لیے باہر نکل جاتے اور پندرہ، پندرہ، بیس بیس سال باہر گزار کر خاصی بڑی دولت جمع کر

لاتے۔ بعض لوگ مشرقی افریقہ یا صومالی لینڈ یا مصر چلے گئے اور تجارت شروع کر دی۔ بعض نے ہندوستان کا راستہ لیا۔ اور حیدر آباد پہنچ گئے جہاں نظام کی فوج میں ملازم ہو گئے، سب سے زیادہ دولت ان لوگوں نے فراہم کی جو ملا یا انڈیشیا پہنچ گئے تھے۔ وہاں انھوں نے تجارت یا کاروبار شروع کر دیا یا ہوٹل کھول لیے سنگاپور، پینانگ، ملاکا وغیرہ کے عربوں میں سے بچاؤ سے فی صد حضرمی حضرموت کے باشندے ہیں۔ سنگاپور میں بعض بازاروں کی تمام دکانیں انھیں کی ہیں۔ انگریز مس کے اندازے کے مطابق بیس فی صد سے تیس فی صد تک حضرمی مزدوریہ پیدا کرنے کی غرض سے باہر چلے جاتے ہیں۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ اگرچہ وہ لوگ بیس بیس سال سے بھی زیادہ مدت باہر گزار دیں، باہر شاہیاں بھی کر لیں اور کنبہ دار بھی بن جائیں، لیکن وہ وطن ضرور لوٹتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ دولت جمع کر لیتے ہیں، وہ حضرموت پہنچ کر مسجد بناتے ہیں۔ محل تعمیر کرتے ہیں۔ موسم گرما میں رہنے کے لیے مکان تیار کرتے ہیں اور ایسے مکان دولت سعودیہ کے شہزادوں کے مکان مستثنیٰ کرنے کے بعد کہیں نہیں ملے گے مقامی جھگڑے سے بدستور باقی رہتے ہیں۔ ایک کاروباری آدمی کا ذکر ہے کہ ملا یا بیس اس کے لاکھوں روپے جمع تھے، مگر وہ حضرموت آیا تو ہمسایوں پر اس طرح گویا شاہ حیدر آباد میں ایک فوج کا نام میسر تھا، جو میریویرمان کا بگاڑ تھا۔ یہاں وہ فرامیسی تھا جس نے سب سے پہلے یہ فوج تیار کی۔ اس میں عرب بھرتی ہوتے تھے مختلف جہازوں کے ماتحت عربوں کی تعداد معین ہوتی تھی اور جہازوں کو تعداد ہی کے مطابق ہر روپے فی کس کے حساب سے تنخواہ ملتی تھی، خاص تقریبات پر دوسری افواج کے ساتھ میسر کی فوج بھی جوس میں شامل ہوتی تھی ہزاروں عربوں کے لیے یہ روزگار کا اچھا بندوبست تھا۔

چلانے لگا گو یاو کبھی باہر گیا ہی نہ تھا۔

مملی جنگوں کے دوران میں حضرت موت پر بڑی آفتیں آئیں۔ دوسری جنگ میں فصول کو پے درپے نقصان پہنچا۔ شرق الہند سے روپے کی آمد اس لیے بند ہو گئی کہ جاپان ان علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ پھر اونٹ مرے گئے۔ اس زمانے میں برطانیہ نے بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے سے غلام مہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ مصری حکومت نے بھی مالی اور دیہتی، وہ رقم حضرت مہل ہی کو دیے دی گئی۔

اگرچہ اونٹ اور گدھے اب بھی تین ہزار سال پرانے تجارتی راستے پر حمل و نقل کا واحد ذریعہ ہیں، مگر اونٹ اب زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ موجودہ صدی کے عشرہ ثانیہ میں موٹروں کے پرزے اونٹوں پر لاکر حضرت موت پہنچنے لگے تھے اور منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد میکانگ انہیں جوڑ لیتے تھے۔ اب شہر سے قریب تک پختہ سڑک بن گئی۔ دوسری جنگ عظیم سے بیشتر فریڈا سٹارک نے بنا یا تھا۔ کہ حضرت موت میں اتنی موٹریں ہیں۔ موٹروں کے علاوہ ہوائی جہاز بھی اندرونی ملک میں آئے جانے لگے تھے۔

دوسری ترقیات کا اصل مرکز تریم ہے، جو حضرت موت کا روحانی اور ذہنی مرکز ہے۔ یہاں کے سب سے دولت مند خاندان کے افراد کا صدر مقام بھی یہی شہر ہے۔ اس خاندان کی کوششوں سے ٹیلی فون اور ریڈیو کا انتظام ہو گیا ہے۔ بجلی کی روشنی لگائی ہے۔ سینما بھی دکھایا جانے لگا ہے۔ بہت سے مکانات میں ٹکے لگ

چکے ہیں۔ دور حاضر کے یورپی انداز کی عمارتیں تفصیل سے باہر بن رہی ہیں۔ پہلے پانی نکالنے کے لیے اونٹوں، گدھوں اور عورتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اب ڈیزل یا پٹرول سے چلتے والی موٹریں یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ سب سے زیادہ دلکش مقام شام کا بلند حصار ہے۔ شبانہ کو حضروت کا نیو یارک سمجھنا چاہیے۔ یہاں چھ سو کے قریب کئی کئی منزل کے مکان ہیں۔ ان میں سے بعض آٹھ آٹھ منزل کے ہیں۔ بعض اصحاب کے نزدیک میوٹن زیادہ خوبصورت مقام ہے، اس لیے کہ وہ اس جیسے میں واقع ہے۔ جہاں کھجوروں کے کھنڈروں کا سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ اس کی آبادی پندرہ ہزار ہے۔ سلطان کا قصر عرب کی جمیل ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور یہ صفا کے قصر شاطیہ ابن سعود کے قصر ریاض سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ حضروت میں عمارتیں بہت اونچی بناتے ہیں۔ اٹھ یا اس سے بھی زیادہ منزلوں کی عمارتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انگریز مس نے بتایا کہ شہر کی تفصیل کے پاس جو مارت بنائی جائے گی، وہ کم از کم ایک سو بائیس فٹ اونچی ہونی چاہیے۔ خیال یہی ہے کہ ابتدائی حضرمی بابل سے آئے تھے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آج کل حضروت میں جو فن تعمیر رائج ہے، وہ بابل کے کھنڈروں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ حضروت میں مکانات کی پہلی منزل مال گروام کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ دوسری فلاموں اور ملازموں کے لیے۔ تیسری مہانوں کے لیے۔ اور چوتھی منزلیں سات بول یا آٹھ اہل خانہ استعمال کرتے ہیں۔ بیرونہ مکان کی سفیدی دیکھ کر

لے تیم حضروت کی شمالی سرحد پر پہاڑوں میں واقع ہے۔ اس کے مغرب میں مغربی قلعے پر شام ہے۔ تیم سے مغربی دو درجنوں میں میوٹن ہے۔ تیم و شام وادی حضروت کے کنارے واقع ہیں۔ غالباً تیم بھی حضروت ہونے کی قربانی جاتی ہے۔

ہالک کی دولت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ تر عمارتیں کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں۔ اور ان پر لکڑی کی چھت ڈال لی جاتی ہے۔ سینٹ ترمیم میں ابھی پہنچنے لگا ہے۔ شیشہ بالکل ناپید ہے۔ دروازوں کی کھیاں لکڑی کی ہوتی ہیں۔ شہروں کے بازار معمولی ہیں۔ پھیری والے زیادہ سودا بیچتے ہیں۔ وہ امیروں کے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ دکانوں پر عموماً چینی، مونٹھ، تھو، چاول، نمک، کھجور کے تیل کی چٹائیاں اور لٹکریاں ملتی ہیں۔ سکہ عام طور پر میر یا تھریسا کا راسخ ہے، جیسے ٹالہ کہتے ہیں۔ ۱۸۷۶ء کا سکہ عام طور پر اچھا سمجھا جاتا ہے، باقی گھٹیا درجے کے شمار ہوتے ہیں۔

مختلف دیلیاں راسخ ہیں۔ ان میں ایک لمبی مہری بھی ہے۔ جو جنوبی غرب کی قدیم بولی مانی جاتی ہے۔ حضرموت اور ملایا، مشرقی افریقہ کے بعض حصوں اور منہورستان سے تعلقات کی ایک شہادت یہ بھی ہے کہ تجارتی حلقوں میں ان حصوں کی زبانیں بڑے مکلف استعمال ہوتی ہیں۔ حضرموت کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے سلسلے میں ابھی بہت کام باقی ہے۔ گلیاں گندی ہیں، شہروں سے باہر نکل جاؤ تو ہر مقام۔ حدود رجہ صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا۔ پلٹیوں اور گلاسوں کہ بار بار لوہاں کی خوشبودی جاتی ہے۔ صابن کو اہل حضرموت خطرناک سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ نیز حلیہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ طبی انتظامات بہت قدیم زمانے کے ہیں۔ مرد طبیب ہوں یا عورتیں لے مار ایک سکہ تھا جو آسٹریا اور جرمنی میں راسخ تھا جسے مار پر میر یا مقربیا لکھا سٹریا کی تصویر منقش تھی۔ وہ عرب میں نادر ملے لکھ رہا۔ انگریزی میں اسے Thalers کہتے ہیں۔

وہ بیمار کے بالوں کو سونگھ کر بیماری کی تشخیص کرتے ہیں۔ زخموں کا علاج کرنا ہر تہ پہلے تھنہ نیکر لیتے ہیں اس لیے کہ حضرمول کا خیال ہے زخموں کی بدولت نقصان سامان ہے۔ پھر زخم پر پلو ہے یا ٹین یا نانہ یا سیسے کا پترا باندھ دیا جاتا ہے۔ لہذا گرم کرد کے داغ دینا ہسٹیریا اور اس قسم کی دوسری بیماریوں کا عام علاج ہے۔ اب تریم میں نئے طریق علاج پہنچ گئے ہیں۔

ایک یوں کہ نہ سال کی عمر کے بعد تعلیم نہیں دی جاتی۔ فریڈلرک نے ایک خاتون کو دیکھا تھا جو بوجہ ہو چکی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ گفتگو کے دوران میں احادیث، آیات اور شعر بھی نقل کرتی تھی۔ وہ خود شاعرہ تھی۔ اور کھیلے مقابلے میں ایک مرتبہ چائے کا سٹ انعام میں حاصل کیا تھا۔ اس کے پاس ہر روز عورتیں جمع ہوتی تھیں۔ قرآن اور بخاری مسلم یا حدیث کی ایک دو اور کتابیں سنتی تھیں۔

اوسچے طبقے کی عورتوں کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہو جاتی ہے۔ ساتھی علاقے کی عورتیں گہرائلیا سیاہ لباس پہنتی ہیں۔ شبام اور سیون ہیں آسمانی رنگ کا لباس پہنا جاتا ہے۔ تریم کی عورتوں میں بادامی یا سرخ رنگ رائج ہے۔ لباس پر چاندی کے سکے لگا لیے جاتے ہیں اور جواہرات سے بھی اسے مزین کیا جاتا ہے۔ دھن کو عموماً معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کی شادی کب ہو گی۔ جب اس کے بال دھوئے جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے چہرے پر زرد رنگ لگا دیا جاتا ہے۔ دیسح دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تیسرے روز دھن سرخ پردے کے پیچھے بیٹھی ہے جسے اس کا شوہر اٹھاتا ہے۔ شادی کے بعد پہلی صبح کہ شوہر کیسے پردس ٹال رکھ جاتا ہے۔

دوسری صبح کو بہت سے درواں، دس ٹانور، کپڑے، عطر اور لوبان رکھ دیتا ہے۔ دوسری چالیس روز تک شادی کیے جوڑے پہنے رہتی ہے۔ اور اس کی والدہ شادی کے بعد دو مہینے اس کے پاس ٹھہرتی ہے۔

حضرت کے سلسلے میں صدوجہ اہم اس زمانے کی تاریخ ہے۔ جب یہ علاقہ بنجرات، دودو لوبان، کی پیداوار کا مرکز تھا حضرت موت اور تلفار ہی کل سطح مرتفع اور پہاڑ وہ مقام تھے جنہیں بلیوس نے مراٹھا کہا اور پلینی نے مونس ایکسلس کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا اور اسے جنوبی عرب کا دودو لوبان والا ملک قرار دیا۔ مصر نے بھی دودو لوبان کے لیے ایک اہم حضرت موت بھی تھی۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار آٹھ سو سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد مین ہزار سال تک تجارت کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ پلینی اس تجارت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔

بجرات جمع کر کے اونٹوں پر لاوے اور سبوتا (شبوتہ) لئے

جاتے ہیں۔ اس شہر کا صرف ایک حصہ از کھلا رہتا ہے جس سے اونٹ داخل ہوتے ہیں مگر کوئی شخص بجور لاتا ہوا اسے سے ادھر ادھر ہو جائے تو اس کے لیے موت کی سزا مقرر ہے۔ یہاں پر دہت فول کر نہیں بلکہ پیمانے سے ناپ کر اپنے دیوتا کے لیے عشر (دسواں حصہ) لے لیتے ہیں۔ اس دیوتا کا نام سیباہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پر دہت جب تک دسواں حصہ نہ لے لیں، بجرات نیچے نہیں جا سکتے۔ اسی دسویں حصے میں

سے مصارف عامہ پورے ہوتے ہیں اس لیے کہ ہمارے دیوتانے در در دُور سے آنے والے اجنبیوں کی خاطر واری کے لیے بڑا مقررہ انتظام کر رکھا ہے۔ بخورات جیاتی تائی ہیں سے گزارے بغیر یا ہر نہیں بھیجے جاسکتے۔ اس وجہ سے بادشاہ کو بھی محصول دینا پڑتا ہے۔ ۱۰۰۰ پوری تجارت کی حیثیت ایک وسیع کارخانے کی ہے جسے بڑے اہتمام سے چلایا جاتا ہے۔ بخورات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے۔ جو بادشاہ اور پورہ تنوں کے سکریٹریوں کو دینا پڑتا ہے، ایک حصہ محافظ اور سپاہی بھی لے جاتے ہیں پھر راستے میں کہیں پانی، کہیں چارے، کہیں قیام کا خرچہ برداشت کیے بغیر چارہ نہیں اور جگہ جگہ ٹیکس بھی دینے پڑتے ہیں۔ ان مصارف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سمندر (بحیرہ روم) کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے ایک اونٹ کا خرچہ چھ سو اٹھاسی دینا رہ جاتا ہے۔

چلینی نے یہ بھی بتایا ہے کہ بخورات کو فراہمی کو ایک قسم ہی رسم سمجھ کر ادا کیا جاتا ہے۔ ان کے درختوں کے ایک تین ہزار خاندان ہیں۔ صرف بائی اور صیدی ہی دیکھ سکتے ہیں کہ بخورات کیوں کہ درختوں سے نکلے جاتے ہیں۔ سسرالون نے بخورات کی تجارت کے متعلق بائبل کا طریق میں بھی بتایا ہے۔ یسوزہ بخورات لے کر اپنے ان ہمالیوں کے حوالے کر دیتے تھے، جو مکہ کے آس پاس مقیم تھے، اسی طرح یہ سلسلہ شام و عراق تک جاری تھا۔ اور جب ان پر بخورات کی خوشبو سے متودگی طاری ہو جاتی تھی۔ کہ لوگ رال

(i) *Gebamitae* (ii) *strabo*.

لے

یا کاسنی یا ایک اور پردے کو سونگھ کر غنودگی دور کرتے تھے۔

نینوی کے پرانے مندروں کا سنگ مرمر دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ سورج دیوتا اور اس کی بیوی کی پوجا کے وقت بخورات کس کثرت سے ملگائے جاتے تھے۔ اشوری بادشاہ عکمران بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی۔ ان کی قائم کردہ یادگاروں یا عمارتوں پر جو نقش و نگار کندہ ہیں، ان میں پادشاہوں کو بخورات ملگاتے یا نخل جات پر شراب لندھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق بابل کے مندر کی بڑی قربان گاہ پر بجل کا جشن منانے کے دوران میں ایک ہزار ٹیلنٹ وزن کے بخورات ملگائے جاتے تھے۔ پریس پولس کی یادگاروں اور مسامیوں کے سکوں سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں بھی بابل اور اشوریا کی طرح بخورات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ عرب دارا کے لیے ایک ہزار ٹیلنٹ بخورات بہ طور خراج لائے تھے۔ پھر ہندوستان میں پارسیوں کے ہاں اب یہ رسم جاری ہے۔

رومیوں میں بھی بخورات کا رواج تھا۔ عموماً لوہا، بان وغیرہ بخورات میں ایک دہ چیز بھی بنتی جیسے بالچھڑکتے ہیں۔ جب خشکی کے راستے بخورات کا بھی جانا بند ہو گیا تو اس کی برآمدگان کی بندرگاہ سے جہازوں میں ہرنے لگی۔ مارکو پولو بتاتا ہے کہ شہر کی بندرگاہ میں بخورات پر مقامی حکمران اکھڑ سو فی

لے Herodotus لے ٹیلنٹ کے وزن مختلف تھے۔

عام طور پر یہ سچاڑے پونڈ کا ہوتا تھا۔ یونانی ٹیلنٹ کا وزن بیاسی پونڈ کے قریب تھا۔ بیاسی پونڈ قریباً ایک من ہوتا ہے۔ شہر حضرت کی شہر بندرگاہ ہے۔ شہر کے مشرقی جانب مغربی نالے پر واقع ہے۔

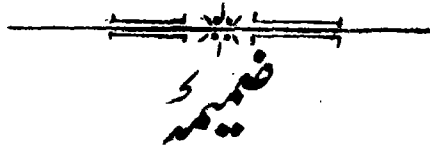
صد قلع لیتا تھا۔ قزوں متوسط میں قبیلوں کے درمیان لڑائیاں شروع ہو گئیں
 تو بخورات کے بہت سے درخت تباہ ہو گئے۔

کچھ درخت اب بھی موجود ہیں۔ اور ان سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔
 وہ ہندوستان اور بحیرہ روم بھیجا جاتا ہے، لیکن آج کل درختوں کی دیکھ
 بجال پوری طرح نہیں کی جاتی۔ بہترین بخورات طغاریں پیدا ہوتے ہیں۔ ان
 کی قیمت کا اندازہ رنگ، صفائی اور گولے کے وزن سے کیا جاتا ہے۔ اور ایک
 ٹن کی قیمت چالیس ڈالر سے تین سو بیس ڈالر تک ہوتی ہے۔

طغار اور حضرموت کے بخورات پیدا کرنے والے مقلوں کی چھان بین نہیں
 کی گئی۔ البتہ ۱۹۱۶ء میں میجر جی۔ آلتونیاں نے کچھ حصہ دیکھا تھا۔ وہ مکمل
 سے چلا تو موٹر اور اونٹ پر سوار ہو کر پہنچا، جو بہرہ کے حلقے کا نہایت اہم مقام
 ہے اور وہاں کی آبادی تین ہزار ہے۔ وہاں سے قشن گیا، جو ساحل بحر پر ایک
 خوبصورت خلیج کے کنارے واقع ہے۔ قشن کا سلطان ہی سقوطیہ کا بھی سلطان
 ہے۔ ۱۹۵۳ء میں سلطان خلیفہ احمد کی وفات ہوئی اور اس کے چچا
 بھائی نے انتظامی کاروبار سنبھال لیا۔ وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا ہے
 ننگے پاؤں چلنے میں بھی اسے عار نہیں۔ اپنی نذر و نق کو خود اٹھاتا ہے
 قشن سے آلتونیاں آگے بڑھا اور مغرب کی طرف مڑ گیا۔ پھر ہاٹوں

لے بخورات کے بڑے بڑے گولے بنا لیے جاتے ہیں۔ گولے جتنا بڑا ہو۔ اتنی ہی اسکی قیمت
 زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ بریں قیمت کے سلیس میں رنگ اور صفائی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے
 Major T. Altounyan نے قشن بہرہ کی نذر گاہ ہے۔ طغار اور حضرموت کے
 درمیان واقع ہے۔ بحیرہ روم کی سیلہ کے دانے سے قریب ساحل بحر پر ہے اور غالباً یہیں بہرہ کی مغربی سرحد

اور دواویلوں کو قطع کر تا ہوا دوسرے ساتھ میل کا فاصلہ طے کر کے تیم کے قریب جا چکا
 حضرت موت کا ماضی بڑا شاندار تھا۔ مورخوں اور ماہرین آثار قدیمہ کا فرض ہے کہ
 اس کے چہرے سے گمنامی کا پردہ اٹھائیں۔ وہاں ماہر سے روپیہ آ رہا ہے۔ یہ بھی امکان
 ہے کہ تیل یا دوسری قیمتی دھاتیں مل جائیں اور بعض آدمی دور حاضر کی طرح سے
 بھی محسوس ہوں۔ اس لیے امید ہے کہ آئندہ نسل حضرت موت کے چہرے سے قرون
 وسطی کا پردہ اٹھا دے گی۔



ضمیمہ ۲

مشرقی اور مغربی امارتوں کے مفاہق ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۵ء میں بن گئے۔ مغربی
 امارتوں کی تعداد ستارہ ہے اور مشرقی امارتوں کی تعداد غالباً آٹھ ہے۔ یعنی حضرت
 (سلطنت شجر و مگلا) تیری، جہرہ، الواحدی (مبسر علی)، الواحدی (طحات)، قشن و
 سقوطرہ، عرقا، سوراء، دونوں کی انتظامی کونسلیں بنادی گئی ہیں اور ہائی کمشنر کی
 صدارت میں یہ کونسلیں کام کرتی ہیں۔ مشرقی امارتوں کا مرکز مگلا ہے مشرقی
 امارتوں میں سے بعض میں کونسلیں بن گئی ہیں۔

مشرق و ممالک

مشرقی ممالک

انجن اقام متحدہ کے ممبر ملکوں میں سے مین سب سے کم معروف ہے۔ آپ
 راہ چلتے دس آدمیوں سے دو چھٹی کر تبت کا مرکز حکومت کیا ہے؟ تو پانچ ضرور
 قیادیں گے کہ کہاں ہے، لیکن اگر آپ یہی سوال مین کے مرکز حکومت کے بارے
 میں کریں گے تو اکثر اٹھا دیکھیں گے کہ مین کہاں ہے؟ اس بے خبری پر زیادہ
 حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ تبت تو ہندوستان کے عقب میں پہاڑوں کے
 اندر دستور ہے اور مین کی سرحد بحرہ قلزم کے جنوبی و مشرقی ساحل کے ساتھ
 ساتھ چین سو میل سے زیادہ فاصلے تک چلی گئی ہے۔ یہ اور کیا کے بالکل سامنے
 واقعہ چلو اس کا سابقہ اور حکومت منشا، ہوائی جہازیں ساحل سے من ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ملواری
 مین نچواریہ کا بگیاہ، ریکٹ ان مینس، دولت سوڈیہ کا قبیلہ لاکھ تائیس ہزار میل چلواریہ مینس
 لاکھ پلے کے برعکس پہاڑی مرکز غیر مین کا قبیلہ پچتر ہزار میل سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کی آبادی

چالیس لاکھ ہے۔

یمن کے بارے میں بے خبری کی ایک وجہ ملک کی صحرائی حیثیت بھی ہے۔ بحیرہ قلم کے ساحل کے ساتھ ساتھ باقی زیادہ گہرائیاں نہیں۔ نیز وہاں زیر آب چٹانوں کا ایک خطرناک سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ یمن کی سب سے مشہور بندرگاہ حجاز ہے، جو باب المندب سے پچھتر میل شمال میں ہے۔ جنوبی یمن میں جو اعلیٰ درجے کا قبرہ پیدا ہوتا ہے، وہ سالہا سال تک حجاز کی بندرگاہ سے بیرونی دنیا میں پہنچتا رہا۔ اس وجہ سے قہوہ کا نام ہی "مخا" مشہور ہو گیا۔ اب یہ تجارت حدیدہ اور عدن کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ مخا کے اکثر مکان گر گئے ہیں اور گودی میں مٹی بھر گئی ہے۔ یمن کی باقی دو بندرگاہیں حدیدہ اور نجیبہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ سنگریزول کا فرش بچھا ہوا ہے اور زیر آب چٹانیں ان کی حفاظت کر رہی ہیں۔

حجاز میں ساحل کے ساتھ ساتھ ریت کی ایک پٹی چلی جا رہی ہے، جو گرم بھی ہے اور اس میں موسمی بخار کے جراثیم بھی زیادہ ہیں۔ اسے تھامہ کہتے ہیں۔ یہ ساحل سے اندر کی طرف کم از کم بیس اور زیادہ سے زیادہ سوچاس میل پھیلی ہوئی ہے۔ پھر یہاں شروع ہو جاتے ہیں۔ سلسلے کے بعد سلسلہ چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بلندی دس ہزار فٹ تک پہنچ جاتی ہے اور ان سے گزرنے کا ہر درہ کم سے کم سات ہزار فٹ

لے تھامہ شیبہ زمین کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ساحلی پٹی اندرون ملک کے پہاڑوں کے مقابلے میں نشیب میں واقع ہے، اس لیے تھامہ نام پایا۔

کی بلندی پر ہے۔ ان پہاڑوں کی مشرقی جانب شمالاً جزیرہ دوم میل ایک وادی چلی گئی ہے جس کی چوڑائی اکیس دس میل ہے اور کہیں چالیس میل۔ اس کے دونوں سروں پر پہاڑوں کے بیکھرے ہیں۔ اس وادی کے مشرق میں پھر بلند پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں جن کی بلندی مشرقی جانب کم ہوتے ہوئے ریح الخالی میں کم ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ملک میں جانا سہل نہیں اور نہ بغیر مشقت اٹھائے اس کے اندر پھرا جاسکتا ہے، اس لیے کہ نہ مال ریل ہے نہ اچھی سڑکیں ہیں۔ صرف پیچ و خم کھاتے ہوئے راستوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، بہال بند و فحی جب چاہیں یہ آسانی راستہ روک سکتے ہیں۔

بے خبری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جو لوگ بڑی اور اونچی وادی میں یا دوسری چھوٹی چھوٹی وادیاں میں رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جزیرہ العرب کے حدود و جغرافیہ کو احصول پر ان کا قبضہ ہے۔ وہ بڑے مضبوط و توانا اور مستعد و حیت ہیں۔ خنجر چلانے کے ماہر، بندوق کے نشانے میں طاق میہ اور اجنبیوں کو اپنے ملک میں داخلے سے روکنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ غرض سرزمین کی دشوار گزاری اور باشندوں کی مصیبت کے باعث امام یا فرماندار ملک کی منظور کی کے بغیر سفر غیر ممکن تھا۔ اور چونکہ بین پر بار بار حملے ہوتے رہے، اس لیے فرمانرواؤں نے الگ تھلک ہی رہنا بہتر سمجھا۔

جب عرب کی تپتی ہوئی ریت سے قدامت کا پردہ اٹھا تو یہ سرزمین (عرب) مشرق و غرب کے درمیان ایک بزرخ کا کام دے رہی تھی۔ مصر، بابل اور میانمار کے مندروں اور معبدوں کو سجرات کی ضرورت تھی۔ یہ ایسی جنس تھی جس کا ایک

حصدان و بختول سے حاصل ہوتا تھا۔ جو جنوبی عرب کے پہاڑوں پر پگھلتے تھے۔ مصر کی پرانی دستاویزوں میں دو سہارا آٹھ سو سال قبل مسیح تجارت کے لئے سفروں کی کیفیت درج ہے۔ کوئی ستامق، ام میں عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساحلان پر اسرار پہاڑوں تک شاہراہ تجارت بن گئی۔ ہندوستان کے تاجروں نے بھی ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ کی طرف بڑھتے بڑھتے جنوبی عرب میں تجارت کے خطے تک کا راستہ دریافت کر لیا۔ یقین ہے کہ ابتدا میں ان حریف گروہوں کے درمیان لڑائیاں ہوئی ہوں گی۔ پھر ان پر کشمکش ہو گیا کہ ہر ایک کے پاس ایسی چیزیں موجود ہیں جنہیں دوسرے استعمال کر سکتے ہیں۔

بحیرہ لاکم کے شہروں کو تجارت کے علاوہ ہندوستان سے دارچین اور سیاہ مرچ، خلیج فارس سے موتیوں اور چین سے لیشم، لکڑیوں اور دھنیاں کی ضرورت تھی۔ نیز قدیم زمانے کے لگ بھگ کثرت گوشت کھاتے تھے اس عہد میں گوشت کو محفوظ رکھنے کے لیے ری تھن کریمز تیرید یعنی ٹھنڈا رکھنے والی مشین) تو موجود نہ تھے، لہذا انہیں جزائر شرق الهند کے سالوں کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستان اور چین کو روم سے سونا، دھات کی بنی ہوئی چیزیں اور چمڑے مطلوب تھے، اسی طرح مشرق و مغرب دونوں تیار تھے کہ افریقہ سے غلام، باغی دانت، شتر مرغ کے پرادر، نیند زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خرید لیں۔ چنانچہ ان مہنوں کی تجارت خوب فروغ پذیر ہوئی۔ بحیرہ قلم اس زمانے میں بحری قزاقوں سے ٹاپڑا تھا۔ اور یہ جنہیں پہاڑوں میں بھیج دیا جاسکتی تھیں۔ اس لیے ان دونوں ملک میں ایک تجارتی شاہراہ وجود

میں آگئی۔ یہ شاہراہ مکلا اور عدن کی بندرگاہوں سے شروع ہو کر مینی ہاٹروں کے مشرقی ڈھلوانوں کے پاس سے بخران، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہوتی ہوئی جاتی تھی۔

اس شاہراہ پر مشرقی یمن کے باشندے نہایت سرگرم اور مستعدا جوتھے۔ قیاس یہ ہے کہ ابتدا میں انہوں نے قزاقی شروع کی۔ جو قافلے ان کے پاس سے گزرتے، انہیں لوٹ لیتے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر قافلے سے گزر کر محصول وصول کریں۔ انہیں وہ اپنے قافلے تیار کر کے بھیجنے لگے اور دوسروں کے محاصل سے محفوظ رہنے کا بندوبست بھی انہوں نے کر لیا۔ اس فرض سے انہوں نے شاہراہ کی درستی کا انتظام کیا۔ اس پر جا بجا قلعے بنائے۔ قافلوں کے لیے پڑاؤ تیار کئے۔ پانی کا بندوبست کیا۔ یہاں تک کہ مسیح علیہ السلام سے نو سو سال پیشتر یمن کے باشندے بھرہ روم کی دنیا نیز افریقہ، ہندوستان اور چین کی ایک نہایت اہم شاہراہ کے اجارہ دار بن گئے۔ اسی اجارہ داری کی بدولت مشرقی یمن کی باہم لڑنے بھڑنے والی آبادیوں میں پانچ دولت مند اور طاقتور حکومتیں قائم ہو گئیں۔

ان میں سب سے پہلی سلطنت مہین کی تھی۔ جو اس نام کی سلطنت کا

لے واضح رہے کہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت مدینہ منورہ موجود ہی نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ آبادی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد قائم ہوئی۔ پھر مدینہ بہت بڑا شہر بن گیا۔ قدیم زمانے میں یہ مقام مغرب کے نام سے مشہور تھا جو وہاں کی متفرق بیٹیوں کا صدر مقام تھا۔

کا دارالحکومت تھا۔ یہ سلطنت ۹۵۰ء ق م سے ۶۵۰ء ق م تک رہی اور یہ اس جیتے میں واقع تھی، جہاں مین کے شمالی و مشرقی پہاڑیت ہوتے ہوئے ربع الخالی پہنچ کر ناپید ہو جاتے ہیں۔ اپنے دور عروج میں سلطنت میں جنوبی عرب کے بڑے حصے پر قابض تھی۔ بہت سے کنڈر اور کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ اور ان سے اب تک چھبیس حکمرانوں کے نام معلوم کئے جا چکے ہیں۔ کتبوں اور کنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مین بہت بڑا شہر تھا اور خاصاً خوشحال تھا۔ اسی زمانے کا ایک شہر تمنا تھا جو سلطنت قبائل کا دارالحکومت تھا۔ یہ سلطنت عدن کے پاس کی زیر حمایت مغربی امارتوں کے شمالی و مشرقی گوشے میں واقع تھی۔ حال ہی میں برطانیہ کے ناظم آثار قدیمہ نے وادی یہاں میں تمنا کے کنڈر دریافت کئے ہیں۔ رابرٹ فریس نے جو عدن میں امریکہ کی طرف نائب قونصل تھا، جون ۱۹۶۹ء میں یہ کنڈر دیکھے تھے۔ وہ لکھتا ہے:

صحرائی ریت آہستہ آہستہ کنڈروں پر پھلتے جا رہی ہے، لیکن وسطی حصے کے مکانات اور بڑی بڑی مارتوں کا پتہ لگالینا ہرگز مشکل نہیں۔ جگہ جگہ ہتھ سے نگوں کے ترشے ہوئے پھرتے ہیں۔ بعض خوب جلادے دی

ملہ بلاشبہ مین قصبہ کا نام تھا۔ قوم کا کوئی نام تھا یا نہیں گیا۔ ہمارے متغیبن نے قوم کو "ملاؤنا" قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ارض القرآن "جلداول" آبادی ہوتی ہیں تھی اور بعض نے اس کے دارالحکومت کا نام "قرن" بتایا ہے، جو اب بھی عدن پر ڈیکٹریت کے شمال میں اور ادب

کے جنوب اہل بہ مشرق میں موجود ہے لکھ Robert Ferris

گئی تھی۔ عرب ان تھروں کو اٹھا اٹھا کر استعمال کرنے لگے تھے مگر نیط نے انہیں روک دیا تاکہ وہاں ہم بھی کھجور کھائی کرائی جا سکے۔ شہر کے وسطی چوک میں ایک سنگی مینار کھڑا ہے۔ جس پر اوپر سے نیچے تک عیار نہیں کندہ ہیں۔ اس ریت نے اسے قریب قریب ڈھانپ لیا ہے۔ ایک مرتبہ ریت پندرہ فٹ کی گہرائی تک ہٹائی گئی تھی اور اس گہرائی میں بھی مینار کے نیچے کا حصہ نہیں ملا تھا۔ پرانے مندیر کی ایک طرف کی دیوار اور سامنے کا ڈھلوان چوڑا اب تک موجود ہے۔ ان میں بڑے بڑے ترشے ہوئے پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد حضرموت کی سلطنت نے فروغ حاصل کیا۔ اس کا دار الحکومت شیروہ تھا۔ جہاں بخورات جمع ہوتے تھے۔ اس شہر کا محل و مقام معلوم تھا۔ مگر فلہی کے سوا بہت کم فزگیوں نے یہ امان نظر سے دیکھا۔ اہل حبشہ کا دعویٰ اگر ملکہ سیا ایک حبشی شہزادی تھی + دوسرے لوگ جن میں فلہی بھی شامل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق شمالی عرب سے تھا + لیکن یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ یا تو وہ سبا کے قدیم شہر سے تھی یا شبوہ سے جو حضرموت میں واقع ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں سونے، لہیش، بخورات، مسالوں اور سبا و شبوہ کی دوسری چیزوں کی۔۔۔ سخت ضرورت تھی اور کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ملکہ نے شمال کا سفر کیا ہوتا کہ تجارت کی نئی منڈی کا معائنہ کر لے اور دنیا کے دانشمند ترین فرد (حضرت سلیمان) سے مل لے۔ مشہور ہے کہ ملکہ

کا شوہر مر چکا تھا۔ اور ادا کا برنے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر میثانہ ہوا تو وہ ماری جائے گی۔ اس لئے ملکہ نے حفرت سلیمان سے مشورہ ضروری سمجھا۔
 ۶۵۰ ق م کے آس پاس معین، تینا اور خیرہ کی عظمت مانڈ پڑ گئی اور شہر ارب نے فروغ حاصل کر لیا جو سلطنت سب کا صدر مقام تھا۔ اور تینا سے قریب آجپاس میل شمال میں بخرات کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ جو چند فرنگی مارب جا چکے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ وہاں بڑے بڑے مندروں، سرکاری عمارتوں، دیواروں اور دروازوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ مارب نے خاص شہرت بندوں کی وجہ سے حاصل کی۔ یہ بند ناکر اہل مارب نے یمن کے پہاڑوں سے آنے والا پانی روک لیا تھا۔ سب سے بڑا بند خود مارب میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک میل لمبا اور سچاس فٹ بلند تھا۔ اور سنہ ۵۱۴ ق م میں بنا تھا۔ اس کے کھنڈر اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور زمانہ قدیم کے مہندسوں کی یہ ایک نہایت مفید شہادت ہے۔

۱۷۰۰ ق م کا زمانہ یہ ہے کہ ملکہ سب کا پہلا خیرہ قوت ہو چکا تھا، اکبر و امرا نے مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے تاکہ اس کے اولاد پیدا ہو جو دولت تختہ بنے، اگر نہ ہوا تو وہ ماری جائے گی۔ ملکہ سب کے متعلق دو تحقیقاتیں ہیں۔ اول یہ کہ یہ میں سے نکلا ہے جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں۔ چونکہ اس قوم کا جدِ اعلیٰ عبد شمس بہت بڑا فاتح تھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو غلام بنایا تھا، اس لیے اس کا لقب سب کا پڑ گیا۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ سب کا لفظ بخاراتی سفر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ یہ قوم آج بھی اس لیے سب کے لقب سے مشہور ہوئی۔

شہر سبسا سلامتی م سے ۵۱۱ ق م تک عروج پر رہا۔ اس نے تجارت،
 خوشحالی اور ثقافت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا۔ پانسو سال تک یہ شہر دنیا کی بہت
 بڑی شاہراہ پر قابض رہا اور اس کے باشندے اذٹھوں کی باربرداری سے
 دولت مند بنے۔ جو شرق و غرب میں جاتے تھے۔ اس کے بعد طاقت و قوت
 کا مرکز پھر ایک مرتبہ بدل گیا اور مین کی سطح مرتفع کے شہر طغارت کا اہمیت حاصل
 ہو گئی، جو موجودہ شہر یریم کے قریب واقع تھا۔ جنوبی عرب کی یہ پانچویں سلطنت
 حمیر کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہ انتہائی
 عروج پر پہنچی ہوئی تھی، اور شمال و جنوب میں شاہراہ تجارت کے ساتھ سیکڑوں
 میل کا علاقہ اس کے زیر حکم تھا۔ ساتھ ہی مشرقی سمت میں اس کا دائرہ
 حکومت حضرموت کے ساتھ ساتھ صلیج فارس تک پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے
 میں مین قلعوں کی سرزمین کہلاتا تھا۔ ان قلعوں میں سے مشہور ترین قلعہ صنفا
 کا غمندان تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سنگ سرخ، سنگ سماق اور سنگ مرمر
 سے تعمیر ہوا تھا۔ چھت سفید شفاف پتھر کی ڈالی گئی تھی اور اس میں سے
 اڑتے ہوئے جانور بھیجائے جاسکتے تھے۔ اس کی چار بیرونی دیواروں میں سے
 ہر ایک کا رنگ مختلف تھا اور چاروں کونوں پر دھات کے چار شیر نصب
 تھے واضح ہے کہ یہ طغارت اس نام کے عمانی علاقے سے بالکل مختلف اور بہت دور واقع
 تھا۔ نیز یہ شہر کا نام تھا جو کہ نام نہ تھا۔ یہ یریم جنوبی مین میں اس راتے پر واقع ہے
 جو عمان سے منٹا جاتا ہے۔ ذار سے کسی قدر جنوب میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کارکن گنہ
 تھا۔ دوسری کا سبزا تیسری کا سفید اور چوتھی کا زرد۔ خود قصر بہشت منزل تھا۔

کر رکھے تھے۔ ہوا چلتی تروہ دھاڑنے لگتے۔ عرب مولخ الہدانی اس عمارت کے متعلق لکھتا ہے کہ بادلوں نے اس کے سر پر دستار باندھ رکھی تھی، اور اس کا کمر بند سنگ مرمر کا تھا۔

عمیری سلطنت کے متعلق جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں، انھیں سامنے رکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ جاگیر دار امرا کی حکومت تھی۔ تمام امرا قتلوں میں رہتے تھے اور دہقانوں پر حکم چلاتے تھے، لیکن موجودہ یمن کی دولت و ثروت ظفار کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لیے کہ ظفار کو مشرق و مغرب کی تجارت کے بڑے بڑے راستوں کی اجارہ داری حاصل تھی۔

جنوبی عرب کے باشندوں کو ان شاہراہوں پر جو اقتدار ایک ہزار سال تک حاصل رہا، وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور سے تھوڑی دیر پہلے کمزور پڑ گیا۔ جب پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں کے بیڑے نے بحیرہ قلزم کے چکر لگانا شروع کیے اور بحری قزاقوں کا خاتمہ کر دیا۔ ساتھی حالات منقلب ہو گئے۔ یمن کے تاجر بخدرات نیز افریقہ، ہندوستان اور مشرق بعید کی چیزوں پر جو بے اندازہ نفع کھاتے تھے، انھیں رومی برداشت کر کر سکے۔ بحیرہ قلزم کے جبرائیلی حالات سے آگاہ ہو چکنے کے بعد انھوں نے عرب میں ایک ہمہ جہت کا فیصلہ کیا تاکہ اہل یمن کے اجاڑے کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ سال ۶۲۵ء میں رومی جو نیل آئی لس گلیس کی سرحد کی میں دس ہزار نوچ مسعرے بحیرہ قلزم کو عبور کر کے فیوم کی پرانی بندرگاہ کے شمال میں اتری، اور شاہراہ تجارت پر یمن کی جانب روانہ ہوئی۔ یہ تہریت یافتہ لشکر چھ ماہ تک صحرائی اور پہاڑی

ملاتے ہیں پیش قدمی کرتے رہے۔ قبائل ان پر پھلپے مارتے رہتے۔ پانی اور خوراک کی کمی نے بھی بہت مصیبتیں پیدا کیں، پھر جو رہبر انہوں نے بطر سے ساتھ لیا تھا، اس نے فوج کو دانستہ غلط راستے پر ڈال دیا اس لیے بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ جب رسد ختم ہو گئی اور فوج کو مسلسل لڑائیوں اور بیماریوں نے اوجھڑا کر دیا۔ زہرہ مارتب کے قریب پہنچی۔ آگے جانے کا حوصلہ نہ ہوا اور گیس دل شکستہ ہو کر لٹ گیا۔ وہ نہ حمیراؤں کے دار الحکومت میں پہنچ سکا اور نہ بخورات کے خاص علاقے میں داخل ہو سکا۔ ایک ہزار چھ سو سال گزر جانے کے بعد ترکوں نے بخوری عرب میں فوجی مہمیں بھیجیں۔ مگر وہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

ہو کام رومی سپاہی پورا نہ کر سکے تھے، وہ رومی بیڑے نے پورا کر دیا۔ رومیوں کو بحر ہند کا یہ راز معلوم ہو چکا تھا۔ کہ سال کے ایک حصے میں برساتی ہوا اٹھیں مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہیں، اور دوسرے حصے میں ان کا رخ منقلب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رومی بیڑے کی کوشش سے سلسلہ تک حمیراؤں کی وہ اجارہ داری ختم ہو چکی تھی۔ جو انہیں بحیرہ روم اور بحر ہند کی تجارت میں حاصل تھی۔ گویا پرانی عربی ثقافت کی مغلط کا دور انشاء ماضی میں چکا تھا۔

بعض سرگرم مینی بادشاہوں نے پھر کوشش کی کہ دنیا کی تجارت میں اپنا

لے ۱۶۲۲ء بحیرہ روم کا دور پر بطر کہتے ہیں۔ یہ آدم کا غایت مستحکم حصار تھا، جو بحیرہ روم اور خلیج عقبہ کے درمیان ایک مادی میں واقع تھا۔ اس کے آثار بھی برآمد ہو چکے ہیں۔

مبشی میسوں نے مین پر قابض ہوتے ہی مرکز حکومت نظاما کی جگہ صنعاء میں منتقل کر لیا۔ اور وہاں ایک شاندار کینسہ تعمیر کیا۔ جس کے بیٹے دارب کے کھنڈروں سے پتھر حاصل کئے گئے تھے۔ صنعاء کے بعض مسیحی بشت پوری مسیحی دنیا میں مشہور تھے۔ مثلاً بطروٹس (۱۸۸۵ء)، عربی تاریخ نگاروں نے جنوبی عرب میں اس دور کے جس سب سے بڑے واقعے کا ذکر کیا ہے، وہ ندآرب کا انہدام ہے، جو چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پیش آیا۔ تاتلولوں کی آمد و رفت میں بہت کمی آگئی تھی۔ اس وجہ سے دولت گھٹ گئی۔ پھر اہل حبشہ کے ساتھ جنگوں کے انہماک نے ایبیری کے وسیع انتظامات کی پوری دیکھ بھال کی فرصت نہ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظام برباد ہو گیا جس پر مشرقی مین کی تہذیب کا انحصار تھا۔ سیاسی اور اقتصادی انقلابات کا بیان آسان نہ تھا۔ اس لیے عرب مورخوں نے اپنی توجہ بند کے ڈھنسنے پر مرکوز رکھی اور اسے انہوں نے ایک بہت بڑے چوہے کا فصل قرار دیا۔ سلطنتوں کے عروج و زوال کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کے سلسلے میں انسانی کوشش کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ یہ بھی ممکن

لے یہی کینسہ تھا جسے پورے عرب کا مرکز مبادت بنانے کے لیے اب رہنے کوششیں کی گئیں جب دیکھا کہ عرب جرم پاک کہ نہیں چھوڑتے تو کہ منظر پر پرمعانی کردی۔ شہر سے چھ میل پر وادی محسر میں اس کا لشکر تباہ ہو گیا۔ ذوالفاس نے میسوں پر ظلم کیا اور سزا پائی۔ آخرت کی سزا لگ رہی۔ مسیحی مکران نے عبرت حاصل کرنے کے لیے خود ذوالفاس کے ظلم و جبر کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اس کا انجام بھی وہی ہوا جو ہر جاہلیہ تھا ملے *Man Petrus* گویا یہ مسیحی بشت پسندوں کی فرقت کا تھا۔

ہے کہ تہذیب کی بنیادیں زمین کو ہونے والے چرموں جیسے جانوروں نے کھوکھلی کر دی
ہوں۔ جو عرب کے اس حصے میں پائے جاتے ہیں۔

سلسلہ کے بعد مغربی دنیا کو جنوبی عرب کی اس تہذیب کے بارے میں یاد
نہ رہا اور بے خبری ایک ہزار سال تک جاری رہی۔ سلسلہ میں کارل مین ہنر
نام ایک ڈین رہا شدہ ڈنمارک نے یورپ کو جنوبی عرب کے کتبات سے
آگاہ کیا۔ سلسلہ میں برطانیہ کا ایک بحری افسر جیمز آرویل سٹ۔ اس تاریخی
خطے میں تھوڑی دور تک گیا۔ پھر ایک فرانسیسی ٹامس آرنائڈ نے مارب کے
کھنڈروں کی منت کیے۔ سلسلہ میں ایک اور فرانسیسی جوزف ہٹیوٹ نے
جنوبی عرب کی سلطنتوں کے متعلق یورپ کے علم میں مزید اضافہ کیا۔ یہ بڑا المپیہ
مشرق تھا اور اسی کیس کے بعد پہلا یورپی تھا جس نے مارب کے شمالی
در مشرقی علاقے کو دیکھا۔ یہاں سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے والا
ایڈورڈ گلڈر نام ایک آسٹری کی کو حاصل ہے جس نے انیسویں صدی کے نوویں
عشرے میں مارب تک چار مرتبہ تحقیقی سفر کیے۔ سلسلہ میں ایک امریکی ہوائی
جہاز نے بعض امریکیوں اور مینی امیروں کے ساتھ مارب کے کھنڈروں کا
چکر لگایا۔

امریکی میں انسانی تہذیب و تاریخ کے مطالعے کے لیے امریکن فونڈیشن کے

(iii) Thomas S. Arnaud (iv) Joseph Hulevy

(iv) Edward Glaser (v) American Foundation for the
study of man.

یہ بلاخر ہندوستان کے تہذیب و تاریخ کے مطالعے کے لیے امریکی فونڈیشن کے
کچھ علم و فن کے گراں بہار ریسرچ کے کو مستحق قرار دیا گیا ہے۔ تو عربیہ و اسلامیہ پیشہ جیسے ہی جسے انہوں نے براہ راست ۱۹۶۱

ہم سے ایک ادارہ بنا ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء سے سنہ ۱۹۵۳ء تک اس ادارے کی جانب سے آثار قدیمہ کی چھان بین کے سلسلے میں دو مہینے عدن کے زیر حمایت علاقوں میں اور ایک مہم مین میں بھی گئی۔ وینڈل فیلپس ان مہموں کا رئیس تھا۔ مہموں کے ارکان بھی اپنے اپنے فنوں میں ماہر تھے۔ اور ان کے پاس سامان بھی نہایت عمدہ تھا۔ چنانچہ جنوبی و مشرقی مین کے علاوہ عدن کے زیر حمایت علاقوں کے بعض حصوں میں آثار قدیمہ کی دیکھ بھال جاری رہی۔ تقبآن کی قدیم سلطنت کے نظام آبپاری کا مفصل مطالعہ کیا گیا۔ مخربین حمید کے انبار میں پانچ مہینے کھدائی جاری رہی۔ وہاں سے دو ہزار سال پیشتر کی چیزیں نکلیں۔ تمنا کے بعض معبدوں میں کھدائی کی گئی، جو چیزیں برآمد ہوئیں، ان سے اندازہ کیا گیا کہ تمنا ۱۵۰۰ ق م کے آس پاس آخری مرتبہ تباہ ہوا۔ وہاں کے قبرستان کا ایک حصہ بھی کھودا گیا۔ اور جو کتبے برآمد ہوئے، ان کی نقلیں اور تصویریں لی گئیں۔

یہیں میں ماریب کی طرف امریکیوں کا یہ پہلا اقدام تھا۔ وہاں چند روایتوں کے ایک مندرجہ کھدائی ہوئی جو ساتویں صدی قبل مسیح کا تھا۔ علاوہ ماریب کے بند کیر کی کھدائی بھی کی گئی۔ برنج اور شفاف پتھر کی بہت سی چیزیں نکلیں اور سب کے متعلق نئے کتبات دریافت ہوئے۔ مگر حکومت یمن کی طرف مشکلات پیدا کی گئیں یہاں تک کہ کام اچانک روک دیا گیا۔ ہاں ہمہ جنوبی عرب کی سبائی تہذیب پر خاص روشنی کا انتظام ہوا، لیکن یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس حصہ عرب کی جراثیمت موت ہوئی گئی ہو چکی تھی اور یوں نے ابھی اس کی

Wendell Phillips

انہیں کوٹنے والے جانور یا ماحول اس پاس کی زمین میں ہی بنایا ہوا ہے۔ یہ اندر جانے کا بندوبست کر دیا تو اس پر حیرت نہ رہتی چاہیے۔ ہر سال یہ دیکھ بھال کر کے ہم کا ایک الم اچھوڑتا تھا۔

سطح پر مہم سہری خواشیں لگائی ہیں جب اہل میں تحقیق کے لیے دہدازے کھول دیں گے۔ اور آثار قدیمہ کی چھان بین حقیقی معنی میں شروع ہو جائے گی تو ایک ایسی تہذیب برآمد ہوگی جو اہمیت میں مقرر اور دوا بہ عراق کی تہذیب سے کم نہ تھی۔
 ۱۹۷۶ء سے پیشتر یمن میں صرف آٹھ امریکی گئے تھے۔ ان میں سے پہلا ایک مسیحی مشنری چارلس، الین کیمپ تھا، جو اپنی بیوی کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں یمن پہنچا اور مدیرہ سے روانہ ہو کر اس نے صنفا کو دیکھا۔ پھر واپس ہو کر مناخر میں مقیم ہو گیا، جہاں اس نے بطحی کی دکان کھول لی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جوش اس کے عقل و فہم پر غالب آ گیا۔ ۱۹۱۰ء میں عدن کے امریکی نوٹس چارلس کے، موزر کو حکم ملا کہ کیمپ مارا جا چکا ہے۔ یمن پہنچ کر اس واقعہ کی چھان بین کرو۔

موزر حاجیوں کے ایک چھوٹے سے جہاز میں سوار ہوا، جو مدیرہ جا رہا تھا اور مئی ۱۹۱۰ء میں مدیرہ کے ساحل پر اتر گیا۔ پھر مقامی ترکی گورنر سے گھوڑے لے کر مناخر اور صنفا کی جانب روانہ ہو گیا۔ اہم سمجھی اس زمانے میں نہ جوان تھا۔ اس نے موزر کا خیر مقدم کیا۔ چھان بین میں مردہ کی، انوثات ہوا کہ کیمپ کو ترکوں نے قید کر لیا تھا اور انہیں موت کی سزا دی۔ موزر واپسی کے لیے گھوڑے پر سوار ہوا تو گر پڑا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہیں وہ کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ گاڑی تھی۔ موزر نے خود ہی ٹوٹی ہوئی ٹی بی بائوٹی

۱۔ Charles F. Camp ۲۔ مناخر مدیرہ اور صنفا کے درمیان

پہاڑوں میں ہے۔ ۳۔ Charles K. Moser.

اور سوار ہو کر چلا، سوار سے ایک جہاز نے عدن پہنچایا۔ وہاں اس کا علاج ہوا۔
 موزر ۱۹۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

پھر آٹھ سال تک یمن اور امریکہ کے درمیان کوئی ملاقات پیدا نہ ہوا۔ پہلی
 جنگ عظیم کے بعد امام یحییٰ (الامام المتوکل علی اللہ یحییٰ بن محمد حمید الدین) نے
 پریزیڈنٹ ولسن کو لکھا کہ آپ نے دنیا میں امن قائم کیا ہے۔ یمن میں ہمارے
 حقوق نامت کا بھی احترام کیجیے، جہاں ہمارے اجداد ایک ہزار سال سے حکومت
 کرتے آئے ہیں۔ اور عربوں کو بھی آزادی دلائیے۔ اس خط پر کوئی توجہ
 نہ کی گئی۔ انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں امین ریحانی ہے۔ جو عربی
 القتل امر کی تھا، یمن کی سیاحت کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد موزر چین کی طرف تبدیل ہو گیا۔ سرکاری دوروں
 کے سلسلے میں وہ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ گیا، جو برف سے محصور تھا۔ امریکہ کا وزیر
 مختار متعینہ چین، چارلس آر کرین بھی ساتھ تھا۔ کرین جو انی کے زمانے میں
 مصر رہ چکا تھا۔ اس لیے اسے عربوں کے معاملات سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی

لے امین ریحانی نے نہ صرف یمن بلکہ یمن، حجاز، عراق، نجد، عدن وغیرہ کی سیاحت کی اور
 سفر کے متعلق تین کتابیں لکھیں۔ ایک عربی میں جو لوگ العرب کے نام سے درج ہیں
 اور دیگر عربی میں ایک کا نام

اور دوسری کا نام Arabian Peak Desert تھا۔ یہ کتابی اس سفر میں ملک عبدالعزیز
 سعود سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے حالات پر بھی ایک کتاب انگریزی میں تصنیف کی جاتی ہے جس کا نام
 Mukden Ibn Saud of Arabia

مختی - پھر صدر ولسن نے اسے ایک کمیشن کا ممبر بنا کر فلسطین بھی بھیجا تھا۔^{۱۹۲۰} رنے اس سلسلے میں سفر میں کے حالات بیان کیے۔ ساتھ ہی بتایا کہ اس کے منظر بڑے شاندار اور نایاب منظر تھے۔ اہم ہے کہ کربن کو اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ اس نے امام یحییٰ سے رابطہ ضبط پیدا کر لیا اور ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کے موسم سرما میں وہ صنعا گیا۔ اس طرح دونوں میں گہری دوستی پیدا ہو گئی۔ گفتگو کے دوران میں کربن نے امام کو بتایا کہ یمن کی ارضی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے، یہاں بہت سی قیمتی دھاتیں ملیں گی۔ امام نے کہا کہ ہم ایک امریکی انجینئر کی خدمات، مستعار لینے کے لیے تیار ہیں، کربن بڑا فراخ حوصلہ آدمی تھا۔ اور اس کے پاس روپے کی بھی کمی نہ تھی۔ اس نے امام کو اطلاع دی کہ میں اپنے خرچ پر ایک انجینئر آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں امام نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ سالی سال موسم بہار میں ایک امریکی انجینئر کارل ایس ڈیچل عدن سے گزارش و ہاں اسے معلوم ہوا کہ کربن کو یمن میں کام کرنے کے لیے ایک انجینئر کی ضرورت ہے۔ اس طرح ڈیچل عربستان کے انفق پر نمودار ہوا۔ جو آگے چل کر اس سرزمین میں نشو و ارتقا کے تمام منصوبوں کا سرچشمہ بننے والا تھا۔

۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان ڈیچل نے یمن کے چھ چکر لگائے۔ ایک

۱۹۲۷ء یہ اس کمیشن کا ذکر جو صدر امریکہ کے لیے معلومات فراہم کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ یعنی King - Crane کمیشن۔ لیکن برطانیہ اور فرانس کی غلط پالیسی نے اس کمیشن کی معلومات کے مطابق کام ہی نہ ہونے دیا اور امریکہ تمام معاملات سے دست کش ہو گیا

چکر میں کہ بی کا نواسا چارلس بریڈ لے بھی ساتھ اور ٹوچل کی بیوی بھی گھوڑے کی سوار تھیں ہمراہ سہمتی تھی۔ اہل سین ایک خاتون کو بے پردہ گھوڑے پر سوار دیکھ کر سخت حیران ہوتے تھے۔ غرض ٹوچل نے مین کے معدنی کمینٹ کی خوب بھان مین کی۔ اس نے کچھ بڑکیں تجویز بھی کیں اور یہ بھی ہیں۔ بعض مینوں کو منورنے کے فارم قائم کرنے میں مدد دی، جن میں آدمیوں یا جانوروں کے ذریعے سے چلنے والے پمپ لگائے گئے۔ کہیں کہیں ہوا کے ذریعے سے چلنے والے پمپ بھی لگے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ حدیدہ صنعا جلنے والے راستے پر ایک ندی میں کئی مہینے پانی کا اتنا جوش و خروش ہوتا تھا کہ راستہ رک جاتا ہے۔ یہاں لوہے کا ایک پل بنا دیا گیا، جو کریں نے دوستانہ تحفے کے طور پر پیش کر دیا تھا۔

کریں ۱۹۲۶ء میں صنعا سے امریکہ گیا تو اپنے ساتھ معاہدے کا ایک عربی مسودہ لے گیا، جس کی مرکزی دفعہ یہ تھی کہ امریکہ امین کو تسلیم کر لے۔ اس وقت تو رسمی تعلقات کا کوئی بندوبست نہ ہوا۔ البتہ کریں نے دوستانہ روابط برعکس کے سلسلے میں جو کچھ کیا تھا، اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ اس سلسلے میں عدنان کلام کی نائب تو فصل حیز لوڈ پارک لے بھی غیر رسمی طور پر مین گیا۔ چارلس موزر کی آمد پر پٹھان سال گزر چکے تھے، جب دوسرا امریکی مامور مین پہنچا۔ اس پوری مدت میں مین کی حالت وہی رہی جو پہلے تھی۔ صرف دو تبدیلیاں ہوئیں، اول ترک اتار ختم ہو گیا تھا، دوسرے صنعا اور حدیدہ، تغز اور مین کے درمیان

تاریقی کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔

اس اثنا میں ارضیات کے دو امر کی ماہر دں نے ساحلی میدان میں چھان بین کی تھی۔ انھیں معلوم ہوا کہ محاک کے پاس فیروزہ فرسان میں تیل کے ذخیرے ہیں۔ نیویارک کی ایک کمپنی نے مٹی کے تیل کا اجارہ لینا چاہا، لیکن معاملہ سطر نہ ہو سکا، اس لیے کہ امام سیدی بد لے میں امریکہ کی نالینڈ فوجی وردیاں مانگتا تھا اور کمپنی وردیاں دے نہ سکتی تھی۔ ترکوں نے حدیدہ کے شمال میں نمک کی ایک کان بکھودی تھی۔ ایک امریکی کمپنی نے اس نمک کا اجارہ لینا چاہا۔ مگر امام نے اس نیا پر انکار کر دیا۔ کہ ملک کے طبعی ذخیروں میں سے کوئی چیز کسی اجنبی کمپنی کو نہیں دی جا سکتی۔ ۱۹۳۲ء میں امام نے امریکہ کے ایک ماہر بشریات کو ملائیں آنے کی اجازت دے دی۔ مگر اب جانے کی اجازت نہ دی۔

یمن کی شمالی سرحد متعین نہ تھی۔ صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ بحرانی قبائل کے باؤر چرانے کی آخری جنوبی حد سے آگے یمن کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ٹیم خانہ بدوش عرب چرانگہوں کی تلاش کرتی ہوئی شمال اور جنوب میں میلوں نکل جاتی تھی۔ سیر کے متعلق بھی کچھ اور ابن سعود کے درمیان تنازعات تھے جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں نازک صورت اختیار کر لی اور آخر جنگ ہوئی۔ ابن سعود کی فوج کا ایک حصہ امیر فیصل کی سرگردگی میں تھامہ سے گزرتا ہوا حدیدہ سے آگے بڑھ کر زید پہنچ گیا۔ دوسرے حصے نے موجودہ بادشاہ دولت سعودیہ (امیر سعود) کو اس زلے میں دلی عمدتہ کی سالاری میں نجران سے پیش قدمی شروع کی۔ یمن کے شہزادہ احمد نے شکست کھائی اور

نجدی عساکر صدہ پہنچ گئے۔ ابن سعود معاملے کو انتہائی پسپا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جلد جنگ ختم ہو گئی۔ اور امام نے پالیسی میں ابن سعود سے مشورے پر آمادگی ظاہر کی۔

چارلس کورین نے ایک دلچسپ قصہ سنایا۔ دولت سعودیہ کی جو حد مقرر کی گئی تھی، امام اس سے متفق نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ابن سعود سے کہا کہ گفت و شنید کی جائے۔ ابن سعود نے یہ تجویز قبول کر لی اور امام سے کہا کہ آپ کسی ایک کو ثالث تجویز کر دیں، جس کا فیصلہ آپ کے نزدیک قطعی سمجھا جائے۔ امام نے خود ابن سعود کو ثالث مقرر کر دیا۔ ابن سعود نے تمام حالات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ صادر کر دیا کہ حد بندی غلط ہوئی ہے اور امام جو حد تجویز کرتے ہیں، اسے درست مانا جائے۔ قوموں کے درمیان غیر سنگالی کی ایسی مثال نادر ہی مل سکے گی۔

بارک کے بس جانے پر مزید سولہ سال گزر گئے اور مین وامر کیہ کے تعلقات غیر رسمی حیثیت ہی تک محدود رہے۔ مئی ۱۹۶۷ء میں امام بھیجا کا ایک کارکن سید حسین ایکسی تاہرہ کے امریکی سفارت خانے میں یہ درخواست لے کر پہنچا کہ مین اور برطانیہ کے درمیان جنوبی سرحد کے متعلق جھگڑا چلا آتا ہے اور راستہ ہائے متحدہ کی حکومت بیچ میں پرے کر اس جھگڑے کو ختم کرادے۔ فیصلہ تو بہر حال گفت و شنید ہی سے ہونا تھا، لیکن مناسب معلوم ہوا کہ امریکہ کا کوئی افسر خود موقع پر جا کر حالات کی چھان بین کر لے چنانچہ مارٹن بی کلارک اسے کو اس غرض سے منتخب کیل گیا حکومت مین کو اطلاع دی

گئی تو اس نے تجویز کا خیر مقدم کیا پچانچہ کلارک عدن سے روانہ ہوا اس کے ساتھ لیر کی بحریات کا ایک ڈاکٹر لفٹ کمانڈر ایلفرڈ بلیم پاملر اور ایک نسجوان وہ ساتھ لے گیا۔ ایک مینی رہبر ہمراہ تھا۔ ایک آدمی خود اہام نے خاص رزناقت کے لیے عدن بھیج دیا تھا۔ یہ لوگ تو فصل خانے کی جیپ میں روانہ ہوئے اور سچ سے شمال مغرب کا رخ کیا۔ نچاس ان فوج سے گزر کر پہلے ریت کے بجززار سے سابقہ پڑا جسے زرد صحرا کہنا چاہیے۔ پھر بجز ہاٹ آگئے جنہیں "سیاہ صحرا" قرار دینا مناسب ہوگا۔ رات تقریباً گزاری جو جنوبی مین کا دارالحکومت اور موجودہ فرانڈائے مین کا مرکز ہے۔ یہیں ٹھہراؤ اسحٰی سے ملاقات ہوئی۔ نعرے مغرب کا رخ کر دیا گیا۔ پہاڑوں سے گزر کر جنوبی تہامہ کا سطح گزر کر غیر زرخیز علاقہ آگیا۔ پھر زبید میں پہنچ گئے۔ جس کے تلے کی دیواریں کچھ بلند تھیں۔ یہ شہر ایک زمانے میں علوم کا مرکز تھا یہاں علماء ملاقات ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ کیلے، اگور، پینیتے، لمیو، ناریل اور انجیر کے سیراب و پراکوں باغوں میں کچھ اور وقت گزارا جائے، مگر جو کام درپیش تھا، وہ اطمینان سے بھیجے نہ دیتا تھا۔ نہ بید سے رات تک اونچی ریلی پہاڑیوں میں سے گزرا۔ مینچ میں سرسبز وادیاں ہیں اتنی رہیں جن کے اطراف میں درجہ بدرجہ کھیت خوب سیراب تھے۔ چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے یہ جماعت بیت الققیہ پہنچ گئی۔ یہ جہاں پر رونق منڈی ہے۔ یہاں ہماؤں کی قواضع تیلوڑ سے کی گئی۔ بیت الققیہ کو تیلوڑ کے سلسلے میں خاص شہرت حاصل ہے۔ یہاں لوگوں کے چہرے ایک حد تک سیاہی مائل تھے۔ یہ افریقی خون کی آمیزش کا ثبوت تھا۔ اڈوٹر

میں شہرول کی طرح بیت الفقیہ میں بھی ڈاکٹر پامر سے درخواست کی گئی کہ سرکاری
انصرول اور ان کے افراد کنبہ کا علاقہ کروں جو موسمی بنار سے متیانہ تک مختلف
بیاریوں میں مبتلا تھے۔

بیت الفقیہ کے بعد پامر کا اصل ریتلا علاقہ شروع ہو گیا۔ شام ہو چکی تو
فہرڈ کی ایک سٹیشن ریگن ریت میں ٹھہری ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ حدیہ
کا عامل پندرہ میل کا سفر کر کے میٹروائی کے لیے آگیا تھا کہ امریکی جہان کہیں
راستہ نہ بھول جائیں۔ حدیدہ میں دو راتیں گزاریں۔ پھر شمال مشرق کا رخ
کر لیا۔ ریتلے صحرا کے بعد پہاڑ آگئے۔ صنعا کے جس راستے پر کہیں نے ایک
جگہ رہے کا پل بنوایا تھا، اس میں زیادہ نا اہل گڑے کرنا پڑتا تھا۔ میٹروائیوں نے
قریب کا ایک راستہ درست کر لیا تھا۔ یہ راستہ مختلف راہیوں اور زمین پہاڑی سطحوں
میں سے گزرتا تھا۔ پہلی رات زیر سماسوئے، اجمال، ہوا خشک اور زنا پھروں سے
پاک تھی۔ دوسرے روز آٹھ ہزار فٹ بلند در سے گزرتے ہوئے سمیرا پہنچے
جہاں رات گزاری۔ سمیرا کے روز صفا میں وار د ہوئے۔

یہ جماعت ایک ہفتہ صنعا میں ٹھہری۔ امام بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ مگر
بڑی گرم جوشی سے ملا۔ گفتگو کے دوران میں اس نے پھر سوال اٹھایا کہ کیا تمہارے
متحدہ کو چاہیے کہ حکومت یمن کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرے۔ نیز ملک
کے منشوار تھا میں مدد سے، کلارک نے عدل واپس آکر یہ اطلاع تار کے ذریعے
سوشلنگٹن بھیج دی۔ اب ریاست ہائے متحدہ کے تعلقات براہ راست

جزیرۃ العرب سے پیدا ہو چکے تھے۔ چنانچہ حکومت بین کو تسلیم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ کام خط و کتابت سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ کسی شخص کو صدر امریکہ کا نمائندہ اور وزیر مختار بنا کر بھیجا جاتا۔ چنانچہ پھر ایک مشن بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ اور دولت سعودیہ میں امریکی وزیر مختار ولیم ایس ایڈریس کو اس غرض سے منتخب کیا گیا۔ کتاب کے مصنف ٹم اور ہارن کلارک کو بھی ساتھ کر دیا گیا۔ خوراک، لباس، خیموں، ریڈیو، دواؤں وغیرہ کی فراہمی میں خاصا وقت لگا اور ان معاملات کے متعلق بینوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے کہ بعض چیزیں وہاں میسر ہی نہ آ سکتی تھیں۔ فوج نے سواری کے لیے جیپیں اور سامان کے لیے ٹرک ہینا کر دیئے۔ جنگ کے بعد فورڈ نے موٹروں کا جو پہلا نمونہ تیار کیا، اس نمونے کی موٹر کربل ایڈریس کے لیے لی گئی۔ عربوں میں یہ دستور بھی ہے کہ کسی سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو تحفے پیش کرتے ہیں۔ امریکیوں نے فیصلہ کر لیا کہ ریڈیو کا ریڈیو اسٹامپ ام کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں کے واسطے ساتھ رکھ لیے گئے۔ ٹارپس اور انڈی پنڈل بھی تحائف کی غرض سے لے لیے گئے۔

امریکی بحریات کے ایک نئے تباہ کن جہاز (ڈسٹرار) میں سوار ہو کر وہ اپریل کو حیدرہ پہنچے۔ امریکی جہاز نے اکیس توپیں سلامی کے طور پر داغیں، حیدرہ کے قلعے سے جواب میں سلامی کی توپیں چلتی شروع ہوئیں۔ اس طرح بڑا وقت صرف ہوا۔ بڑی دیر کے بعد ایک کشتی آئی جس پر بمبئی پرچم لہرا رہا تھا اس پر کلارک

عزیز دوست قاضی فضل بن علی سوار تھا۔ وہ بہت بڑا زمیندار بھی تھا، عالم بھی اور سرکاری عہدیدار بھی تھا۔ اب وہ امام کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ ایک کندھے پر کڑھا ہوا سبز و پٹا ڈال رکھا تھا۔ ایک جانب سنہری چپان میں خنجر لٹک رہا تھا۔ قاضی نے امام کی طرف سے خوش آمدید کہی۔ اس کی خدمت میں اس کے کیم اور تہوہ پیش کیا گیا۔

حدیدہ ساحل سحر کی ریت اور تہامہ کی ریت کے درمیان کوئی ایک میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا نصف شمالی حصہ جدہ سے مشابہ ہے۔ اگرچہ عمارتیں اتنی بلند نہیں۔ نصف جنوبی حصے میں محض گھاس پھوس کی جھونپڑیاں ہیں جن میں جتنی رہتے ہیں۔ گودی پر پہنچے گورنر حدیدہ کے نائب نے استقبال کیا۔ عین اس وقت کھارک بھی موٹر میں مدین سے آ پہنچا تھا۔ بندرگاہ سے باہر دو سو مینی سپاہی گارڈ آف آئزر کے طور پر کھڑے تھے۔ آگے بڑھے تو بینڈ بجنے لگا۔ موسیقی نہ مشرقی تھی نہ عربی اور نہ ترکی، بلکہ تینوں کی آمیزش سے تیار ہوئی تھی۔ پھر مشن گورنر کے محل میں پہنچا۔ وہاں ایک کمرے میں سب کو بٹایا گیا، چس کی کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ سامنے قاضی مید الرحمن بن احمد السیاحی گورنر حدیدہ بیٹھا تھا۔ عمر نیا تیس سال کی ہوگئی۔ سفید لباس، سنہری میٹھی اور گندھے پر بنر دودھا ہوا اپنے طبقے کے مینی اسٹال کرتے ہیں۔ نصف گھنٹے کی بات چیت کے بعد پارٹی سرمنزل مہمان خانے میں پہنچ گئی۔ شام کی شکی میں پارٹی کے افراد نے حدیدہ کی سیر کی۔ لکڑی کے دروازوں پر اعلیٰ درجے کے نقش و نگار تھے اور عربی کی باتیں کئے تھیں۔ بازار دیکھے۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جن پر سائبان تھے۔ اکہ کا تار

دھوپ سے محفوظ رہیں۔ دکاؤں پر چاول، مکئی، باجرا فروخت ہو رہا تھا۔ تربلز، لہجو اور منبروں کی بہتات تھی۔ تازہ کپڑی ہوئی پھیلیاں اور گوشت بھی تھا، جسے کمبیلوں کے بھوم نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بعض دکاؤں پر ہندوستان کے رنگین کپڑے بھی تھے۔ حدیہ سے مقابلہ کیا تو جدیدہ میں اناج زیادہ نظر آیا۔ لیکن بازار ایسے صاف نہ تھے۔ اور زیادہ لوگ بیمار یا لڑے لنگڑے، اپاہج اور اندھے دکھائی دیتے تھے۔

گوداموں کو دیکھا تو دہال تہرہ کے انبار پڑے تھے جنہیں عورتیں بوریوں میں بھر رہی تھیں اور اس سے خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ حدیدہ کا تہرہ دینا بھر میں بہترین مانا جاتا ہے۔ عدل میں زیادہ صفیہ نعمت پاتا ہے۔ اور تہرے کی دوسری جنبوں میں لاکر اسے فروخت کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ اہل سین تہرہ زیادہ مقدار میں پیدا کرنے کے امکانات سے غارہ نہیں اٹھاتے۔

دوسرا دن ضلع حدیدہ کے سائے میں بسر ہوا جو قصبے کے شمال میں ہے۔ بانی کا ایک وسیع قطعہ زمین کے اندر آ گیا ہے۔ بیس سال پیشتر ایک یونانی کمپنی کو گودی بنانے کے لیے ایک لاکھ پونڈ کا احارہ دیا گیا تھا، مگر دس ہزار پونڈ خرچ ہونے کے بعد افسر غائب ہو گئے۔ ان کی کوشش کا صرف یہ نتیجہ باقی رہ گیا۔ کہ

ایک چھوٹا سا سنگین چبوترہ ہے۔ اور ایک رنگ خوردہ ریل کی چھوٹی ٹائن جس پر بارہ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں اور ایک اسٹین اتھرائی بری حالت میں پڑے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد پارٹی چھ حدیدہ کے دورے پر نکلی۔ معلوم ہوا تھا کہ چاندنی جو بوجہ ختم کر رہی ہے اور ملینڈ کافوں کی گرد آلود خشتی کو غسل دیکر جمیل دپڑا سرائی لہجو لوگ مکاؤں کی چھتوں پر سے اوکھڑ کیوں ہیں سے اینٹیوں کو دیکھ رہے تھے اور سایہ دانگیوں میں پہرے والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو مکاؤں کی حفاظت پر مامور تھے۔ وہ ساری ساری

ہم نے یہ ساری ساری باتیں سنیں

امٹا دھواں باب

سفر ترمش کی داستان

مُدیہ سے سڑک تھوڑی دور ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب جاتی ہے۔ اس کے دونوں طرف جھاڑیوں کے جھنڈ اور دریت کے ٹیلے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مقام پر سے وہ درختوں سے بھرا ٹوا جویرہ صاف نظر آتا ہے جہاں ۱۹۲۲ء میں شہزادہ محمد اپنے دوستوں کی جان بچاتا ہوا فرق ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ شاہی خاندان میں وہ سب سے زیادہ قابل فرو تھا۔ اور اس کی ذفات امام کے لیے بڑا سخت صدمہ تھی۔ راستے میں اندر ٹول کا قافلہ ملا۔ جن پر کچیلے، مٹی کا تیل، تانبا، بیتل کے بوٹن، نمک وغیرہ میزس لدی ہوئی تھیں۔ سیاہ بھیڑیوں کے ریڑ اور ہندوستانی وضع کے پلے ہوئے سریشی جو رہے تھے۔ ہاڑیوں پر کہیں کہیں بزرگان دین کی قبریں تھیں، جن پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ ساحل عافہ خاصا سرسبز تھا۔ اور یہاں کے باشندے خانہ بدوشی کے بجائے کھیتی باڑی پر گزارہ کرتے تھے۔ اکثر کھیتوں میں تازہ بل چلا دیا گیا تھا اور لستے میں ساجا پانی

کی نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان نالیوں کو پاٹ دینا ضروری ہے ماس لیے کہ ہر تیس چالیس گز کے بعد ایک ایسی نالی ضرور آجاتی تھی جو موڑ کے لیٹے رکاوٹ بن جاتی تھی۔ میدانِ ملاحہ مثلاً تھا جب سورج نکلا اور ہو چلنے لگی۔ تو ایک وقت میں بائیں بگولے نظر آئے جو ایک دوسرے کے پیچھے چکر کھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ بعض ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ بلند تھے۔ ہتھامہ ختم ہوتے ہی ایک دادی کے چوڑے دہانے میں داخل ہوئے جس کی سطح سنگریزوں سے لبریز تھی۔ اطراف میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ اسی طرح قصبہ بائیں پہنچ گئے جو دوجہ سے مشہور ہے، اول یہ کہ یہاں کی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں، دوم یہ کہ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کا جو پولیٹیکل مشن صنعا جا۔ باغ تھا۔ اسے یہاں تین مہینے قید رکھا گیا تھا۔ وہاں عامل کے اصرار پر توہہ پینا پڑا، پھر آگے چلے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے پارٹی ایک عکہ ٹھہری۔ جہاں کلیوں کے علاوہ تر بوز کھائے گئے تھیں بطور نکتہ ہیں۔ اس کا ذائقہ پیٹے جیسا تھا۔ کھانے کے بعد حقہ بھی پیش کیا گیا۔ مسترد نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد پارٹی ایسے مقام پر پہنچی جہاں پہلے پہل پتھر کے مکان نظر آئے۔ ٹیلوں کے اطراف میں دو دو تین تین ایکڑ کے کھیت تھے اور ان کے گرد دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ چٹوں کے پانی کو روک کر ٹیلوں کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں پہنچانے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ حدیدہ سے ایک سو اٹھارہ کلومیٹر (تقریباً پچھربیل) کا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد پارٹی ایک گاؤں کے پاس سے گزری جو اونچے ٹیلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ قنار

لہ یہ آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ تر بوز کا ذائقہ پیٹے جیسا ہوتا ہے۔ ممکن ہے امریکہ میں ہی کیفیت ہو۔ ہمارے ہاں تر بوز اور پیٹے کے ذائقے میں بیداری مشابہت بھی نہیں۔

تھساب اصل وادی میں کے دروازے پہنچ گئے جس کے زیری حکمران صحت و
حفاظت کے خیال سے اسی قسم کے مقامات کو پسند کرتے ہیں۔

زیدی شیعوں ہی کا ایک فرقہ ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں قوت و طاقت انھیں
کے ہاتھ میں ہے۔ یا بڑے بڑے زمینداروں اور تاجروں کے ہاتھ میں، البتہ ماحولی آبادی
سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اور مقتدر لوگ یا تو تجارت پیشہ ہیں یا بحریہ یا زمین
خانہ بدوش کوئی نہیں۔ اب ہر طرف پہاڑی سلسلے نظر آ رہے تھے۔ سورج مارے
پاچھ ہی بجے نظروں سے غائب ہو گیا۔ پارٹی نے خیمے لگا کر کھلے میدان میں ہونے
کا انتظام کیا، آسمان صاف ہو گیا۔ تارے نکل آئے۔ چاند نے پہاڑوں کو دھندلی
روشنی کا لباس پہنا دیا۔ دہقانوں نے جھلانے کے لیے کھڑیاں فراہم کیں
پھر دو دو فٹ پوڑی روٹیاں، بھنا ہوا دہنا اور چاول آگئے۔ ہوا کی تازگی
و خوشگوار سی بھوک چمک اٹھی تھی۔ خوب کھا کر کھل اڑھے اور سو گئے۔

پارٹی کے ساتھ گارڈ کے جو سپاہی جا رہے تھے وہ نوٹ کے اٹھے۔ تہہ تیار
ہو گیا۔ پنی گرفتار کے مشرق کی جانب روانگی عمل میں آئی۔ جا بجا درجہ بہ درجہ
کھیت تھے جن میں مرد پوستان پہنے ہوئے کام کر رہے تھے۔ ”مدینۃ النبیاء“ میں
نہوہ کے درخت پہل مرتبہ دیکھے۔ یہ درخت کوئی بارہ فٹ اونچے ہوتے ہیں اور
یکلپٹس کے سایے میں پرورش پاتے ہیں۔ آگے پہلا قابل ذکر مقام حمام علی
آیا جہاں گرم پانی کے چشمے ہیں۔ دور دور سے لوگ نہانے کے لیے یہاں آتے ہیں۔
حیثوں کے مشرقی جانب ایک پہاڑ کھڑا تھا جو سطح وادی سے پانچ ہزار فٹ
اور سطح بحر سے دس ہزار فٹ بلند ہو گا۔ یہ جیل صانع ہے۔ جو وادی میں کے

راستے کا آخری بند بچا ۱۰ سہاڑ کے ساتھ جو سڑک بنائی گئی تھی، وہ بہت ڈھلوان
 تھی۔ اور موٹریں بڑی احتیاط سے چلانی پڑتی تھیں۔ وہ گرم موباتی تھیں۔ اور بار بار
 یخیں ٹھنڈا کرنا پڑتا تھا مگر ٹیل ایڈی کی موٹر خراب ہو گئی تھی۔ عامل حدید نے ان کے
 لئے ڈنچ کا انتظام کر دیا تھا۔ لیکن جب اس اور ڈنچ بار بار پھرتی تھیں۔ پارٹی نے غصا
 راستہ پیدل طے کیا۔ چوٹی پہنچ کر سو پڑیں۔ وہاں سے کے مشرقی جانب چند فوٹ
 ڈھلوان میں پہنچے تو وادی یمن کی سطح آگئی۔ اس مقام پر وادی دس میل چوڑی
 تھی۔ زمین زیادہ تر پتھری نظر آئی۔ دس میل شمال کی جانب گئے تو متبر
 آگیا جو اعلیٰ درجے کے زرخیز اور مزیدہ ضلع کا صدر مقام ہے۔ حدید سے تار
 برقی کے ذریعے عامل مجر کو پوری اطلاعات مل چکی تھیں۔ قیام گاہ میں غرب
 ڈی ڈی ٹی پھر ٹرک دی گئی تھی۔ اس لیے فینڈ خوب آئی۔ یہاں ہمانداری
 کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ اگلے روز متبر سے روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹے سے کم مدت
 میں ان سہاڑوں سے گزرے جو وادی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔
 مزید دو گھنٹے کے سفر کے بعد جبل لقم پہنچ گئے۔ جس کی بلندی وادی سے
 دو سزارفٹ ہے۔ اس کے دامن میں یمن کا دار الحکومت صنعاء واقع ہے۔
 دار الحکومت سے تین میل جنوب میں ایک سنگین مارت ہے، جس میں مسافر
 ہاتھ منہ دھوئے اور کپڑے بدلتے ہیں۔ پھر شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں
 سرکاری ہماندار اور رسالے کا ایک حبش پٹھان موجود تھا۔ ہماندار نے امام کی طرف
 سے خوش آمدید کا پیغام پہنچایا۔ اگے راستہ ”ورکشاپ“ کے پاس سے جاتا تھا
 جہاں امام کی موٹروں کی مرمت ہوتی ہے اور فوج کے لئے بندوبست ڈھلتی
 ہے۔ صنعت نے اسے سب نفیروں (NUQUL) لکھا ہے لیکن یمن ریگانی نے جبل لقم
 بتایا ہے۔ میرے نزدیک انہما کی کا تلفظ زیادہ قابل اعتماد ہے۔

ہیں۔ اور آگے بڑھے تو صغاریں داخلے کے بڑے دروازے باب الیمین پر پہنچ گئے۔ تیسرفٹ بلند ہے۔ اس کے دونوں طرف اینٹوں کے دو برج بنے ہوئے ہیں۔ اس دروازے پر دو سو سپاہی بیڈ کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ یہاں خاتے میں پہنچے جو صغاریں عہد حاضر کے نمونے کی بہترین عمارت ہے، اگرچہ صرف دو منزلہ ہے۔

پارٹی صغاریں تین مہینے مٹھری۔ اور یہ مدت اسکا یہاں خاتے میں گزار دی۔ ہر ایک کے قیام کے لیے جدا گانہ کمرے تھے۔ کریںل ایڈری کے لیے ایک الگ نشست گاہ بھی تھی۔ جب کالفرنس میں نہیں ہوتی تھیں تو پارٹی کے افراد وہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ کھانا مٹھڑے کمرے میں کھایا جاتا تھا جو عمارت کی مغربی جانب تھا۔ بہترین اور لذیذ ترین کھانا ناشتے میں ملتا تھا۔ اس میں تھوہ سنگترے، میٹھے، سیدب، انڈے مختلف شکلوں میں پیش کیے جاتے تھے۔ ایک آدمی جو امریکہ کے مشہور مقام ڈیٹروئٹ میں اتفاقاً پہرا رہ چکا تھا اس بنا یا کرتا تھا۔

صبح کے وقت مطلع صاف ہوتا۔ سورج کے نکلنے ہی رات کی خلی کا فور ہو جاتی۔ صغاریں دوپہر کے وقت بھی گرمی نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ شہریت ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ دوپہر کے بعد سیاہ بادل جل بقم کے آس پاس جمع ہونے لگتے اور کئی گھنٹے بارش ہوتی۔ پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ سفارتی مشن کے افراد کی سیر کے لیے عربی گھوڑے مہیا کر دیے گئے تھے۔

جو چاہتا صحیح سویرے گھوڑے کی سواری کرتا۔ جیپ میں بھی سویرہ و گردش کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح معلوم ہوا کہ صنعا میں حصول میں منقسم ہے اور زمینوں حصے ایک ہی تفصیل سے محصور ہیں۔

- ۱۔ مشرقی جانب اصل عرب شہر ہے۔ گلیاں تنگ اور پڑیچ و فرش ناپختہ، زیادہ تر مکانوں کی چستیں پیچھے عام مکان میں نہیں منزل کے نصف مساحات آٹھ آٹھ منزل کے۔ طریقہ وہی کہ پہلی منزل میں گورام، دوسری میں نوکر چاکر، تیسری میں صاحب خانہ اور اہل و عیال، سب سے اوپر کی منزل پر بیٹھنے کے لیے کمرے۔ وسط شہر میں بازار مگر تنگ اور پڑیچ و فرش۔ بعض چھ فٹ سے بھی کم چوڑے۔ ان میں غلہ، سبزیوں، پھل، گوشت، کپڑے، رتے، ٹریاں وغیرہ چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ مغربی سیاحوں کے نزدیک خاص طور پر دلچسپ دکانیں سناروں کی ہیں، جو چاندی کی خوبصورت چیزیں تیار کرتے ہیں۔ دن کے وقت بازار کچا کچھ بھرے رہتے ہیں۔ اس حصے میں بعض مکانوں کی وضع قطع فنکاروں کی سی دیکھی۔ نیز اس میں ایک درجن سے زیادہ خوبصورت مسجدیں ہیں۔ بعض کے مینار بڑے بلند اور حد درجہ خوش وضع ہیں۔
- ۲۔ صنعا کا وسطی حصہ جس میں مہمان خانہ بھی واقع ہے، دراصل ترکی حصہ تھا۔ اس کے بازار اور گلیاں چوڑی رکھی گئی ہیں اور بہت سے مکانوں کے ساتھ سیراب باغ بھی ہیں۔ اسی حصے میں صنعا کی نو درمگا ہیں واقع ہیں، جن میں زیادہ تر قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے۔ بعض میں مغربیہ اور تالیخ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ڈاک خانہ بھی اسی حصے میں ہے۔

۳۔ شہر کا تیسرا حصہ مغربی سمت میں تھا، جو یہودیوں کے لیے مخصوص تھا۔ اب بہت سے یہودی نکل کر مدین کے راستے اسرائیل چلے گئے ہیں۔ بیشتر زمین میں یہودیوں کی آبادی پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ ان میں سے زیادہ تر صنعا میں رہتے تھے۔ اکثر پہلی صدی عیسوی میں فلسطین چھوڑ کر باہر نکلے تھے جب انہیں جبراً وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ کچھ لوگ شہدہ کے آس پاس آئے۔ جب یہاں کا بادشاہ یہودی تھا۔ وہ خاص محصول دے دیتے تھے جزیرہ اور فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ رات کے وقت وہ اپنے مخصوص حصہ شہر میں رہتے تھے۔ زمین خریدنے کی انہیں اجازت نہ تھی لکھوڑ یا موٹر کی سواری اور مہتیار لے کر چلنے کی بھی ممانعت تھی۔ وہ دو منزل سے اونچے مکان نہیں بنا سکتے تھے، مگر بعد میں آخری پابندی ختم ہو گئی تھی۔ وہ عام طور پر سناٹا کام کرتے تھے۔ اور انگوڑ کی شراب بھی بناتے تھے۔

ایک مرتبہ مہانوں کو امام کے گرمائی محل میں دعوت دی گئی جو صنعا سے دس میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔ یہ آٹھ منزل کی عمارت ہے جو ایک بلند چٹان پر واقع ہے۔ امام گرمی کے مہینے یہاں گزارتا ہے۔ ایک مرتبہ الروصد میں دعوت دی گئی جو صنعا کے شمال میں پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پر مسقطی انگوڑ بھی دیکھے۔ کھانے میں مرغ، پلاؤ اور سبز لیوں کے علاوہ ہر چار مہانوں کے لیے ایک ایک سالم دُبا پکوا یا گیا تھا۔ یہ دعوت امام کے شہزادوں کی طرف بھی تھی جن میں سے، سیف الاسلام شہزادہ حسین اور سیف الاسلام

شہزادہ مطہر خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ کھانے کے بعد نوات چھائی گئی۔ ایک وقت ہوتا ہے جو صرف بلند مقامات پر کہیں کہیں کاشت کیا جاتا ہے۔ جب پردان چڑھ جاتا ہے تو اس کے لٹا ہوتے توڑ کر خم آلود کپڑے میں لپیٹ لیے جاتے ہیں۔ چبانے کا طریقہ یہ ہے کہ پتے کا گولا بنا کر سنبھیں رکھ لیا جاتا ہے، پھر دوسرا پھر تیسرا یہاں تک کہ لٹے کی وجہ سے کھانے والے کا رخسار ہر نکل آتا ہے۔ پھر اسے خنوک کر چند گلاس پانی پیایا جاتا ہے۔ اس طرح کھانے والے کی آنکھوں کی پتلیاں ذرا سکڑ جاتی ہیں۔ اور اس پر سرور کی سی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دو تین گھنٹے کے سرور کے بعد رد عمل شروع ہو جاتا ہے اور جب تک مزید نوات چبانے کو مدد ملے عادی آدمی ناخوش اور مغلوب الفیظ رہتا ہے۔ امریکیوں نے بھی تجربے کے طور پر کھایا، مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ممکن ہے اس وقت ہوتا ہو جب اسے سفوف تک زیادہ مشتاد رہیں کھایا جائے۔

سفارت کے سامنے دو مقصد تھے، اول سلطنت میں کو تسلیم کر لینا، دوم دوستی اور تجارت کا معاہدہ کرنا۔ پہلا کام حدیدہ میں اکیس توپوں کی سلامی جی سے پورا ہو چکا تھا، دوسرے کے سلسلے میں پہلے امام سے رسمی ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر بڑا اہتمام کیا گیا۔ سفارتی مشن کے آدمی شاہی محل میں پہنچے تو وہاں راعیہ وزیر خارجہ موجود تھا۔ یہ شخص ۱۸۷۷ء میں مقام قسطنطنیہ پیدا ہوا۔ سفارتی خدمات کے سلسلے میں بخارست، پیٹرز برگ، وینز گراڈ، پیرس اور مراکش میں بھی رہا۔ ترکوں کے ماتحت حدیدہ اور قسز کا گورنر مقرر ہوا۔ ترک چلے گئے تو امام کے پاس رہ گیا۔ عربی اور ترکی کے علاوہ فرانسیسی بڑی بہ تکلفی سے بولتا تھا اس

کی ایک بیٹی شہزادہ احمد سے اور دوسری شہزادہ حسین سے بیاہی گئی تھی۔ وزیر اعظم سے بھی اس کا قریبی رشتہ تھا۔

دربار ہلال میں امام کی کرسی ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے رکھی تھی۔ امام برآمد ہوئے، سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر مرصع ٹوپی مٹی، جس پر سفید دستار بندھی ہوئی تھی۔ ایک طرف منہری خنجر ٹک رہا تھا، جس کی پیٹی بھی مرصع تھی۔ امام کی شخصیت ابن سعود کی شخصیت جتنی با اثر نہ تھی۔ وہ قرآن مجید کا بڑا اچھا عالم تھا۔ اور اس کے کتب خانہ نادر و کمیاب مذہبی و تاریخی مخطوطوں سے لبریز تھا۔

امام نے کرنیل ایڈری کی مزاج پر سی کے بعد پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ کرنیل نے امام کی صحت کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا کہ کسی بیرونی ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پہلے ڈاکٹر پامر کا علاج موثر ثابت ہوا تھا، جو تو فصل کلارک کے ساتھ آیا تھا۔ اب ڈاکٹر ہیڈلے کے علاج سے فائدہ ہوا ہے۔ جو سفارت کے ہمراہ آیا ہے۔

پھر کہا کہ میری رعایا کو کپڑوں کی سخت ضرورت ہے۔ بعض لوگ تو طبلات میں بھی صرف اس وجہ سے گھروں کے اندر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کے پاس پہننے کے لیے مناسب کپڑے نہیں ہوتے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں میں سے انکی کے ساتھ تعلق پیدا ہوا، لیکن اطالوی فرد میرے خلاف ہو گئے۔ مثلاً نے میرے پاس پیناٹ بھیجے۔ لیکن میں نے اس کے ساتھ معاہدہ نہ کیا۔ امریکیوں کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں کہین اور ٹرولر کا ذکر کرتے ہوئے

ان کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ کرنیل ایڈی نے معاہدے کے باب میں امریکہ کی خاموش نگاہ کی تو امام نے کہا کہ ضرور ہو جانا چاہیے۔ راغب بے وزیر خارجہ اور قاضی عبدالکدیم مظہر نائب وزیر خارجہ کو اپنی طرف سے فائدے مقرر کر دیا۔

سات روز میں بہت سے امور طے ہو گئے تو شہزادہ حسین نے گفتگو میں مداخلت کی اور بات چیت کا تختہ دین گیا۔ وزیر خارجہ اور نائب وزیر خارجہ دونوں ہٹا دیے گئے۔ شہزادے نے بات بات میں صحیح ٹکائی شریخ کی، خصوصاً اس دفعہ کہ خلاف مذہب قرار دیا کہ یمن کی رعایا کے ساتھ امریکہ میں اور امریکہ کے باشندوں کے ساتھ یمن میں موقع کی ضرورتوں اور مسلمہ بین الاقوامی معمولات کے مطابق سلوک ہوگا۔ معاملات اس حد پر پہنچ گئے کہ سفارت نے معاہدے کے بغیر واپسی کا فیصلہ کر لیا اور امام کو اس بارے میں اطلاع بھی دے دی۔ ساتھ ہی رخصتی ملاقات کے لیے درخواست پیش کر دی۔

چنانچہ ۲۳۔ اپریل کی صبح کو پھر ایک دربار خاص منعقد ہوا۔ رسمی مزاج پرکے بعد امام نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ کرنیل ایڈی نے بتایا کہ ایک مرفیہ دو روز پیشتر بھیجا گیا تھا۔ اس میں حکومت امریکہ کی پوزیشن واضح کر دی تھی۔ امام نے کہا۔ میری نظر سے تو ایسا کوئی خط نہیں گزرا۔ ساتھ ہی اپنے بیٹے شہزادہ قاسم سے کہا کہ اس کی نقل لاؤ۔ معلوم ہوتا ہے، شہزادہ حسین نے پوری حفظ و کتابت اپنے اسی قبضے میں رکھی تھی۔ اور امام تک کوئی بات نہ پہنچے دی تھی۔ جب کرنیل ایڈی کا خط سامنے آیا تو امام نے فوراً اسے دیکھا پھر کہا، اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں جو ذرا صبر و تحمل سے کام لے کر درست نہ کی جاسکے۔ ابھی ٹھہریے اور اس

مسلے پر مزید گفتگو کر لینے دیجیے۔ میری آرزو ہے کہ قاضی اور اغب بے پھرات
چیت شروع کریں۔

اس کے بعد ایک عجیب ڈرامائی واقعہ پیش آیا سداغب بے امام کے سامنے جا کھڑا
ہوا اور لرزتی ہوائی آواز میں بولا۔ میں نے تیس سال امام کی خدمت گزارا
میں صرف کئے اور سلطنت میں کے بین الاقوامی معاملات کا سفینہ شدید
مشکلات کے سمندر میں سے سلامت گزارتا رہا۔ میں اب بہت بوڑھا ہو گیا
ہوں۔ موت کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ میری آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے
یقین ہو جاتا، سلطنت میں کی خارجہ پالیسی صحیح اصول پر جاری ہے گی۔
میں امام کو کسی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ بیسویں صدی بڑی طاقتوں کے
درمیان زرم دیکار کی صدی ہے۔ اب جرمنی، جاپان اور اٹلی کی اہمیت
گھٹ چکی ہے، صرف روس، انگلستان اور امریکہ ہی دنیا کی بڑی
طاقتیں رہ گئی ہیں۔ ہر چھوٹی قوم کو زندہ رہنا ہے تو کسی ایک سے وابستگی
منور پیدا کر لینی چاہیے۔ روس لائڈز ہے اور کوئی سچا مسلمان اس
سے وابستگی پیدا نہیں کر سکتا۔ برطانیہ اور چین کے درمیان جنوبی سرحد
کے متعلق سالہا سال سے تنازع چلا آتا ہے۔ اس کا اب تک فیصلہ نہیں
ہو سکا۔ صرف ایک امریکہ ہے، جس نے اب تک کوئی سامراجی مقصد ظاہر
نہیں کیا اور امریکی شہریوں سے چین کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے ہیں۔
حکومت امریکہ اب خود دوستی کی خرابیاں ہے۔ اس مادہ دوستی کو میں اپنے دور
خدمت کا سب سے بڑا راقہ سمجھ رہا تھا اس کا مطلب یقیناً یہ ہوتا کہ

میں کو ایک اچھا اور طاقتور حلیف مل جاتا۔ جس کے ساتھ آئندہ سلسلہ معاملات جاری رہے گا۔

یہاں پہنچ کر رافیل بے مزہ بہ جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور اہم کی لیش کے قریب ہاتھ لے جا کر گر پڑا۔

یہ بین الاقوامی کارنامہ پایہ تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ کہ یہ کام مجھ سے لے لیا گیا اور مجھے محل سے بھڑک مار کر کتے کی طرح نکال دیا گیا۔ میری جگہ آپ کے فرزند حسین نے گفتہ و شنید سنبھال لی۔ حالانکہ اسے ان معاملات کا قطعاً تجربہ نہ تھا۔ میں نے جہان خانے میں جو عظیم الشان چیز تیار کی تھی، آپ کے فرزند نے وہ گرا دی اور اس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ ترقی اور پیش قدمی رک گئی۔ جب واضح ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ تو آپ مجھے بلاتے ہیں کہ جاؤ بکس کی عیشیت میں ان ٹکڑوں کو جمع کروں اور جوڑ جوڑ کر آپ کے فرزند کی پھیلائی ہوئی بربادی کی تلافی کر دوں۔ میں محل کے غلاموں کی طرح ادھر ادھر نہیں پھر سکتا۔ میں اعلیٰ حضرت کے وزیر خارجہ کے منصب سے مستعفی ہونا ہوں۔ میں اب بین میں نہیں ٹھہر سکتا۔ یہاں سے اپنے وطن ترکی جانے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ وہاں ہوں۔

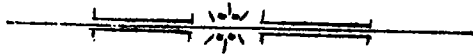
ساتھ ہی اس نے سسکیاں بھرتی شروع کیں۔ ہاتھ کا پ رہے تھے۔ امریکی سفارت کے اراکان تصویر حیرت بنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ صناعہ کی لطیف ہوا میں اس وجہ جذباتیت رافیل بے کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔

امام کی نگارہ کے سالار نے دروازے پر کھڑے ہوئے یہ خطبہ سنا تو وہ
 دلے پاؤں راضی بے کے پیچھے پہنچ گیا۔ دایاں ہاتھ خنجر کے دتے پر موکھا اور بائیں
 ہاتھ سے امام کو اشارہ کر دیا۔ امام کی طرف سے ضعیف سا اشارہ بھی ہوتا تو
 راضی بے کی زندگی ختم ہو جاتی۔
 یہ ہر حال راضی بے کی تقریر ختم ہوئی تو امام نے شفیق باپ کے انداز
 میں فرمایا:-

راضی بے! اپنا جی ہلکان نہ کرو۔ معاملات درست ہو جائیں گے۔
 آرام کرو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔
 کہ نیل ایڈی نے کہا کہ ہم تھوڑی دیر اور جہان خانے میں ٹھہریں گے۔ اگر
 آپ کو فی پنام مجھے یا میری حکومت کو بھیجنا چاہیں۔ تو میں منتظر رہوں۔
 امام نے پھر راضی بے سے کہا کہ بات چیت کرو۔ اس نے عرض کیا کہ میں
 اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکا ہوں۔ اس کے بعد امام نے قاضی مظہر کو اس کام
 کے لیے مقرر کر دیا اور کہ نیل ایڈی کے ترجمان محمد آفندی کو وہیں روک
 لیا۔ سفارت کے ارکان جہان خانے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمد آفندی
 آیا تو اس نے بتایا کہ ارکان سفارت کی روانگی کے بعد سب لوگ دوبارہ ہال میں
 جمع ہو گئے اور اس معاملے پر خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ حسین کہتا تھا کہ اگر یہ دفعہ
 قبول کر لی گئی تو عین میں اسلامی زندگی باقی نہ رہے گی۔ امام نے اس کا مشورہ
 رد کر دیا۔

محمد آفندی اور قاضی مظہر محل سے روانہ ہو کر محل پر پڑے تھے کہ راستے ہی سے

تقاضی کو واپس بلا لیا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مہمان خانہ میں آیا تو ارکان سے کہا کہ شہزادہ حسین نے جو خط لکھے ہیں، وہ واپس کر دیتے جائیں۔ اس خواہش کی تعمیل ہو چکی۔ تندرست معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ کرنیل ایڈری فور اُجیپ میں روانہ ہو گئے۔ اس لیے کہ انھیں دولت سعودیہ میں ضروری کام تھا۔ ان کے ساتھ دوسرے روز چلے گئے اور ایک لائسنس میں سوار ہو کر جزیرہ قمر آن پہنچ گئے۔ صرف دو آدمی پیچھے رہ گئے تاکہ مینیسول کو ریڈیو سہانا سکھا دیں۔ اس ریڈیو سٹ کے لیے محل کے ساتھ ایک عمارت بنانے میں جس محنت سے کام لیا گیا، اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ بسط جو لائی میں ریڈیو سٹیشن کام کرنے لگا اور بڑے لطف و اعتبار سے کہ شہزادہ حسین نے اس پر اقتناحی تقریر کی۔



انیسواں باب

صنعا میں انقلاب

سفارتی مشن کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو یمن سے سرکاری ربط و ضبط کا موقع ستمبر ۱۹۴۶ء میں پیش آیا، جب جے یو ایس چائلڈز نے امریکہ کی طرف سے دولت سعودیہ اور یمن کے وزیر مختار کی حیثیت میں کاغذات اعتماد پیش کرنے کی غرض سے صنعا گیا۔ اس موقع پر بھی مارلن کلارک اور محمد آفندی سعودیہ کے ساتھ تھے۔ امام بیار کی کے حملے سے صحت یاب ہو چکے تھے اور انھوں نے اردو ضلع کے ناستان میں ایک عظیم الشان دعوت کا انتظام کیا تھا جس میں شہزادہ احمد اور شہزادہ عبداللہ کے سوا تمام اکابر یمن شریک تھے۔ شہزادہ احمد کئی سال سے صنعا آیا ہی نہ تھا اور شہزادہ عبداللہ یمن کی طرف سے سفیر عام مقرر ہو چکا تھا اور اس وقت لندن میں تھا مثلاً شہزادہ حسین موجود تھا جس نے سفارتی مشن کی گفتگو میں رکاوٹیں پیدا کی تھیں۔ شہزادہ ہاشم

موجود تھا۔ جو بڑا سرگرم آدمی تھا اور اس زمانے میں حکومت بین کا وزیر مواصلات تھا۔ شہزادہ علی موجود تھا جو پہلے وزیر امور اقتصادیات رہ چکا تھا اسے بڑا ہی غیر ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً مزاج میں وہ بالکل بے باک تھا۔ شہزادہ حسن وزیر تعلیمات اور شہزادہ اسماعیل بھی موجود تھے۔ شہزادہ ابراہیم موجود تھا جو کچھ دیر بعد عدنان پہنچ گیا تھا۔ شہزادہ عبدالرحمن اور دوسرے بھائی بھی موجود تھے جنہیں مغربی لوگوں نے شادی دیکھا ہوگا۔

چاندلار، روانگی سے پیشتر اکثر عدنان ترکیبی رئیس وفد لبنان سے بھی ملا۔ یہ وہ اس غرض سے میں آیا تھا کہ نشو و ارتقا کے منصوبوں میں امداد دے۔ دہائی میں چاندلار نے یریم، آب اور نحر کا مشکل راستہ اختیار کیا۔ یریم سے حمیر ٹی راجھوت ظفار کے کھنڈر دیکھنے کے لیے بھی گیا۔ مئی ۱۹۶۷ء میں سیف الاسلام شہزادہ عبداللہ نے جو تاجر ہیں تھا، ریاست اتے متحدہ کے ساتھ ضرورت سے زائد پیسہ کو واپس بارے میں معاہدہ کر لینے کی خواہش ظاہر کی اور وزارت نے اسے ملائگٹن آنے کی دعوت دے دی۔ شہزادہ نے اس شرط پر دعوت قبول کر لی کہ پہلے والد سے گفتگو کر لوں۔ اس نے ہوائی جہاز میں منٹا جانے کا فیصلہ کیا۔ امام کے حکم سے پانچ ہزار مینی منٹا سے قریب زمین ہموار کرنے میں لگ گئے۔ شہزادہ امریکیوں کے ساتھ عدنان پہنچا۔ اسے دال ٹھہرا کہ پہلے امریکی خود ہوائی جہاز سے سفر منٹا پہنچے۔ تاکہ تمام انتظامات کی درستی کا جائزہ لے لیں، پھر شہزادے کو لے جائیں۔ وہ لوگ منٹا پہنچے کہ ایک خیمے میں قاضی عبداللہ العمری وزیر اعظم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ دوسرے چکر میں وہ شہزادہ عبداللہ کو لے گئے۔

راغب بے دوبارہ وزیر خارجہ مقرر ہو چکا تھا اور اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ امام کی صحت بھی ترقی کر چکی تھی۔ چند روز بیشتر وہ سفید خمر پر سواہر ہو کر اداسے نماز کے لیے جامع مسجد پہنچا تھا۔

اسی موقع پر اطالوی ڈاکٹر دام آدیزیو سے ملاقات ہوئی۔ پورے مین میں صرف تین یورپی خواتین مقیم تھیں۔ ان میں سے ایک دام آدیزیو بھی تھی۔ دام نے مصر کے ماہر آثار قدیمہ احمد نخری بے سے امریکیوں کے ملاقات کرائی۔ جو فامو کے عجائب خانہ تاریخ کا ناظم تھا۔ اور پوہس روزمین کے شمالی و مشرقی گوشے میں گزار کر آیا تھا۔ جہاں گلازر کے بعد مشائخ کوئی یورپی سیاح نہیں گیا تھا۔ نخری بے مصر کے آثار قدیمہ سے آگاہ تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے مشرقی مین کے آثار قدیمہ سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ اہم آثار بہت کم دیکھے ہیں۔ وہ مارتب کے بعض محلات اور بڑے بند کو بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ کنڈر اس وجہ سے خاص دلچسپی کا مرکز تھے کہ ان پر کئی صاف نظر آ رہے تھے اور رفتار صاؤل کی تصویریں بھی تھیں۔ یہ بھی بتایا کہ مارتب کے کنڈرول میں مصری اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ کنڈر غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔ بہترین آثار جو تھے کے علاقے میں ہیں۔ جو مارتب کے شمال میں واقع ہے جہاں معنی دور کا ایک مبداب تک سلامت موجود ہے۔ اس

۱۷ اس سے مراد جو فامین ہے جس

Audizio لے

کو محل مارتب کے شمال اور نجوان کے جنوب میں ہے، یعنی مین کا شمالی و مشرقی گوشہ۔

معبودیں جو ملیں گی جوئی میں ان میں سے بعض پچیس پچیس ٹن کی ہیں امدان پر مقامی نمونے کی بعض چیزیں کنہ ہیں۔ جوت کی بعض مماثلوں پر بند ستون لگے ہوئے ہیں۔ جن کے سولہ سولہ پہلو ہیں۔

امر کیپبل نے روانگی سے پیشتر زمین کے شمالی و مشرقی حصے پر پرداز کی اجازت لے لی تھی۔ چنانچہ انہوں نے صنعا سے پرداز کی اور وادی یمن سے باہر نکل کر ایک وادی کے ساتھ ساتھ اڑنا شروع کیا۔ یہ کشادہ ہوتے ہوتے اس زمین پر ختم ہو گئی جو ربع الخالی اور کوہستان یمن کے درمیان واقع ہے۔ یہ زمین اگرچہ خشک ہے لیکن زرخیزی کے ممکنات سے معمور ہے۔ کارل ٹرپل بھی اسی جہاز پر سوار تھا۔ اس نے آتش نشاں پہاڑوں کے متعدد دامنہ دیکھے جن کی حرارت ختم ہو چکی تھی اور اندر سے جو لاوا نکلا تھا، وہ خشک ہو کر جم گیا تھا۔ ایک بہت بڑا دامنہ نظر آیا۔ یہ آتش نشاں نہ تھا، بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ کئی شہاب ثاقب نیچے گرا ہے جس نے بہت بڑا گڑھا پیدا کر دیا ہے۔ فخری بے نے وادی مارب کے متعلق بڑی بیش قیمت معلومات بہم پہنچائیں۔ بند کا بڑا حصہ نظر نہ آتا تھا۔ یا تو وہ گر چکا ہو گا، یا ریت نے اسے ڈھانپ لیا ہو گا۔ لیکن بند کی جگہ دو ذل کنا رول پر بڑے بڑے درجہ بھاری پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ بند سے محو ڈی دور ایک قدیم شہر کے کھنڈر تھے۔ اس کے ستون سنگ خارا کے تھے۔ ایک مدور دیوار ایک صحن کو گھیرے ہوئے تھی جس کے دروازہ میں پانچ مربع ستون نصب تھے۔ مصری ماہر آثار قدیمہ نے بتایا کہ یہ ملکہ بلقیس (ملکہ سبا) کی محراب ہے۔

مارب سے جہاز شمالی جانب چلا گیا۔ اس حصے کا نقشہ کبھی تیار نہیں ہوا۔ ایک

مزدوم میدان راستے میں ملا جس میں دیہات کے علاوہ پانی کے بڑے بڑے تالاب تھے۔ ٹوچل نے بتایا کہ یہ دولت مسودہ کا شہر نجران ہے، جیسے اس نے آخری مرتبہ ۱۹۵۲ء میں دیکھا تھا ملگ ہوائی جہاز کو دیکھ کر متحیر ہوئے اور گلیوں یا چھتوں پر صبح ہو گئے۔ وہاں سے جہاز مغرب کی جانب مڑ کر حیر کی فضا میں پہنچ گیا۔ پھر جلد چلا گیا۔ اگر یمنیوں کے تعین دلا دیا جائے کہ ان کی کوئی چیز ملک سے باہر نہ جائے گی اور چھان بین شروع ہو جائے تو وہاں سے مشرق قریب کے عظیم ترین آثار برآمد ہوں گے۔ بہر حال سیف الاسلام شہزادہ عبداللہ امیکہ پہنچا۔ صدر ٹروین سے ملا عدال اس نے خواہش ظاہر کی کہ یمن کو انجمن اقوام متحدہ کا ممبر بنا لیا جائے۔ تمام

عرب حکومتوں نے اس کی زیر دست حمایت کی اور ۲۵- ستمبر ۱۹۵۶ء کو سیف الاسلام شہزادہ عبداللہ یمن کے نمائندے کی حیثیت سے انجمن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شریک ہوا۔ جس میں چھپن اقوام کے نمائندے پہلے سے شریک تھے۔ شہزادہ عبداللہ نے یوٹائی کے ایک ہوٹل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کی قیامگاہ مملایمی سفارت خانہ بن گئی۔ وہ امریکہ کے مالدار آدمیوں اور کاروباری نروں کے نمائندوں سے مل کر یمن کے لئے بندرگاہوں، سڑکوں، ہسپتالوں اور پانی ذخیرہ کرنے کے نئے بندوں کی ضرورت پر زور دیتا رہا۔ اس اثنا میں صنعا کے اندر ایک خونخوار و خونریز سازش کی پختہ پزیر ہوئی، جس کے مفصل حالات تو ابھی تک روشنی میں نہیں آئے، لیکن جو کچھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اس میں عائدانِ ذریعہ کی بغاوت کے تمام اہم پہلو آگئے ہیں۔

۱۹۵۷ء کے پہلے پانچ ماہ میں صنعا کے اندر جو واقعات پیش آئے۔ انہیں

بچنے کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے۔ کہ شہنشاہ نے یمن دو طاقتور اور با اقتدار خاندانوں کے زیر اثر چلا آتا ہے۔ ان میں سے ایک حمید الدین کا خاندان ہے، یعنی امام کا خاندان، دوسرا وزیر کا خاندان ہے۔ یہ بھی زیدی جاگیرداروں کا بڑا اہم خاندان ہے۔ اس میں سے بھی یمن میں امام بنتے رہے، اور بڑے بڑے عہدوں پر بھی اس خاندان کے افراد مامور ہوتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں اس کا رئیس دوسرا کردہ عبداللہ وزیر تھا۔ ساٹھ سال کی عمر کا سفید ریش آدمی جو اونچے عہدوں پر فائز رہا اور ۱۹۳۳ء میں یمن و دولت سعودیہ کے صلح نامے میں اس نے نہایت اہم حصہ لیا تھا۔

اگرچہ امام یحییٰ نے یمن کو ترکوں سے آزاد کر دیا تھا۔ اور ملک میں امن قائم کر دیا تھا۔ مگر اس کا نظم و حکومت ذرا سخت تھا۔ اور کچھ لوگ اس کے اور اس کے بڑے فرزندوں کے مخالفت ہو گئے تھے۔ مخالفوں کے دھمکنائے تھے۔ ایک مدین جس میں "آزادینی" جماعت متقیم تھی۔ اور کم و بیش پندرہ ہزار یمنی لوگوں کے سلسلے میں وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو وطن میں نئے زلزلے کے اوصاف و اطوار جاری کرنے کا بہت خیال تھا۔ اور یہ نظام حکومت میں آزادی و آزادی خیالی کے لیے کوشاں تھے۔ دوسرا کردہ وزیر ی خاندان کا تھا جو شادیوں کے رشتے میں امام سے منسلک تھے۔ اور اس خاندان میں بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے۔ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی چاہیے کہ یمن میں امامت کا منصب موروثی نہ تھا۔ ایک امام کا انتقال ہوتا تو دوسرے امام کا انتخاب مذہبی اکابر کی مجلس شوریٰ کے ذریعے سے ہوتا۔ اور وہی شخص منتخب کیا جاتا جو بہترین ہوتا۔ امام یحییٰ کی کوثر تھی کہ اس کا

بڑا بیجا جانشین ہے لیکن اس رائے کی مخالفت بھی موجود تھی سیف الاسلام شہزادہ احمد دوست نور سے
 میں نے جنوبی مقام تعزین تقیم تھا سال اس نے وہاں حاضر کے بعض سلسلے ایک جرمن انجینیئر کی گرانہ
 میں جاری کئے تھے جس کا نام مہین سن تھا۔ مگر ساتھ ہی لوگوں پر بھاری ٹیکس بھی لگا دیئے
 تھے۔ اسی وجہ سے یہ تحریک چل پڑی تھی۔ کہ اس کی جگہ مجلس شوریٰ کے ووٹ عبداللطیف
 کے لئے حاصل کئے جائیں۔

اس سلسلے میں امام کے فرزند سیف الاسلام شہزادہ ابراہیم کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ
 شہزادہ اصلاحات کا سرگرم حامی تھا۔ اس لیے امام کی نظروں سے گر گیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں شہزادے
 نے یارمی کا علاقہ پیش کر کے حبشہ کے دار الحکومت عدیس آبابا جانے کی اجازت لی۔ جہاں ایکٹاکٹر
 موجود تھا۔ علاقے کے بعد وہ صفا اچانے کے بجائے عدن میں مقیم ہو گیا اور آزادی جماعت کا
 رئیس بن گیا۔ اس کے نام سے کئی منشور شائع ہوئے البتہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی تیاری
 میں شہزادے کا کتنا حصہ تھا۔ ان منشوروں میں بتایا جاتا تھا۔ کہ عدن بہت پس ماندہ ملک
 ہے۔ لازم ہے کہ مطلق العنانی پر پابندیاں لگائی جائیں۔ آزادی جماعت کی طرف سے
 آئندہ امامت کا امیدوار عبداللہ زیری ہی تھا، اگرچہ وہ لوگ حکم کھلاس کا اقرار نہیں کرتے تھے۔

سیف الاسلام شہزادہ احمد کے خلاف سیف الاسلام شہزادہ حسین بھی ضعیفہ خفیہ کام کر
 رہا تھا۔ وہ بظاہر الزیری کا حامی تھا لیکن اصل میں اس کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں۔ قاضی عبداللہ
 الحری ذریعہ عظم اگرچہ امام کا پلاد دوست تھا، مگر وہ بھی شہزادہ احمد کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ امت
 اس کے ایک رشتہ دار کو مل جائے تاکہ میر منصب خود اس کے خاندان میں آجائے، غرض آزادی جماعت
 کے علاوہ سازشیوں کے یہ تین گروہ خود صنایاں موجود تھے۔ جو یہ ظاہر تھا وہ کام کر رہے تھے، مگر
 حقیقت یہ کہ وہ سب کچھ خود میٹ لینا چاہتا تھا۔

۳۸۲
 مام حالات میں وزیر کا خاندان امام بھیلی کی وفات کا انتظار کر سکتا تھا جس کی عمر مہیال
 کی چوبیس تھی پھر وہ پانچ سو روپے کے لئے کوشاں ہو سکتے تھے۔ لیکن کسی شخص نے وزیر یوں کنے منصوبے کا
 راز نام بھیلی کے پاس فاش کر دیا۔ امام نے فوراً سیف الاسلام شہزادہ احمد کو معنا بلالیا وسط فروری میں شہزادہ
 احمد کا سامان معنا پہنچنے لگا۔ تو ساری شیوں کو احساس ہوا کہ جو کچھ ضروری ہے اس کے لئے فدا عملی قدم
 اٹھانا چاہیئے، اور فروری کو قاضی عبداللہ الحمیری امام کے پاس پہنچا اور بتایا کہ ایک شاہی فارم میں جو معنا
 سے زیادہ دو نہیں پائی کا نیا تھپہ نکلا ہے۔ امام اور وزیر اعظم دونوں مسخ رنگ کی بند بیک گاڑی میں بیٹھ
 کر حوثہ دیکھنے کے لئے نکلے۔ راستہ میں ایک ترک کھڑا تھا اس میں سے چند تھائی باشندے نکلے اور تیس مہینوں میں
 لیے ہوئے نکلے اور قاضی عبداللہ وزیر کو آواز دی کہ موٹر سے باہر نکل آؤ۔ امام نے قاضی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ
 لیا اور اٹھنے نہ دیا۔ فی الغد راتش باری شروع ہو گئی۔ قاضی عبداللہ الحمیری مارا گیا لیکن عجیب بات یہ ہے
 کہ امام کے خروش تک نہ آئی اسے خیال ہوا کہ یہ لوگ قاضی عبداللہ الحمیری کو مارنا چاہتے تھے بچا بچہ زور
 سے آواز دی کہ قاضی مر چکا ہے۔ اس باتش باری بند کر دیا۔ سننے ہی مائلوں سے دوسری باتیں امام کا حجم بھی
 گولیوں سے چھلنی کر ڈالا۔

شہزادہ حسین اپنے محل میں بیٹھا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً اسلحہ خانے کی طرف دوڑا تاکہ شہزادہ
 ہر جیسے لیکن پیادوں نے اسے محل کے دروازے پر روک لیا۔ وہ سب عبداللہ وزیر کے نادار تھے جبکہ شہزادہ
 نے انھیں حکم دیا کہ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ تو پیادوں نے اسے گولی مار دی عبداللہ وزیر نے اسلحہ خانے اور شاہی حراست
 قبضہ کر لیا۔ پچاس توڑیوں نے فوراً اس کی اہمیت کا اعلان کر دیا۔ سیف الاسلام شہزادہ عظم کو سیف الاسلام
 شہزادہ احمد کا فادہ وار تھا۔ تعینات ڈال یا گیا شہزادہ ہر جیس اور ڈالوین جماعت کے دو سر امرا کان ایک ہوائی
 جہاز میں موار ہو کر معنا پہنچ گئے۔

یمن کے بعض ارادہ مندوں نے بھی نئے امام کی حمایت کا اعلان کر دیا اور بد ظاہر وزیر کے خاندان کے لیے حائل
 بہتر نظر آنے لگے۔ شہزادہ احمد نے جنگ شروع کر دی اور وہ ساحل ملاتے کے ساتھ ساتھ شمالی صوبوں کی جانب
 نکل پڑا اس لئے کہ سمجھا تھا یہ صوبہ اس کے زیادہ وفادار ہیں۔ متعدد لوگوں میں اس شکست بھی کھائی

۳۸۳
 یہ ہر حال وہ حدیدہ پہنچا۔ تو وہاں کا عامل (گورنر) اگرچہ دندیری خاندان کی سادش میں شریک اور میر پختی
 کہ اسے پکڑ کر قتل کرنے لگا۔ مگر گورنر اہل خلاف توقع شہزادہ احمد کا طرفدار بن گیا اور اسے داد دے کر شمال میں
 شہر رستم محمد پہنچا دیا۔

دہلی شہزادہ سیف الاسلام احمد نے ایک طرف اپنے حامیوں کو جمع کر لیا۔ دوسری طرف صفائی ایک
 فوری اور ناگہانی اقدام کا انتظام کر دیا۔ اس اقدام میں شہزادہ عظیم کو قید سے آزاد کر لیا گیا۔ اس نے عبداللہ
 اور زریہ کو گرفتار کر کے کسائی کو پیش کر دیا جس میں خود محمود اس پہنچا تھا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ نے پیر
 اور اس خاندان کے دوسرے گرفتار شدہ اشخاص کو جبراً بھیج دیا گیا۔ انہوں پر مقدمہ چلایا جائے مجلس شوملی
 نے سلا برے ہوئے دیکھے تو شہزادہ احمد کی امت کا اعلان کر دیا۔ مقدمہ دیر تک چلتا رہا۔ آخر عبداللہ اور زریہ
 اس کے تیس برسے حامیوں کو برزئے موت دی گئی۔ شہزادہ ابوالیم تیدی میں حرکت طلب نہ رہتے انتقال کر گیا۔
 میان کیا جاتا ہے کہ عبداللہ اور زریہ نے مندا است حاصل کر لینے کے بعد ابن سورہ روم سے نکلاست
 کی تھی کہ اس کی حکومت تسلیم کر لی جائے۔ ابن سورہ نے سختی سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی سیف الاسلام شہزادہ احمد
 کو ریاض سے پیغام بھیجا کہ اپنے والد کا تخت حاصل کرنے کے لئے جنگ جاری رکھو۔ گریاض میں بھی تباہی و بربادی
 صورت پیش آنے پر بخدا داد دے گا۔

نئے امام نے صفائی کی حکمت کو دار الحکومت بنالیا۔ حدیدہ کے عامل کو صاحب کا عہدہ دے دیا اور
 اپنے بھائی شہزادہ حسن کو وزیر اعظم بنا دیا۔ و فیلے کو چھ وزارت خارجہ کا منصب مل گیا۔ لیکن اسے شہزادہ
 عبداللہ کے لیے بگڑ خالی کرنی پڑی۔ یقیناً شہزادہ عبداللہ ہر لحاظ سے اس منصب کے لیے فزوں تریں
 آدمی تھا۔ یہی سفارت خانے و دانشگاہن: ناہرہ اور لندن میں قائم ہو چکے ہیں۔ بیرونی دنیا کے ساتھ عموماً
 جرمنی کے ساتھ خصوصاً تعلقات بڑھ رہے ہیں۔ امام پہلے بھی قریبیوں صدک پرین کے دروازے
 بند نہیں کر سکتا۔ یمن اور پارسے جزیرہ العرب میں تفرقہ کی ترقی اتنی زبردست ہیں کہ انہیں دیکھنا
 ہا سکتا۔ جزیرہ العرب، عربوں اور مغربی دنیا سب کے فرض ہے کہ متعلق تیز اتالیبے امان میں آئیں اور
 لے جئے۔ مسئلے شمال و مغرب میں اور ریت کے مین محاذ میں بہاؤں کے اندر واقع ہے۔

ضمیمہ

بین کے پہلے دارالحکومت صفا کی آبادی پچاس ہزار ہے اور یہ سوامات ہزارت کی بلندی پر واقع ہے۔ موجودہ دارالحکومت تعز کی آبادی صرف بارہ ہزار ہے اور یہ چار ہزار پچھ سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ حدیہ کی آبادی تیس ہزار ہے۔ آیت یریم الحیرہ اور قحایس سے کسی کی آبادی باہر ہزار سے زیادہ نہیں۔

اختیارات کا مالک صیغ الاسلام امام احمد بن یحییٰ ہے جو ہارامی شہر کو تخت نشین ہوا۔ آٹھ وزیروں کی ایک مجلس کے ماتحت ہیں انتظام ہے۔ شہزادہ بدذیر اعظم، وزیر خادجہ اور وزیر دفاع ہے، صیغ الاسلام شہزادہ علی وزیر تعلیمات۔ ان کے علاوہ وزیر داخلہ، وزیر مالیات وزیر معاملات اور وزیر عدل، وزیر زراعت ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں وزارت کا منصب حاصل ہے مگر کوئی حکمہ سپرد نہیں۔ یعنی وہ صرف وزیر وزارت ہیں۔ انتخابی محکمہ سے حکام مندرجہ میں آیا ہوگا ہے۔ تہہ، چوڑے اور نکالیں برآمد ہوتی ہیں اور بہت بڑا وزیر آمدنی ہیں۔ حکومت فضلوں پر مشرور وصول کرتی ہے۔ نیز سرٹائے پرنٹس اور جزیہ لیا جاتا ہے۔

تین اخبار نکلتے ہیں۔ تعلیم ابھی تک پرائمری پر جاری ہے۔ زراعت کے لیے بھی ایک سکول ہے۔ فنی تعلیم کے لیے چھ درسگاہیں قائم ہو چکی ہیں۔ دینی کالج مسجودوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ختم شد

